ہند آریائی اور اردو

سید حمید الدین قادری ہاشمی

ہند آریائی اور اردو

اس کتاب کو گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ اور بنگلور یونیورسٹی بنگلور نے ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کیا ہے۔

سید حمید الدین قادری شرفی

جملہ حقوق بہ حقِ مولف محفوظ ہیں

اشاعت	۱۹۸۶ء
کتابت	محمد تاج الدین چاپل بازار 612-2-3 حیدرآباد-۲۷
طباعت	خورشید پریس چھتہ بازار حیدرآباد (۲)
بائینڈنگ	ایس۔ بی۔ ٹریڈرس ۔ ہمت پورہ حیدرآباد (۲)
سرورق	قیصر ہمت
قیمت	چالیس روپئے
سرورق طباعت	نندنی پریس رام کوٹ حیدرآباد

ناشر

الیاس ٹریڈرس شاہ علی بنڈہ حیدرآباد آندھرا پردیش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

والد بزرگوار

حضرت سید شاہ محمد سیف الدین قادری شرفی رح

کے نام

جن کی دعائیں

میری زندگی کی ہر کامیابی کا سبب ہیں۔

ترتیب

○ ارتسام، پروفیسر مغنی تبسم صاحب، ○ مقدمہ ہاشم حسن سعید ۹

○ پیش لفظ ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی ۱۳

○ اپنی بات ۱۷

کتاب سے پہلے

مطالعہ کائنات، انسان حیات ۲۳

خیال اور حواسِ باطنی ۲۹

حصّہ (الف)

باب اوّل

اظہار کے ذرائع، لسانیات، ۳۴

لسانیات کے شعبے، زبان،

زبان کی ابتداء کے بارے میں نظریات،

زبان کا ارتقاء، زبان کے ارتقائے

اسباب، صوت، لفظ، نقطہ کی

تشکیل، زبان کے تغیرات کے اسباب،

وضع اصطلاحات، تحریر کا ارتقاء،

حروف کے آغاز کے بارے میں نظریات،

رسم خط، املا، لغت

باب دوم

زبانوں کی تقسیم، قواعدی تقسیم ۶۳

خاندانی تقسیم، زبانوں کے خاندان،

سامی خاندان السنہ، آفریقہ کا بانتو خاندان

السنہ، ہند چینی خاندان السنہ، دراوڑ خاندان

السنہ، ملایائی خاندان السنہ، منڈا خاندان السنہ،

ہند یورپی خاندان السنہ، ہند یورپی خاندان السنہ،

اور ان کی شاخیں

اطالوی کنبہ، بلقانی کنبہ، ٹیوٹونی کنبہ،

ہند ایرانی کنبہ، ہند آریائی کنبہ،

باب سوم

ہند آریائی زبانوں کی زمانی تقسیم، عہد ۸۶

قدیم، عہد وسطی، عہد جدید، ہند آریائی

زبانوں کی مکانی تقسیم، گریرسن کی تقسیم،

چٹرجی کی تقسیم۔

حصّہ (ب)

باب اوّل ۱۲۳

اردو کی ابتدا کے بارے میں نظریات،

اردو زبان کے نسلی تسلسل کا جائزہ،

باب دوّم ۱۴۹

جدید ہندآریائی زبانوں کا جائزہ،
مغربی ہندی اور اُردو، برج بھاشا
اور اُردو، بندیلی اور اُردو، قنوجی
اور اُردو، ہریانی اور اُردو، کھڑی
بولی اور اُردو، اردو اور پنجابی،

باب سوم ۱۸۲

اردو زبان کی دکن دیس میں آمد کا
تاریخی پس منظر، اُردو اور دکن دیس،
گجرات میں اردو، دکن میں اُردو
کے ارتقاء کے عوامل

باب چہارم ۱۹۷

دکنی اور دیگر زبانیں، دکنی اور پنجابی
دکنی اور ہریانی، دکنی اور شمالی،
دکنی اور گجراتی اردو، دکنی اور میواتی

باب پنجم ۲۰۸

اُردو (جدید) کا تاریخی پس منظر،

اُردو کا عہد جدید، ریختہ کیا ہے، اُردو
میں اصلاحی تحریک (مظہر تحریک) جدید
اُردو اور جدید ہندی،

باب ششم ۲۱۳

ہندوستانی (قدیم اردو) کے معمار، چند
روایتی، امیر خسرو، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز،
کبیر داس، گرو نانک

فرہنگ ۲۴۲

لسانیاتی اصطلاحات ۲۴۷

دنیا کے چند مشہور ممالک اور مروج زبانیں ۲۵۰

کتابیات ۲۵۹

جذبات خلوص، عارف مجاہد صاحب ۲۶۱

مولف کے بارے میں ۲۶۲

پروفیسر مغنی تبسم

ارتسام

میں نے جناب سید حمید الدین قادری شرفی کی تالیف ہند آریائی اور اُردو کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے عام لسانیات کی مبادیات، عالمی زبانوں کی گروہ بندی اور خاندان السنہ ہند آریائی زبانوں اور اُردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں اس علم کی مستند کتابوں سے مواد اخذ کر کے مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ اکثر جامعات میں ام۔ اے اُردو کے نصاب میں اُردو زبان کی تاریخ کے بارے میں ایک کورس شامل کیا گیا ہے۔ طلبہ کو اس نصاب کے لئے کئی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے جن میں سے بیشتر دستیاب نہیں ہوتیں۔ امتحانی اغراض کے لئے یہ کتاب عام طلبہ بالخصوص خانگی امیدواروں کے لئے مفید ہوگی۔

مولف نے یہ کتاب نہایت سلیس زبان اور دلنشین پیرائے میں تحریر کی ہے۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین کے لئے بھی یہ معلومات آفریں کتاب ایک عمدہ علمی تحفہ ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین پر میں فاضل مولف کو مبارکباد دیتا ہوں۔

تبسم

وزیٹنگ پروفیسر
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

۱۱۔ ستمبر ۱۹۸۶ء

ہاشم حسن سعید

مقدمہ

یہ بات اب پایۂ تحقیق کو پہونچ چکی ہے کہ اُردو کا مولد و منشا حضرت دہلی ہے ۔ دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں سے جنھیں گریرسن مغربی ہندی کہتا ہے اُردو زبان کا خمیر تیار ہوا ہے ۔ خاص طور پر مغربی ہندی کی "آ" والی بولیوں کھڑی اور ہریانی سے اُردو کا گہرا رشتہ ہے ۔ اور آگے چل کر برج بھاشا کے اثرات سے اس کا جدید لہجہ متعین ہوا ہے ۔ اس سلسلہ میں ہم مشرقی پنجابی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں جو کھڑی اور ہریانی کے زیر اثر مغربی پنجابی یا لہندا سے قطعی مختلف شکل اختیار کر گئی ۔ کھڑی، ہریانی اور دکنی سے مشرقی پنجابی کی مماثلت کی بناء پر پروفیسر محمود شیرانی کو یہ تسامح ہوا کہ اُردو پنجابی سے نکلی ہے ۔ ڈاکٹر زور نے بھی کم و بیش اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کی بولیوں کا نشو و نما محمل میں نہیں آیا تھا حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک یہ بولیاں ادبی روپ دھار چکی تھیں ۔ اُردو کی جنم بھومی مغربی ہندی کا وہ علاقہ ہے جنھیں ہم "شورسینی" کہتے ہیں ۔ ایک اعتبار سے ہم اُردو کو شورسینی اپ بھرنش کی جانشین زبان کہہ سکتے ہیں اسی لئے برج بھاشا کو اُردو کی ماں نہیں بہن سمجھنا چاہیئے ۔ مسلمانوں کی آمد کا زمانہ جدید ہند آریائی زبانوں کے طلوع کا زمانہ تھا ۔

اُردو کے آغاز و ارتقاء کو سمجھنے کے لئے جدید ہند آریائی زبانوں کی تشکیل اور گروہ بندی سے کما حقہٗ واقفیت ضروری ہے "انڈو ایرین اینڈ ہندی" ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی اولین لسانی تحقیق ہے جس میں انہوں نے ہندی یا ہندوستانی کے آغاز کے مسئلہ پر بڑی جامع نظریاتی بحث چھیڑی ہے لیکن بعض جگہ ان کے لسانی دلایل تاریخی حقایق کی بجائے مفروضات پر مبنی لگتے ہیں ۔

ہند آریائی اور اُردو کے موضوع پر جناب حمید الدین قادری صاحب شرقی نے پہلی بار آغاز زبان اُردو کے نظریات کا مبسوط انداز میں جائزہ لیتے ہوئے اردو اور ہند آریائی زبانوں کے رشتہ کو

بہتر طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی ضمن میں ان تازہ حقایق کو بھی پیش نظر رکھا ہے جنھیں پروفیسر سینتی کمار چیٹرجی نے نظر انداز کر دیا تھا۔ شرفی صاحب کی یہ تصنیف نہ صرف اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مختلف ماہرین لسانیات کے نظریات کی تلخیص پیش کر کے محاکمہ کیا گیا ہے بلکہ زبان کے آغاز، صوتی ارتقاء اور معنوی تبدیلیوں سے بھی بحث کی گئی ہے ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہند آریائی اور اردو کے رشتہ کو سمجھانے کی غرض سے انہوں نے پس منظر میں علم لسانیات کی مبادیات پر جو ابواب لکھے ہیں وہ خود اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علم لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بالخصوص بنتدیوں اور طلباء و طالبات کے لئے یہ کتاب "گنجینۂ حکمت" سے کم نہیں جو شخص (۲۰، ۲۵) کتابیں پڑھ کر جتنی لسانی بصیرت حاصل کر سکتا ہے میرے خیال میں شرفی صاحب کی یہ تصنیف اس سے کئی گنا زیادہ لسانی معلومات اور تحقیقی مسالہ فراہم کرتی ہے اس ایک تصنیف کا بلا استعاب مطالعہ یقیناً لسانیات کے بیسوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گا۔

لسانیات کا موضوع انتہائی خشک ہے۔ اس پر اظہار خیال کے لئے عام طور پر عالمانہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے جگہ جگہ نئی اصطلاحوں اور غیر مانوس الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے جس سے ظاہر ہے عبارت میں زبان کی لطافت اور چاشنی نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ شرفی صاحب نے اس علمی موضوع کو خالص ادبی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ علم لسانیات کے مسائل پر جدتِ بیان اور ندرتِ زبان کا یہ انوکھا کارنامہ ہے۔ اگرچہ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں عبارت آرائی سے کام لیتے ہوئے اسلوب میں رنگینی اور دلکشی ضرور پیدا کی ہے لیکن ان کا میدان لسانیات سے زیادہ تاریخ ادب و تذکرہ تھا۔ شرفی صاحب کا شگفتہ اندازِ بیان خوبصورت بندش الفاظ اور جامع و بلیغ تراکیب دراصل ان کے قدرت زبان کے غماز ہیں۔ ایک عام قاری ہی نہیں لسانیات کا طالب علم بھی اس انتہائی خشک موضوع اور اس کی زبان سے بہت جلد اکتا جاتا ہے مجھے یقین ہے کہ "ہند آریائی اور اردو" شرفی صاحب کی شگفتہ اور دلکش طرزِ نگارش کے باعث نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علمی و ادبی حلقوں میں وقیع نظر سے دیکھی جائے گی۔

شرفی صاحب کی یہ پہلی ادبی کاوش ہے وہ ایک ریسرچ اسکالر بھی ہیں اور زبان وادب کے استاد بھی۔ اسی لئے وہ محقق کے فرائض سے پوری طرح واقف ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوع سے کس حد تک انصاف کیا ہے اس کا فیصلہ تو صرف وہ ناقدین ادب ہی کر سکتے ہیں جو خود علم لسانیات پر دسترس کاملہ رکھتے ہیں اور جن کی مہر تصدیق واقعتاً مستند سمجھی جاتی ہے۔

ہاشم
۸۶/۹/۲

پرنسپل کالج آف لنگویجس حیدرآباد

ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی

پیش لفظ

اللہ رب العزت کا یہ بڑا احسان ہے کہ حیدرآباد کے باسیوں نے اُردو زبان و ادب کی مختلف انداز سے خدمات انجام دی ہیں اِن خدمات کا ایک تسلسل ہے، جو آج ایک علمی، ادبی، اور تہذیبی ورثہ کے طور پر ہمارے ساتھ ہے اور اس کا تدریجی ارتقاء برابر عمل میں آرہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد یہ خدمات ملک کے لئے ایک عظیم کارنامہ بن گئیں۔ چنانچہ علوم و معارف کی ہر شاخ سدا بہار بن گئی۔ خاص کر اُردو زبان کی تاریخ اور لسانیات پر پہلی مرتبہ اُردو میں کام کا آغاز حیدرآباد ہی سے ہوا اور فارغینِ جامعہ عثمانیہ نے اِس بارے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً ہمارے لئے لائقِ احترام ہیں۔

استاذی ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ اور استاذی پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے علم لسانیات پر گراں قدر کتابیں لکھ کر ایک مینارۂ نور کا کام انجام دیا تھا۔ اِن حضرات کی خدمات کے بعد کئی کام ملک کے دیگر فاضلین نے پیش کئے اور اس علمی کام کے تسلسل کو باقی رکھا۔

ڈاکٹر زورؔ کی کتاب "ہندوستانی لسانیات" اور پروفیسر سروری کی تصنیف "زبان اور علم زبان" لسانیات کے موضوع پر وقیع کارنامے ہیں۔ یہاں ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف ضروری ہے وہ یہ کہ متذکرہ دونوں ماہرینِ لسانیات کی خدمات دراصل عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو کے پہلے پروفیسر وحیدالدین سلیم کے دامنِ فیض کے مرہونِ منت ہیں۔ زورؔ صاحب اور سروری صاحب دونوں نے اپنے استاد وحیدالدین سلیم سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ پروفیسر سلیم کی یادگار تصنیف "افاداتِ سلیم" کا پہلا مضمون اُردو زبان کے ارتقاء پر اپنی جامعیت کے لئے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور اِس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے بنیاد کا کام انجام دے گا۔ ہرچند پروفیسر سلیم کی معرکتہ آلارا کتاب "وضع اصطلاحات" لسانیات کے موضوع سے راست علاقہ نہیں رکھتی، لیکن لسانیت ہی کے

فکری گوشے اِس سے منور ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں پروفیسر سلیم کی "توضیح اصطلاحات" لسانیات کا "عملی" کارنامہ ہے اِس میں علم لسانیات کے نظری مباحث کی بجائے الفاظ سازی کا عملی مظاہرہ ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف، مولف کی اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ، ساتھ حیدرآباد اور عثمانیہ یونیورسٹی کے علمی ماحول کا نتیجہ ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ان تینوں حضرات کے علاوہ ایک اور نام حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں میں ممتاز رہا ہے وہ ہے شمس المورخین شمس اللہ قادری کی شخصیت۔ ان کی کتاب "اردوئے قدیم" اپنے اندر ایک مورخ کی دور بینی اور واقعات سے استخراج کے سلیقہ کی عمدہ مثال ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کی وابستگی اپنی جگہ خود ایک تاریخ ہے۔ انہوں نے لسانیات اور زبان وادب کی تاریخ پہ مستقل اور مبسوط کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ تاہم مختلف کتابوں پہ ان کے لکھے ہوئے "مقدمے" ایسے دقیع اور مربوط ہیں کہ اردو زبان کی تاریخ کی تدوین میں ان کا اپنا مقام ہے۔ خاص کر ان کی مختصر مگر مفید اور جامع تصنیف "اردو زبان کے ارتقاء میں صوفیاء اکرام کی خدمات" سے ہم سب استفادہ کرتے آئے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ سے باہر نصیرالدین ہاشمی نے اپنی خاموش خدمات کی وجہ ایک مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی دو تصانیف "دکن میں اردو" اور "مدراس میں اردو" اردو ادب کی تاریخ پہ احسانات ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اُردو سے ہٹ کر دیگر شعبہ جات کے اساتذہ نے بھی گیسوئے اردو کو سنوارنے کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً پروفیسر ہارون خاں شروانی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر ولی الدین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وغیرہ نے اردو ادب کو اپنی گراں قدر تصانیف سے مالا مال کیا تھا انہوں نے لسانیات پر بھی خاص کر اردو املا اور اس کی طباعت کے مسائل پر بھی توجہ دی تھی۔ مثلاً پروفیسر شروانی جو ہمارے عہد کے ایک اہم مورخ ہیں اُردو کی طباعت کے مسائل پر کام کرتے رہے اس طرح پروفیسر جعفر حسن جن کا تعلق علم سماجیات کے شعبہ سے تھا، اردو کے صوتیاتی املا پہ چونکا دینے والی باتیں کیں تھیں اور عملی طور پر اردو کا نیا املا رائج کیا تھا جس کی بنیاد صوتیاتی اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ مثلاً وہ خود اپنا نام جعفر حسن "جافر ہاسن" لکھا کرتے ہیں اور جامعہ عثمانیہ کو "جامعا عثمانیا" لکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ پروفیسر سجاد مرزا کا

تعلق فن تعلیم سے تھا وہ کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل رہے اور معتمد تعلیمات کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے ۔ لیبیا میں بھی انہوں نے تعلیمی امور کی رہنمائی کی تھی ۔ اِن کا دلچسپ موضوع اُردو کی طباعت سے تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریزی اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اُردو کی چھپوائی کا شاندار اور سائنٹفک انتظام ہو انہوں نے کئی عملی تجربے کئے تھے وہ سارے کے سارے ادھورے رہ گئے لیکن ہماری زبان کی تاریخ میں اِن کوششوں کو بھلایا نہیں جاسکتا ۔

اُردو میں علم لسانیات پر گراں قدر کارنامے انجام دینے والوں میں دو نام تاریخی اہمیت کے حامل ہوگئے ہیں ۔ یہاں مراد پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر گیان چند جین سے ہے ۔ ان دونوں ماہرین لسانیات نے جس فنی بصیرت سے اُردو میں علم لسانیات اور زبان کی تاریخ و ترتیب کو سمجھایا ہے وہ صرف اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ ان دونوں ماہرین لسانیات کا حیدرآباد کی علمی، ادبی اور فکری محفلوں سے وابستگی اور عملی خدمات ہمارے اس بیان کی تائید کرتے ہیں کہ

"اللہ رب العزت کا بڑا احسان ہے کہ حیدرآباد کے باسیوں نے اُردو زبان اور ادب کی مختلف انداز سے خدمات انجام دی ہیں ۔ ان خدمات کا ایک تسلسل ہے ۔"

سید حمید الدین قادری شرفی کی تالیف "ہند آریائی اور اردو" اس تسلسل کی ایک مضبوط کڑی ہے ۔ سید محی الدین قادری سے سید حمید الدین قادری تک علم زبان اور لسانیات پر مختلف انداز سے اور مختلف حیثیتوں سے جو کام انجام پائے ہیں ان کا لب لباب زیرِ نظر تالیف ہے ۔ اِس کتاب کی شانِ نزول بڑی دلچسپ ہے ۔ مولف سید حمید الدین قادری شرفی کی یہ دیرینہ تمنا تھی کہ وہ اپنے والد حضرت سید سیف الدین قادری شیف شرفی کے روحانی اور اصلاحی مشن کے ساتھ ساتھ مروجہ تعلیم سے بھی وابستہ رہیں ۔ چنانچہ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے اردو زبان میں ایم ۔ اے کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی ۔ اس دوران انھیں اُردو ادب کی تاریخ کے ساتھ ساتھ علم لسانیات کا بھی مطالعہ کرنا پڑا ۔ اِس زمانہ ہی سے انھیں اس علم سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ۔ قادری شرفی پچھلے سال انھیں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کا ارادہ ہوا ۔ مجھے ان کے والد محترم حضرت سید سیف الدین صاحب

سے ارادت مندی کا شرف حاصل ہے اور سید حمید الدین قادری شرفی کو مجھ سے حسنِ ظن اسی قلبی لگاؤ کا نتیجہ ہوگا۔ کہ موصوف نے میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لئے کام کرنا چاہا۔ اس بارے میں میرا طریقہ یہ ہے کہ میں پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالرس کو یونیورسٹی میں داخلہ دینے سے پہلے آزمائشی طور پر کوئی مختصر سا کام سپرد کرتا ہوں اس طرح مجھے چند ماہ تک اسکالر کی صلاحیتوں کو سمجھنے اور اس کے میلانِ طبع کو معلوم کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ سید حمید الدین قادری شرفی نے ایک مختصر سی مدت میں ایک خوبصورت تالیف کو پیش کرکے یقین محکم اور عمل پیہم کا ایک عملی مظاہرہ کردیا اور کام کی ایک اچھی مثال قائم کردی۔

میں نے مندرجہ بالا سطور میں یہ عرض کیا ہے کہ علم لسانیات پر لکھی گئی کتابوں کا ایک تسلسل ہے۔ یہ تسلسل فکری بھی ہے اور فنی امور سے متعلق بھی۔ مولف سید حمید الدین قادری شرفی نے اپنے اس علمی ورثہ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا اظہار ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مولف نے بڑی ہوشیاری سے مسائل میں خود کو الجھائے بغیر صرف اپنے موضوع کے فضائل کے سہارے اپنے قاری کو بہت کچھ دیا ہے۔ "اکثر مقامات پر طویل فقرے اور جی بھر کر بات کرنے اور بات میں بات پیدا کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ کام سے والہانہ محبت اور سلیقہ سے پیش کرنے کا ڈھنگ سید حمید الدین قادری شرفی کا حصہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ علم لسانیات کے ایسے طالبین جو خود کو مبتدی سمجھتے ہیں اس کتاب کو پسندیدگی سے دیکھیں گے میری دعا ہے کہ درسی مزدیات کی تکمیل میں سید محی الدین قادری اور شمس اللہ قادری کی تالیفات کی طرح سید حمید الدین قادری شرفی کی خدمات بھی مقبول ہوں۔

ڈاکٹر محمد عبد الرزاق وارقی

صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی۔ گلبرگہ

۲۴۔ جولائی سنہ ۱۹۸۶ء

م ۱۶ ذی قعدہ سنہ ۱۴۰۶ھ

بمقام :۔ گلبرگہ

اپنی بات

خالقِ حقیقی کی تخلیقات میں سب سے زیادہ فقید المثال اور اعلیٰ ترین شاہکار خود انسان ہے جسے عقل و نطق دے کر ساری مخلوقات میں ایک امتیازی شان دی گئی ہے "گویائی" انسان کا ایسا وصف ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کر سکتا ہے جب کہ دیگر حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ اس نعمت سے محروم ہیں۔ زبان گویا انسانی عظمت و شرافت کی نمایاں خصوصیت ہے بولنا اور ہے، بولنے کے اصول و ضوابط سے واقف ہونا اور ہے چوں کہ زبان کے یہ دو پہلو ہیں اور اس کا حیاتِ انسانی سے گہرا تعلق ہے لہٰذا زبان کا مطالعہ انسانی علوم سے خارج نہیں ہے بل کہ دیگر علوم کے ساتھ مربوط ہے زبان اور اس سے متعلق جملہ مسائل سے بحث کرنے والے علم کو لسانیات سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مختلف علوم و فنون میں تحقیقات کے رجحان نے کئی طرح سے علم لسانیات کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کی جامعات میں اس علم کی نصاب تعلیم میں شمولیت لازمی قرار دی گئی اور عصری اصولوں پر اس کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ مغربی ملکوں میں ابتدائی جماعتوں سے ہی اس کی تدریس کا انتظام ہے بالخصوص جرمنی اور فرانس میں اس موضوع پر نہایت محسوس وقیع اور وسیع کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی یہ مضمون جامعاتی نصاب میں شامل ہے بل کہ اکثر یونیورسٹیوں میں باضابطہ شعبے قائم ہیں یہ اور بات ہے کہ علم لسانیات کے بارے میں ہمارے پاس "خشک موضوع" کا تصور آج تک بھی پایا جاتا ہے۔

اردو میں علم لسانیات اور خود اردو زبان کے لسانی ڈھانچہ اور نسلی و تاریخی تسلسل کے متعلق اگرچہ کہ قابل اعتنا مواد موجود ہے مگر وہ اس قدر منتشر ہے کہ طلباء کے لئے انھیں اکٹھا کر کے اپنی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا دشوار کن مرحلہ ہے اس موضوع کی نصاب میں شامل کتابیں اکثر و بیشتر بازار میں نہیں ملتیں اور لائبریریوں میں بھی بمشکل دستیاب ہوتی ہیں۔ اگر ایک دو کتابیں مل بھی جائیں تو ان میں لسانیات

سے متعلق یا اُردو زبان سے متعلق ضروری اور مفید مواد کا فراہم ہونا یقینی نہیں ہوتا کیوں کہ بعض کتابیں صرف لسانیات سے ہی بحث کرتی ہیں اور بعض میں صرف اردو کے متعلق تھوڑا بہت مواد ملتا ہے یا پھر بعض ادبی رسائل میں چند موضوعاتی مضامین ہی ملتے ہیں جو طلباء کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر پاتے اس وجہ سے ان میں بے چینی اور الجھن سی پیدا ہوتی ہے اس کا تجربہ خود مجھے بھی ہوا ہے ما در علمہ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کی تکمیل کے دوران لسانیات کے پرچہ کی تیاری کے لئے درکار مواد کا حصول ایک کڑی آزمائش تھی مجھے اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی تب کہیں چند کتابیں ملیں جن کی مدد سے امتحان کی منزل آسان ہو سکی۔ مجھے اس وقت سے برابر اس بات کا خیال رہا کہ اس موضوع پر ایک ایسی کتاب ہونی چاہیے جو طلبا کی لصابی اور امتحانی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

سال گذشتہ جب پی ایچ ڈی کے لئے ریسرچ کے ارادہ نے عزم مصمم کا روپ اختیار کیا تو میں گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے رجوع ہوا جہاں شفیقی محترم ڈاکٹر محمد عبدالرزاق صاحب فاروقی صدر شعبہ نے میرے عزم کو سراہا اور حوصلہ افزائی بھی فرمائی تاہم ایک کڑی شرط یہ لگائی کہ ریسرچ کے لئے درکار اہلیت کے ثبوت دینے کے لئے مجھے کوئی تسلی و تحریری کام کر کے دکھانا پڑے گا ورنہ ریسرچ کے لئے اجازت کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ البتہ یہ بات مجھ پر چھوڑ دی کہ میں اردو زبان و ادب سے متعلق کوئی بھی موضوع، چنے اس آزمائشی کام کے لئے منتخب کر لوں۔

علم لسانیات اور اردو زبان کے متعلق کسی ایسی کتاب کی ضرورت کا خیال مجھے کئی دنوں سے تھا جو طلباء کی لصابی ضرورت بالخصوص امتحانی نقطہ نظر سے معاونت کر سکے اور انھیں بیک وقت کئی کتابوں کی تلاش و جستجو نیز دستیاب کتابوں کی غیر لصابی تفصیلات میں جانے کی زحمت سے بچایا جا سکے۔ اسی غرض سے میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا ویسے میری ذاتی دلچسپی بھی اس میں شامل ہے ابتدا میں میں نے اس موضوع پر جتنی کتابیں مل سکیں ان کا مکرر اور نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا پھر ان ساری کتابوں کو اپنے سامنے رکھ کر ہماری جامعات میں لسانی اور اردو زبان سے متعلق مقررہ نصاب کے لحاظ سے، امتحانی پرچوں کے سوالات کی روشنی میں ضروری اہم اور مفید مواد اکٹھا کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ متعلقہ موضوع پر اردو میں موجود کم و بیش تمام اہم کتابوں سے میں نے ممکنہ استفادہ کیا جس کا ثبوت وہ حوالہ جات ہیں جسے آپ زیر نظر کتاب میں جگہ جگہ پائیں گے جہاں تک انگریزی یا دیگر زبانوں کی کتابوں کا سوال ہے ان کے دستیاب اور دو تراجم ہی میرے پیش نظر رہے یا پھر ان سے بالواسطہ فیض اٹھایا ہے۔

چوں کہ اس کتاب میں مبادیات لسانیات کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے ہند آریائی خانوادہ السنہ کے ساتھ نسلی و تاریخی رشتہ اور ساخت و پرداخت کی یکسانیت کا حال ملتا ہے اس وجہ سے اس کا نام "ہند آریائی اور اردو" تجویز کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں علم لسانیات سے متعلق بنیادی، اور مفید مواد اکٹھا کیا گیا ہے حصہ دوم میں اصل موضوع یعنی اردو زبان سے متعلق مکمل تفصیلات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب سے پہلے مطالعہ کائنات اور انسان کے زیر عنوان ایک تعارف شامل کیا گیا ہے تاکہ قاری کی تدریجی طور پر اصل موضوع سے دلچسپی بڑھائی جائے۔ خالص موضوعاتی مباحث میں اگرچہ کہ اس طرح کی کوئی مثال نہیں ملتی لہذا اسے میری بدعت سے تعبیر کیا جائے جن معتبر کتب سے مدد لی گئی ہے ان کی ایک مختصر فہرست کتابیات کے زیر عنوان دیدی گئی ہے۔ دنیا کے چند مشہور ممالک، ان کے صدر مقامات آبادی اور مروج زبانوں کے جدول کے ساتھ ساتھ اور بعض الفاظ کی انگریزی فرہنگ اور آخر میں طلبا کی سہولت کے لئے لسانیاتی اصطلاحات بلحاظ حروف تہجی دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل کے بعد جب میں نے مسودہ تشفیقی محترم ڈاکٹر رزاق فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو گلبرگہ کی خدمت میں بغرض ملاحظہ پیش کیا تو انہوں نے اس کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد اسے شرف قبولیت بخشا اور اس کام کو اس لائق قرار دیا کہ اس کی بنیاد پر مجھے پی۔ ایچ ڈی کے لئے ریسرچ کا اہل قرار دیں چنانچہ مجھے ریسرچ کی باضابطہ اجازت مل گئی۔ یہی نہیں بلکہ محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب کے لئے ایک وقیع پیش لفظ بھی تحریر فرمادیا۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے بذریعہ مکتوب نشان (GUG/URDU/86-87/926) یہ اطلاع دی گئی کہ گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی نصابی کمیٹی نے ایم۔ اے (سال اول) کے پرچہ اول کے لئے مجوزہ کتابوں میں "ہند آریائی اور اردو" کی شمولیت کی سفارش کی ہے۔ اس کو میں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور سرکار سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان سمجھتا ہوں کہ میری یہ کاوش اس لائق سمجھی گئی۔

زیر نظر کتاب میری پہلی تالیفی کاوش ہے میں نے اس کو صوری اور معنوی اعتبار سے بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کی بساط بھر سعی کی ہے اس کے باوجود اگر اس میں کوئی کمی بے ترتیبی یا غلطی نکل آئے تو اسے محض میرے عجز اور جہل پر ہی محمول کیا جائے اس کتاب کی تیاری کے دوران جناب محترم ہاشم حسن سعید صاحب پرنسپل کالج آف لنگویجس جن کی اس موضوع پر بڑی گہری نظر ہے، سے وقتاً فوقتاً میں نے تبادلہ خیال کیا اور ان کے گرانقدر مشورے حاصل کئے ونیز انہوں نے اس کتاب پر ایک پر مغز بسیط مقدمہ تحریر

فرمایا ہے میں اس کے لئے ان کا بے حد ممنون ہوں۔ یہاں پر خصوصیت سے جناب پروفیسر مغنی تبسم صاحب وزیٹنگ پروفیسر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کو ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے جنھوں نے ازراہِ خرد نوازی اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ حصہ اس کتاب کے رقماً دقماً ملاحظہ اور نظرِ ثانی کے لئے دیا اور متعدد جگہ تصحیح و ترمیم فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں کے ساتھ ساتھ ایک حوصلہ افزا نوٹ تحریر فرمایا۔

استادِ محترم حضرت علامہ سید رشید پادشاہ قادری (امیر جامعہ نظامیہ) برادرِ محترم سید شاہ علیم الدین قادری شرفی اور شریکِ حیات آم حسیب کے علاوہ

محمد اعجاز صاحب بی کام فرزند ارجمند سید حسیب الدین قادری شرفی اور برادرم سید رفیع الدین قادری شرفی کا بھی شکریہ ادا کرنا خوشگوار فریضہ خیال کرتا ہوں جنھوں نے فراہمیِ کتب، مشوروں اور حوصلہ افزائیوں کے ذریعہ معاونت کی۔ مخرالذکر نے مسودے کی ترتیب اور کتابت شدہ اوراق کی پروف ریڈنگ کے علاوہ، فراہمیِ مالیہ کے ذریعہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

حیدرآباد کے مشہور پبلشنگ ادارہ الیاس نیڈرس کے سربراہ محبی و مکرمی جناب محمد علی صاحب زید مجدہ کی مجھ پر یہ خصوصی عنایت رہی کہ انہوں نے کتابت و تزئینِ طباعت و اشاعت کی تمام تر ذمہ داریاں اپنے سر لے کر مجھے ان صبر آزما مراحل سے نجات دلائی اور کتاب زیرِ نظر کو اپنی خصوصی نگرانی میں اپنے ادارہ سے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

"شرفی چمن"

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش
دوشنبہ۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء

سید حمید الدین قادری شرفی

کتاب سے پہلے

مطالعۂ کائنات THE STUDY OF UNIVERSE

خالق حقیقی نے کائنات (UNIVERSE) رنگ و بو کو تمام تر تخلیقی شان کے ساتھ خوب سجایا، سنوارا اور نکھارا ہے فطرت (NATURE) کے حسن کی رعنائیاں ہر ذرہ سے جھلکتی ہیں۔ کسی کو رنگ کسی کو آہنگ، کسی کو حسن و جمال، کسی کو فضل و کمال، کسی کو جاہ و جلال، کسی کو سوز و ساز، کسی کو ناز و انداز کسی کو نکہت، کسی کو نزاکت کسی کو تاریکی، کسی کو روشنی، کسی کو تیرگی اور کسی کو چاندنی، بہر حال ہر ذرہ کو ایسی اہمیت عطا کی کہ اسے بے مثل و بے نظیر بنا دیا۔

زمین کا فرش بچھایا۔ آسمان کا شامیانہ کھڑا کر دیا، چاند و سورج اور ستاروں سے اسے منور کر دیا، زمین کو وسعتیں دیں اس پر ہریالی کا زمردی غلاف اڑھایا، سرسبز و شاداب درختوں سے آراستہ کیا، پھر اس کے سینے پر وسیع و عریض، بلند و بالا پہاڑ نصب کر دیئے تاکہ ان کی ہیبت و قوت سے ساکن رہے۔ پہاڑوں پر برف کی چادریں ڈال دیں، ایسا انتظام کیا کہ ایک خاص وقت پر برف پگھلے اور دیدہ زیب آبشاروں کا روپ دھارے، آبشاروں کو سریلے نغمے دیئے تاکہ سماعت لطف اندوز ہو۔ زمین کے دامن دگر یہاں کو صحراؤں، سمندروں سے رونق بخشی

کائنات کا ہر ذرہ اپنی جگہ اہم اور ناگزیر ہے ساری کائنات کو خوبصورت، افادیت سے بھرپور اور بامقصد بنانے میں ہر ایک کا ایک کردار ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، اور نظام شمسی کے تحت گردش لیل و نہار میں اپنا اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔

علم الحیات (PHYSIOLOGY) کے ماہرین کہتے ہیں کہ آفرینندۂ حقیقی نے حیاتیاتی خلیوں (CELLS) کو سب سے پہلے پانی میں ظاہر کیا۔ اور انسان کا جوہر حیات آب و گل کی آمیزش ہوئی آمیزش میں نمودار کیا۔ تجسیم و تکمیل کی منزلیں رفتہ رفتہ طے ہوئیں۔ آب و تراب کا یہ پیکر قدرت کا

اعلیٰ ترین تخلیقی شاہکار بن گیا ہی وہ نازشِ فطرت ہے جسے کائنات کی خسروی بخشی گئی۔

ہر حقیقت دل نشین ہوتی ہے۔ فطرت کا کوئی گوشہ الجھا ہوا نہیں ہے، الجھاؤ درحقیقت بناوٹ اور تکلّف کا نتیجہ ہوتا ہے انسان کا وجود تمام مظاہر و آثار کائنات (NATURAL PHENOMENA) آثار کائنات میں خود اس کے لئے پہلی دلچسپی کا موضوع ہوگا۔ انسانی وجود اور خارجی احول فطرت کی جلوہ گاہیں ہیں۔

جو چیز جتنی اہم ہوگی اور اُس کی جتنی احتیاج ہوگی وہ اتنی ہی بلکہ ضرورت سے کہیں زیادہ فطرت نے مہیّا کردی ہے جیسے ہوا (AIR) زندگی کی سب سے زیادہ بنیادی اور ضروری چیز ہوا ہے۔ چناں چہ یہ ہر جگہ موجود ہے جہاں جاؤ ہوا موجود جتنی چاہو سانس لو یہ کم نہ ہوگی۔

انسانی حیات کی دوسری بڑی ضرورت پانی (WATER) ہے یہ بھی خاص نظم اور ترتیب سے ہر جگہ میسّر ہے زمین پر سمندروں، دریاؤں اور نالوں کی صورت میں زیر زمین کنوؤں، چشموں، نہروں اور پوشیدہ ذخائر کی شکل میں و نیز فضاؤں میں ابر اور برسات کے روپ میں پانی موجود ہے۔ جتنا چاہو استعمال میں لاؤ کمی نہیں ہوگی۔

تیسری اہم ترین شے زندگی کے لئے غذا (FOOD) ہے۔ فطرت نے تری و خشکی دونوں کے وسیع تر دسترخوان بچھا رکھے ہیں نظم و ضبط کی یہ بااصول کیفیت ظاہر کرتی ہے کہ فطرت نے ہر شے کو ایک خاص ڈھنگ اور ضابطہ کے تحت فراہم کر دیا ہے۔

مطالعہ کائنات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حقیقت کبھی نہیں بدلتی بلکہ صورت تبدیل ہوتی ہے اور نہ حقیقت معدوم ہوتی ہے صرف صورت معدوم ہوتی ہے، حقیقت جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ تمام مخلوقات کی پیدائش کا ایک ہی ڈھنگ ہوتا ہے ان کا نشوونما، ان کی پرورش کا انداز بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس کے بعد مرجانا، مرجھانا اور پامال ہو جانے کا بھی ایک ہی طرز ہوتا ہے۔[1]

---

[1] ۔ ترجمان القرآن، مولانا آزاد جلد۔ ۱۔ صفحہ ۳۰ تفسیر سورہ فاتحہ، ناشر ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن

انسان (THE MANKIND)

کائنات کا نظام ایک خاص اصول کے تحت قائم و برقرار ہے اس میں اگر کوئی تغیّر و تبدّل (REVOLUTIONARY CHANGES) ہوتا بھی ہے تو محض منشاء وجود کی تکمیل اور صورت گری کے لئے ہوتا ہے کائنات کی ہر شئے اٹل، ضروری اور ناگزیر ہے کوئی بھی بے سبب یا بلا ضرورت نہیں ہے خلقت انسانی کے اغراض و مقاصد کیا ہیں یہ ہمارا موضوع نہیں البتہ انسانِ اوّل کے بارے میں بشریات کے ماہرین اور مذہب نے جو نظریئے پیش کئے ہیں ان کی تھوڑی سی تفصیل یہاں خارج از دلچسپی نہ ہوگی۔

انسان پیدائش سے قبل

نطفہ

علقہ

مضغہ

مخلقہ — غیر مخلقہ

انسان یوں تو حیاتیات کی اصطلاح میں حیوان کی تعریف میں آتا ہے۔ انسان دراصل جسد و روح کے مرکب کا نام ہے۔ اس کا منفرد اور اچھوتا اعصابی نظام نیز اُس کی عقل اُسے تمام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ جس طرح ایک چھوٹا سا بیج، زمین میں بوئے جانے کے بعد ایک تناور درخت میں بدل جاتا ہے، اسی طرح انسان بھی ایک حقیر ترین قطرہ سے خلقت، عظم و لحم۔ تجسیم، تشکیل اور تکمیل کی منزلیں طے کرتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے۔

نُطفہ (SPERM) ایک قطرہ بے مقدار ہے جو مرد کی پشت سے نکل کر عورت کے رحم میں داخل ہوتا ہے نطفہ کہلاتا ہے۔ اسے لغت میں پانی کے ایک قطرہ کو کہتے ہیں۔ چوں کہ جنین کی تکوین کا ابتدائی مادہ پانی کے قطرہ کی طرح ہوتا ہے اسی لئے اس کو نُطفہ کہتے ہیں۔

عَلقہ) خون بستہ یا جمے ہوئے خون کو علقہ کہتے ہیں۔

مُضغہ) گوشت کے ایک ٹکڑے کو مضغہ کہتے ہیں۔

مخلّقہ (...) یعنی اس گوشت کے ٹکڑے ہی میں یعنی مضغہ میں شکل و صورت کی نشان پیدا ہو جانے کو مخلّقہ کہتے ہیں۔

غیر مخلقہ ( ) اگر گوشت کا وہ ٹکڑا متشکل نہ ہو سکے تو غیر مخلّقہ کہلاتا ہے۔
شکم مادر میں جنین (FOETUS) کتنی منزلوں سے گذرتا ہے اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے
تغیّر و تحوّل کا اصول بھی جاری و ساری رہتا ہے اس کے بعد پیدائش کی نازک منزل سے گزر کر زندگی
کی بے کرانیوں میں اپنے وجود کا لوہا منواتا ہے۔ پیدائش کے بعد بھی وہ چار حالتوں سے گذرتا ہے۔

عہد طفولیت :(INFANCY PERIOD) پیدائش کے بعد سے سن شعور تک
پہنچنے کا زمانہ دور طفولیت کہلاتا ہے

عہد شباب و جوانی :(YOUTH PERIOD) طفولیت سے نکل کر سن رشد کو پہنچنے کا
زمانہ عہد شباب و جوانی ہے

عہد کہولت (MIDDLE AGED PERIOD)
شباب اور بڑھاپے کے درمیان کا زمانہ عہد کہولت یعنی ادھیڑ پن
کا عہد کہلاتا ہے۔

عہد ضعیفی :۔ بڑھاپے اور بزرگی کا زمانہ عہد ضعیفی
ہوتا ہے یہی عہد مشیخت جب انتہا کو پہنچ جائے تو آدمی کھوسٹ
ہو جاتا ہے۔ یہی عہد ارزل العمری ہے[1]۔

انسان کی طفولیت نادانی سے
شروع ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ شعور و احساس (SENSE)
کی راہوں پہ رینگتے، چلتے اور دوڑتے بتدریج
رشد عقل کے کمال تک پہنچتا ہے اس کمال کے بعد ایک
ٹھہراؤ، پھر اس کے بعد زوال شروع ہوتا ہے

نطفہ نہ گوشت پوست ہے، نہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نہ ڈیل ڈول ہے، نہ قد و قامت ہے، نہ
شکل و صورت ہے اور نہ عقل و حواس بلکہ ایک قطرہ حقیر ہے مگر اسی سے انسان کا جسم، صورت

انسان پیدائش کے بعد
↓
عہد طفولیت
↓
عہد شباب
↓
عہد کہولت
↓
عہد ضعیفی
↓
ارزل العمری

---

[1] ۔ تقریر مولانا ید رشید پاشاہ قادری امیر جامعہ نظامیہ حیدرآباد

اور ذہن بنتا ہے اسی سے اس کی ساری پوشیدہ قوتیں ظہور میں آتی ہیں اسی میں تمام توانائیاں موجود رہتی ہیں۔

انسانی خلقت کے بارے میں کئی خیالات ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ بشر اول تو صناع ازل کی کاری گری کا مرقع ہے اور اسی کے دستِ قدرت سے معرض وجود میں آیا۔ اس کلیہ کو سب ہی بلا عذر مانتے ہیں کہ نسل انسانی مرد و عورت کے ملے جلے پانی ہی سے قائم ہوئی۔ پہلے ایک فرد سے کئی افراد پیدا ہوئے پھر ان کے الگ الگ نسلی سلسلے قائم ہوئے یہ سلسلے پھیلتے گئے اور خاندان، قبیلہ گروہ اور بستیوں کی صورت میں وسعت پاتے گئے۔ نفس بشری میں تو سارے انسان برابر ہیں۔ سب کی یکساں اور مساویانہ حقیقت ہے[1]

انسان کا جسم تخلیقی حکمت و کمال کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے ایسی وضع اور بناوٹ کسی کی نہیں ہے ارتقاء (EVOLUTION) کا قانون فطرت کا منشاء ہے ہم مان سکتے ہیں کہ انسان کا جسم (BODY) اور اس کا دماغ بھی اسی اصول کے تحت آتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کا جسم بتدریج ترقی کرتا ہوا نچلی حیثیت سے اونچی منزلوں تک پہنچا ہے اسی طرح اس کے دماغ (BRAIN) کا بھی ارتقاء ہوا اس کے تصورات بھی تدریجی طور پر نچلے درجوں سے اعلیٰ درجوں تک پہنچے ہیں۔ یہ کہنا کہ انسان پہلے بندر تھا پھر ارتقاء اصلح اور انتخاب کے اصول پر تغیرات اور تبدیلیوں سے گذر کر انسان بنا ہے[2] مضحکہ خیزبات ہے کیوں کہ انسان شروع ہی سے انسان ہے اور بندر ابتداء ہی سے بندر تھا اس نے اس کا روپ دھارا نہ اس نے اس کا چولا پہنا ہے ہاں ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں تخلیق کے مقصد کی تکمیل میں مصروف ہے۔

عقل و بصیرت ہی انسانی شرف اور فضیلت کا سبب ہیں۔ انسان اور دیگر حیوانات (ANIMALS) کے تقابلی مطالعہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان میں کیسے کیسے تنوع (VARIETY) اور دل پذیریاں ہیں۔ انسان کا جوہر انسانیت اسے حیوانیت کی سطح سے بلند کر دیتا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ انسان درحقیقت جسم و جان سے عبارت ہے مثلاً اگر زید سے اس کی روح (SOUL) جدا ہو جائے یعنی زید کا جسم چھوڑ دے تو اب دید کو زید نہیں کہا جائے گا بل کہ زید کا مردہ کہیں گے کیوں کہ وہ ہر قسم کے احساس شعور حرکت و عمل اور دوسرے لوازمات زندگی سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ انسان کی تخلیق اچھے طور سے ہوئی عقل و فہم اور نطق (POWER OF SPEECH) کی دولت ملی تفکر و تدبر کا اہل بنایا گیا۔ شاید فطرت کا منشاء

---

[1] تقریر مولانا رشید پاشاہ قادری امیر جامعہ نظامیہ حیدرآباد

[2] ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

ہی یہی ہے کہ کائنات پر انسان ہی کا تصرّف ہو۔

حسّیات (THE SENSES)

ہر مخلوق کی طبیعت میں ایک ایسا اندرونی الہام ہوتا ہے جو اسے حیات اور پرورش کے راستے پر گامزن کر دیتا ہے، اسی داخلی الہام کا نام احساس و شعور (PERCEPTION) ہے۔ بچہ اپنی غذا کے مقام یعنی ماں کی چھاتی کو از خود پہچان لیتا ہے۔ ٹٹولنا۔ چوسنا وغیرہ اپنی غذا حاصل کرنے کا یہ وجدان بچہ کو بلا کسی تربیت خود بخود راہ پر لگا دیتا ہے[1]۔

حیوانات اگرچہ کہ جوہر دماغ سے محروم ہیں تاہم انھیں بھی احساس کی وہ تمام قوّتیں ملی ہیں جن کی زندگی اور معیشت (SUBSISTENCE) کو ضرورت ہوتی ہے اور انھیں کے تعاون سے وہ رہنے سہنے، کھانے پینے توالد و تناسل (GENERATION) اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف عمدگی کے ساتھ انجام دیتے ہیں لیکن انھیں یہ قوتیں ضرورت اور استعداد کے لحاظ سے ملی ہیں جیسے چیونٹی کی قوت شامّہ اور چیل کی قوّت باصرہ بڑی قوی ہوتی ہے، جن کی مدد سے ان کے غذا کے مسائل بہ آسانی حل ہوتے ہیں[1]۔

انسان کے لئے حسّیاتی وجدان کا وسیع اور وقیع دائرہ عقل و نطق کی خصوصیات اور نقل کرنے کی صلاحیت (CAPACITY) اس کو تمام مخلوقاتِ حسّیہ سے ممیز کرنے کا سبب ہے انسان فطرتاً سماجی حلقہ میں جینے کا عادی ہوتا ہے، اس میں تمدنی خصلتیں (HABITS) نمایاں ہیں تجربات اس کو بہت ساری باتیں سکھاتے ہیں۔

عقل کی اہمیت اور مرکزیت مسلّمہ حقیقت ہے۔ محسوسات جب عقل و شعور کو اپنے تجرباتی پیغامات ترسیل کرتے ہیں تو دماغ ان کو یکجا کر کے مفید نتائج نکالتا ہے حسبِ ضرورت تمام اعضاء (ORGANS) کو مناسب ہدایات دیتا ہے۔ دماغ ہی انسان کی جسمانی سلطنت کا مرکزی مقام ہے۔ احساسات، مشاہدات اور تجربات اس کے معاون، مددگار اور جواسیس (SPIES) ہیں۔

انسانی علم کے ذرائع یا حواس پانچ ہیں۔ یہ انسان کے ساتھ حیوانات کو بھی حاصل ہیں ذرق

---

[1] ترجمان القرآن حصہ اول صفحہ ۴۳، ۴۵ تفسیر سورہ فاتحہ مولانا ابوالکلام آزاد ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن

صرف ان کے برتاؤ اور استعمال کا ہے۔ حواسِ خمسہ (THE FIVE SENSES) دراصل دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں ہیں، ان قوتوں سے انسان جو کچھ معلوم کر سکتا ہے اس کے لئے "محسوس" اور جو معلوم نہیں کر سکتا "غیر محسوس" ہے

حواس ظاہری

- قوت باصرہ
- قوت سامعہ
- قوت ذائقہ
- قوت شامہ
- قوت لامسہ

قوت باصرہ (POWER OF VISION) دیکھنے کی صلاحیت کو اصطلاح میں قوت باصرہ کہتے ہیں اس کا ذریعہ آنکھ ہے۔

قوت سامعہ (THE FACULTY OF HEARING) سننے کی صلاحیت کو اصطلاح میں قوت سامعہ کہتے ہیں اس کا ذریعہ کان ہے۔

قوت ذائقہ (SENSE OF TASTE) چکھنے کی صلاحیت کو اصطلاح میں قوت ذائقہ کہتے ہیں اس کا ذریعہ زبان ہے۔

قوت شامہ (THE SENSE OF SMELLING) سونگھنے کی صلاحیت کو اصطلاح میں قوت شامہ کہتے ہیں، اس کا ذریعہ ناک ہے۔

قوت لامسہ (SENSE OF TOUCH) چھونے کی صلاحیت کو اصطلاح میں قوت لامسہ کہتے ہیں اس کا ذریعہ سارا بدن یا جلد ہے۔ بدء خلق اور انسان کی ابتدائی پیدائش اور نشوونما کے بارے میں بلا فیضان وحی والہام کوئی بھی محض ذہنی وسائل (MEDIATION) کے بل بوتے پر روشنی حاصل نہیں کر سکتا تاہم دیگر امور میں انسان اگر عقل سے کام نہ لے تو ذہن وادراک کی ساری قوتیں بیکار رہ جاتی ہیں۔ انسانی عقل کا ادراک محسوسات کے دائرے میں مقید ہے۔ تدبر وتفکر کی رسائی یا شعور انسانی کا جتنا حاشیہ ہے بیک وقت ظہور پذیر نہیں ہوا بل کہ وہ ایک طول طویل عرصہ کے نشوونما اور ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

خیال اور حواسِ باطنی (CONCEPTION & INTERNAL SENSES)

انسان کی عقل حواسِ خمسہ کے ذریعہ جو ادراک اور اشیاء کا عرفان حاصل کرتی ہے، اس کے نتیجہ میں جو تفکر، تجسس اور تصور (IMAGINATION) پیدا ہوتا ہے اس کو خیال کہتے ہیں جس طرح انسان پانچ حواسِ ظاہری طور پر رکھتا ہے اسی طرح اس کو پانچ حواسِ باطنی بھی ودیعت کئے گئے ہیں خیال

کا تعلق حواسِ باطنی سے ہے انسان کے حواسِ باطنی

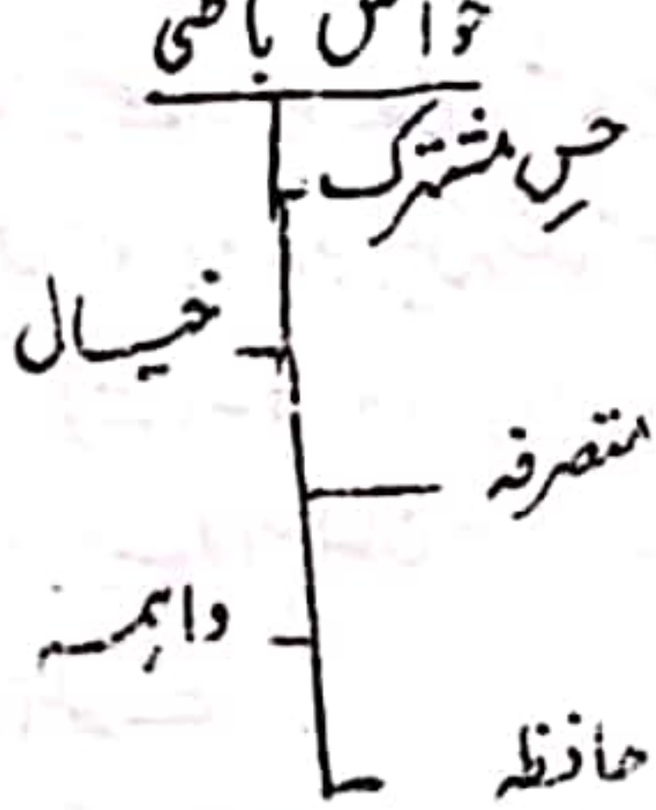

حسب ذیل ہیں

حسِ مشترک (COMMON SENSE) وہ قوت ہے جو ان تمام صورتوں کو قبول کرتی ہے جو حواسِ ظاہری میں مرتسم ہوتے ہیں۔

خیال (CONCEPTION) وہ قوت ہے جو صورِ محسوسہ کے غائب ہو جانے کے بعد انھیں محفوظ رکھتی ہے یہ حسِ مشترک کا خزانہ ہے۔

متصرفہ (Faculty of Possessing) وہ قوت ہے جو حسِ مشترک اور خیال کے خزانے کو بروقت کام میں لاتی ہے۔

واہمہ (THE FACULTY OF IMAGINATION) وہ قوت ہے جو، وہ تمام چیزیں جنھیں دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو سچ ہو یا جھوٹ ان سب کو منقوش کرتی ہے۔

حافظہ (FACULTY OF MEMORY) وہ قوت ہے جو ان تمام چیزوں پر نگاہ رکھتی ہے جو حواسِ ظاہری و باطنی کے ذریعہ اس تک پہنچتی ہیں۔[1]

گویا حواسِ باطنی کا براہ راست حواسِ ظاہری سے اٹوٹ تعلق ہوتا ہے ان میں خیال کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ صورِ محسوسہ کے معدوم ہو جانے کے باوجود انھیں محفوظ رکھتی ہے گویا خیال کی حیثیت مرکزی ہے۔

انسان جب ان دیکھی اور غیر محسوس چیزوں کا تصور کرے گا تو تصور میں وہی صفات آئیں گی جنھیں وہ دیکھتا سنتا رہا ہے اور اس کے حاشیۂ ذوق و لمس سے باہر نہ ہوں جسمانی ساخت اور داخلی حیثیت سے تمام انسان یکساں نہیں ہوتے اور اگر سب یکساں ہوتے تو فکری و عملی جمود (INACTIVITY) کے شکار ہو جاتے۔ یہ اختلاف فطری امر ہے اسی سے انسانوں میں رنگا رنگ کیفیت اور فکر و عمل کے ہر گوشہ میں ایک دلچسپی ہے۔[2]

مشاہدات اور محسوسات ایک ایسا سانچہ تیار کرتے ہیں جس میں خیال ڈھلتا، بنتا، سجتا، سنورتا اور نکھرتا ہے اس ضمن میں مظاہر و آثارِ فطرت کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سورج

---

[1] غیاث اللغات۔

اور چاند نے' رات اور دن کے فرق اور وقت شماری کے سبق پڑھائے آگ کی حرارت نے قوت تسخیر کو گرمی تپش' سوزش و جلن کے اسرار سمجھائے گویا مظاہر فطرت نے مفہومات کی ایک پائیدار زنجیر تیار کر دی حواس شعور و ادراک کے لئے سرمایہ مہیا کرتے ہیں اور یہی خیال کے سبب بنتے ہیں یہ اور بات ہے کہ انسانی عقلوں کی عدم یکسانیت خیال کو واضح (EVIDENT) موہوم (IMAGINED) صحیح اور غلط زاویوں میں ترتیب دے۔

حادثات انسان کے ذہن کو جلد متاثر کرتے ہیں' ان سے سابقہ پڑنے پر اندرونی وجدان (RAPTURE) انسان کو باور کراتا ہے کہ ان کا اعادہ ناممکن نہیں بعض وقت شعوری اور بعض وقت لاشعوری طور پر یہی داخلی وجدان اس کے علم اور تجربہ کے ارتقاء کا سبب بنتا ہے۔ کوئی بچہ اگر آگ کو چھوئے اور اس کا ہاتھ جل جائے تو جب کبھی وہ آگ کو دیکھے گا اسے جلنا یاد آجائے گا نتیجتاً یہ اصول بلا کسی تربیت و تعلیم خود بخود اس کے ذہن میں منقوش ہو جائے گا "آگ جلاتی ہے" یہی وجدانی تاثر اسے جزئیات (PARTICULARS) کا تجزیہ کر کے کلیات تک پہنچانے میں مدد دیتا ہے بل کہ انسانی علوم و معارف کا سنگ بنیاد بھی یہی وجدان ہے۔

انسان کے ذہن نے بتدریج ترقی کی ہے۔ ذہنی ترقی و تزکیہ (PURIFICATION) میں وسعت اور شائستگی بھی آتی گئی۔

ہر تخریب (DESTRUCTION) میں تعمیر کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ آثار و مظاہر فطرت کی دہشت نے ابتداء میں انسان کو سہما دیا تھا۔ ماحول کی دہشت ناک کیفیت' بجلی کا کوندا' بادلوں کی گرج اور کڑک' زلزلے انفجار آتش فشاں' ژالہ باریاں' سیلاب' طوفان' سورج کی تپش گرمی' رات کی تاریکی' موسمی تغیرات' دلدل' زہریلے حشرات الارض درندے وغیرہ نے اسے ہیبت زدہ کر دیا اور سکھ چین چھین لیا تھا ان سب سے بچاؤ اور تحفظ کی جد و جہد نے زندگی کو مسلسل جنگ اور محنت و مشقت سے عبارت کر دیا تھا[1]

رفتہ رفتہ تخریب کے پیچھے سے تعمیر (CONSTRUCTION) کا حسن جھلکنے لگا۔

انسان کو زندگی کی معنویت اور حیات کے رموز سمجھ میں آنے لگے تب آہستہ آہستہ دہشت دور ہونے لگی عقل ٹھکانے لگی اور خیال کو جلا ملی۔ انسان ضروریات و اسباب کے بارے میں سوچنے لگا رام داس

---

[1] ترجمان القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد حصہ اول تفسیر سورہ فاتحہ ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی دوسرا ایڈیشن

کے لئے تدابیر اختیار کرنے لگا اب اسے ایک ایسے وسیلہ (AFFINITY) کی حاجت تھی جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات، خواہشات، ضروریات دلی جذبات، محسوسات اور مافی الضمیر کو ادا کر سکے اور دوسروں تک پہنچا سکے وہ وسیلہ اُسے جلد ہی مل گیا اسی وسیلہ کا نام اظہار ہے۔

ہند آریائی اور اُردو

حصّہ (الف)

باب اوّل

اظہار DISCLOSURE

فطرت کا ایک انجان اور غیر محسوس آئین ہے کہ طاقتور کمزور پر حاوی ہو جائے۔ انسانی ذہن اور جسم میں جب زور آزمائی ہوئی تو ذہن غالب ہو گیا اور جسم مغلوب! نہ صرف یہ بل کہ موجوداتِ خلقت کو بھی اس نے مسخر کر لیا۔ گویا ہر جگہ ہر شے پر ذہن انسانی کا اقتدار قائم ہو گیا اس کی سلطنت کے تخت پر خیال جلوہ گر نظر آتا ہے۔

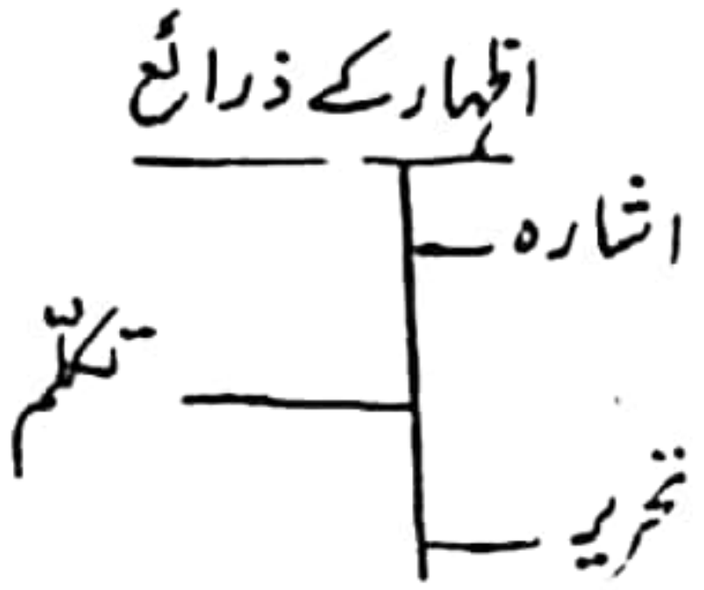

انسان فطرتاً مدنی الطبع (SOCIAL) واقع ہوا ہے اسی لئے اسے سماجی حیوان سے موسوم کیا جاتا ہے اپنی ابتداء کے اولین دور میں بھی وہ خاندانی یا اجتماعی زندگی کا عادی تھا لہٰذا اسے ترسیل و ابلاغ کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی احتیاج فطری بات تھی کیوں کہ اسی طرح سے معاشرتی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل ممکن ہے اپنے جذبات و خیالات کی ترسیل و ابلاغ (TRANSMISSION) کے لئے انسان نے جو طریقے ایجاد کئے ان میں تین طریقے بے حد کامیاب، کارآمد اور مقبول ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ (۱) اشارہ (۲) تکلم (۳) تحریر

اشارہ SIGN

انسان اپنی آفرینش کے بعد ابتدائی دور میں شعور و آگہی سے بہت دور تھا، نطق و تکلّم کے مراحل طے ہونے باقی تھے اس کے باوجود وہ خاندانی زندگی بسر کرتا تھا تب سمجھنے اور سمجھانے کے لئے وہ "اشاروں" سے کام لیتا تھا۔ یہ اشارے اعضاء جسمانی کی مخصوص حرکات و سکنات، یعنی ہاتھ، سر، آنکھ وغیرہ کے ہوا کرتے تھے۔ چوں کہ یہ فطری طریقہ، ابلاغ (COMMUNICATION) ہیں اس وجہ سے باوجود اتنی ترقی، تہذیب اور شائستگی آج تک بھی رائج ہیں اور ان کے آئندہ ختم ہونے کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

ہم اپنے سے دور بیٹھے کسی شخص کو نزدیک بلانا چاہتے ہیں تو اپنے ہاتھ کی ہلکی سی جنبش سے اُسے اپنا مدّعا سمجھا دیتے ہیں۔ اشارہ یہی ہے۔ اشاروں کی تین قسمیں عام طور پر مانی جاتی ہیں۔ پہلی قسم تو انہی اعضاء جسمانی کی حرکتوں پر منحصر ہے ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ ہم اگر کسی کو روکنا چاہتے ہیں کسی کام سے تو ہاتھ کی حرکت کافی ہوتی ہے کسی کو متوجہ کرنے کے لئے تالی بجانا، پانی طلب کرتے ہاتھوں کو اُوک بنانا، رضامندی اور انکار کے لئے سر کی جنبش درکار شئے کے لئے انگلی کا ہلانا، علیک سلیک کے لئے ہاتھ کا اٹھانا، کھانا طلب کرنے ہاتھ کا منہ تک لیجانا، بچوں کو ڈرانے کے لئے آنکھوں کا نکالنا خفگی کے اظہار یا خاص لگاؤ کے اظہار کے لئے گھورنا حیرت کے اظہار کے لئے پلکوں کا جھپکانا، جذبۂ خیر سگالی کے لئے مسکرانا وغیرہ سب اشاری زبان کے دائرہ میں آتے ہیں۔ اشاری زبان والوں سے صرف اشاروں ہی سے گفتگو ساری دنیا میں مروّج ہے۔ (CUSTOMARY) اس سلسلہ میں سب سے مؤثر مثال قوّتِ گویائی سے محروم افراد یعنی گونگوں کی ہے وہ اپنی زندگی کے سارے مسائل سارے معاملات اور سارے خیالات صرف اور صرف اشاروں، اشاروں میں پیش کرتے ہیں۔ گونگے بہروں میں دنیا کی کوئی بات نہیں چھوڑتے سب کچھ کہہ دیتے ہیں [1]

کسی خاص اشارے کے لئے پستول چلانا، گھنٹہ بجانا۔ چٹکی بجانا، سیٹی بجانا، وغیرہ اس اشاری اظہار کی دوسری قسم ہے۔ اشاری علامات جب تک یکساں مفہوم کی صورت میں عام نہ ہوں کارآمد نہیں ہوسکتے، کوئی علامت جب کسی خاص خیال کے لئے متعیّن کرلی جاتی ہے تو آسانی پیدا ہو جاتی ہے جیسے کوئی خاص کھیل یا ڈور شروع کرنے کے لئے پستول کا چلانا، وقت کے تعیّن کے لئے گھڑیال بجانا، کسی کو بلانے کے لئے سیٹی بجانا یا پھر اسکول میں مخصوص قسم کی گھنٹی بجانا چھٹی کے معنی میں ہوتا ہے۔

اس سلسلہ کی تیسری قسم جو بہت تھوڑی ہے وہ لمس ہے جیسے ہاتھ کو دبانا اور شانہ دبانا وغیرہ بقول حسرت [2]

بزم اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

یہ میٹھ سہلانا بھی اسی قسم سے ہے اشارے بعض وقت صرف ایک جنبش میں ہی پورا مفہوم (MEANING) ادا کر دیتے ہیں۔ تاہم چند مخصوص خیالات و مفاہیم کی ترسیل کو چھوڑ کر ان کا دائرہ کار محدود اور میدان تنگ ہے [2]

---

[1] سخنداں فارس ص [2] لسانی مطالعے ص ۲۱، ۲۲

تکلّم (CONVESATION)

انسان کے لئے اپنے خیالات کے اظہار کا دوسرا طریقہ تکلّم ہے۔ یعنی بات چیت، بول چال یا گفتگو جس کے ذریعہ ترسیل و ابلاغ کا کام بھی بحسن و خوبی انجام پاتا ہے تکلّم کے لئے صرف قوّتِ گویائی کافی ہے۔ تکلم، اشاری طریقہ سے زیادہ مؤثر اور دلنشین طریقہ ہے۔ تکلّم ایک نعمت عظمیٰ ہے اسی کی بدولت انسان تمام حیوانات سے اشرف و افضل ہے۔

اعضاء تکلّم اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے بے حد منفرد (SOLITARY) ہیں انھیں صوتی لب بھی کہا جاتا ہے ان سے نکلنے والی آوازوں کی نقل حیوانات سے ممکن نہیں۔

تکلّم کے لئے کسی مقررہ اصول باقاعدہ کی ضرورت نہیں نوزائیدہ بچہ جس طرح لاشعوری طور پہ سانس لینا شروع کر دیتا ہے بعض دفعہ بلا ارادہ بہت سی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جیسے بھوک، پیاس، تکلیف، سردی، اور گرمی کے اثر سے رونے لگتا ہے۔ درد میں چیخ اور خوشی میں ہنسی، حیرت و استعجاب میں بے ساختہ چیخنا وغیرہ، میں اعضاء صوتی کا پورا حصہ ہوتا ہے اسے تکلّم کی تعریف میں لایا تو جا سکتا ہے مگر زبان کے زُمرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ "صرف ارادی (INTENTATIVES) آوازیں ہی زبان کہلاتی ہیں"[1]

تحریر (DESCRIPTION)

خیالات کے اظہار کا تیسرا اور ترقی یافتہ طریقہ تحریر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان نے اپنے مفہوم کو دور دراز مقام پر کسی غیر موجود کو پہنچانے، انھیں محفوظ کرنے آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے اور ناقابل اشارہ و بیان محسوسات کو ظاہر کرنے کا مؤثر طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ تحریر انسان کی ترقی پسند طبیعت کا ثبوت اور انسانی تہذیب و شائستگی کا پہلا اور معتبر نقش ہے۔

نسانیات کے ماہرین بتلاتے ہیں کہ انسان نے سب سے پہلے تصویروں کے ذریعہ لکھنا شروع کیا۔ یہ فن بھی تدریجی ارتقائی عمل کے ذریعہ کمال تک پہنچ سکا ہے۔ کاغذ، پتھر، دھات، لکڑی، چمڑے

---

[1] ۔ لسانی مطالعے۔ صـ۲۲

یا کپڑے اور دیگر چیزوں پر رمزی علامتوں (CONCEALED) تصویروں، نقشوں، مبہم (CONCEALED) دائروں اور لکیروں کے ذریعہ کندہ کرکے، کھود کر، رنگ کرکے اپنی ضرورت پوری کرتا تھا۔ جنوبی فرانس اور دنیا کے دیگر مقامات پر دریافت شدہ خزف ریزے (EARTHEN VESSELS) اس کا ثبوت ہیں[1]

تحریر ایک فرضی چیز ہے ان آوازوں کے لئے جنھیں انسان ادا کرسکتا ہے نشانات مقرر کردیئے جاتے ہیں جو متفقہ اساس پر تسلیم کئے جاتے ہیں جیسے فلاں نشاں فلاں آواز کے لئے، فلاں علامت فلاں آواز کو ظاہر کرے گی۔ ایسے نشانات اصطلاح میں حروف ہجا یا حروف تہجی کہلاتے ہیں۔ انھیں پڑھنے سے انسان اُن آوازوں کا اعادہ کرتا ہے جن کے یہ مظہر ہیں۔ تحریر جذبات وخیالات کے اظہار کا وہ ذریعہ ہے جس کا تعلق قوت باصرہ سے ہے اور وہ ایک قائم رہنے والی چیز ہے[2]

لسانیات (LINGUISTICS)

اظہار خیال کے تین طریقوں میں زیادہ مؤثر، دلکش، مفید اور فطری طریقہ "تکلّم" ہے۔ زبان کا تعلق اسی سے ہے۔ زبان سے متعلق علم کو لسانیات سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ علم زبان کی پیدائش یا آغاز، تشکیل، نشوونما، حقیقت، کیفیت، ارتقاء اور خاتمہ سے متعلق بحث کرتا ہے۔

لسان، عربی کا لفظ اسم مفرد مونث ہے جس کے لغوی معنیٰ زبان یا بھاشا کے ہوں گے اور جمع کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوگا۔ خیالات کے اظہار کا وہ ذریعہ جو ملفوظ آوازوں کے ذریعہ کیا جائے اس کی تعریف ہوگی۔ اس طرح اس کا مفہوم وسیع تر ہوجائے گا نطق، بول چال، بات چیت، تکلّم، گفتگو، بولی، محاورہ، قول اور بیان اس کے مرادف ہیں۔

لسانیات:۔ لسان سے لسانی (LINGUAL) لسانی سے لسانیات منسوب ہے لسانیات عربی اسم جمع مؤنث سالم ہے یہ موضوع زبان سے متعلق جملہ امور کا احاطہ کرتا ہے انگریزی میں اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے بارے میں مباحث ومعلومات کا علم سمجھا جاتا ہے یہی مفہوم ہر جگہ لیا جاتا ہے۔

لسانیات ایک مستقل علم ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بے حد اہم بھی ہے اور وسیع بھی ہے۔

---

[1] ۔ زبان اور علم زبان ص ۲۵۶ [2] ۔ فن تحریر کی تاریخ ص ۳، ۴
پروفیسر عبدالقادر سروری

زمانہ قدیم میں ممکن ہے اس کا دائرہ تنگ ہو مگر علوم جدیدہ اور مختلف میدانوں میں تحقیقات کی بنا پر اس کی وسعت بڑھ گئی ہے زبانوں کی ساخت ان کی نوعیت اصوات اور ان کے تغیرات پر نیز ان میں کے ذریعہ بشریات (ANTHRO POLOGY) نفسیات، عمرانیات، تاریخ اور فلسفہ کے میدانوں میں کہاں تک نتائج اخذ کئے جا رہے ہیں۔ لسانیات تحقیق (RESEARCH) جستجو تفتیش اور قیاس پر مبنی علم ہے اس لحاظ سے اس کو ادب کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے اس میں ہر بات مدلل کی جاتی ہے بعض دفعہ مفروضات و قیاسات کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ یہ مفروضات کبھی کبھی ٹھوس اصلیت اور حقیقت تک پہنچا دیتے ہیں علمی و تاریخی انکشافات میں روشنی عطا کرتے ہیں۔

لسانیات کا تعلق انسانی زندگی، معاشرہ اور تہذیب سے ہے اس کا مقصد انسان کی ذہنیت کا مطالعہ ہے۔ تہذیبی ارتقاء کے سبب زبان میں کس طرح تغیرات رونما ہوئے، انسانی جماعت میں آپسی ربط و تعلق کے ضمن میں زبان کا کیا کردار (ROLE) رہا، زبانوں میں آپسی مماثلت ANALOGY کا تعین دریافت کرنا اور معاشرہ پر زبان کے اثرات وغیرہ موضوعات لسانیات کے دائرہ میں آتے ہیں۔

لسانیات کے فوائد کے بارے میں جان پیل کا خیال ہے کہ "اس علم سے انسان کے ذہن کی ساخت کے نئے زاویے اور بعض نامعلوم حقائق اور اسرار کے متعلق انکشافات ہوتے ہیں [1]"

ہر دور میں اس موضوع پر تحقیق انسانی دلچسپی کا باعث رہی ہے یونان روم اور اسکندریہ میں اس پر خاطر خواہ کام ہوا ہے۔ جدید دور میں فرانس، جرمنی، اور اٹلی میں اس جانب خاص توجہ دی گئی ہے ان تحقیقات کا موضوع یونانی اور لاطینی زبانوں کے ماخذ کی تلاش تھا۔

عام طور پر لسانیات کا دائرہ کار زبان کے ماخذ کی تلاش، الفاظ کی تشریحات (EXPLANATIONS) تقابلی جائزے تاریخی مطالعہ پر محیط ہوتا ہے اس لحاظ سے لسانیات کو مطالعاتی بنیاد پر اس طرح درجہ بند

لسانیات کے شعبے

- توضیحی لسانیات
  - صوتیات
  - ارتقائی اصوات
  - صوت تجزیہ
  - تشکیلیات
  - معنیات
- نحو

---

[1] ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر نور ناشر نسیم بکڈپو

کیا جاسکتا ہے۔

توضیحی لسانیات DESCRIPTIVE LINGUISTICS ..... تاریخی لسانیات / تقابلی لسانیات

زبان کا ہیولا، اس کے اجزا و ترکیبی اور ان کے باہمی تعلق کا مطالعہ، زبانوں کی اندرونی ساخت پر غور و خوض اور تکلم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے و نیز صوری حیثیت سے زبان کا تجزیہ اور اس کی توضیح اس کے مطالعہ کا بڑا مقصد ہوتا ہے۔ لسانی ساختوں کے تنوع میں اضافہ کے باعث تدریس زبان کے نئے منصوبوں میں توضیحی لسانیات کا عمل دخل لازم ہوگیا ہے[1] لسانیات کی اکثر شاخیں اس سے مربوط ہیں۔

صوتیات (PHONETICS) زبان کی آوازوں یا اصوات، ان کی پیدائش ان کی ترسیل اور ان کے سنائی دینے کے جملہ وسائل پر غور و خوض ہوتا ہے اس میں ایک یا تمام زبانوں کی صوتیات پر بحث کی جاتی ہے۔

ارتقائی اصوات (PHONOLOGY) منفرد زبانوں کی اصوات یا ایک خاندان کی مختلف بولیوں، زبان کے ارتقاء کے مختلف عہدوں میں اصوات اور ان کے ارتقاء کے بارے میں تفصیلی سے بحث کی جاتی ہے۔

صوت تجزیہ (PHONEMIC) منفرد زبانوں کی اصوات کو مشترک خصوصیات کی بنیاد پر مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے انھیں حدود میں لانے کے علاوہ اصوات کے نازک ترین اختلافات دور کرکے انھیں کثرت سے وحدت میں لانا اس کا کام ہے

تشکیلیات (MORPHOLOGY) الفاظ کی ساخت کے علاوہ مادوں کے ساتھ سابقوں اور لاحقوں کو جوڑ کر مشتقات کی تشکیل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ قواعد کے لحاظ سے یہ علم صرف کی تعریف میں آتا ہے۔

نحو (SYNTAX) اس کا تعلق بولوں کی ساخت سے ہوتا ہے جس کے بغیر کسی زبان کی نوعیت کا اندازہ مشکل ہے۔

معنیات (SEMENTICS) اس میں لفظوں کے معانی، ان کے تعلق اور تبدیلیوں سے بحث ہوتی ہے[1]

تقابلی لسانیات (COMPARATIVE LINGUISTICS) اس کا گہرا تعلق تاریخی لسانیات سے ہے اس میں ایک ہی خاندان کی زبانوں کا تقابلی طریقہ سے مطالعہ کیا جاتا ہے، ان میں مماثلت اللفظ لازمی ہے[1]

ابتدائی آثار سے ارتقاء کے مدارج کا تعین کیا جاتا ہے اس میں مفروضات کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔

تاریخی لسانیات (HISTORICAL LINGUISTICS) اس کی بنیاد توضیحی لسانیات پر ہے کیوں کہ جب تک کسی زبان کا تجزیاتی اور توضیحی مطالعہ نہیں کر لیا جاتا، اس کے ارتقاء کی تاریخ پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس میں زبان کے مختلف مراحلِ ارتقاء سے بحث کی جاتی ہے۔

زبان (LANGUAGE)

زبان خدا کی عطا کردہ ایک عظیم نعمت ہے جو حیوانات کے مقابل انسان کے لئے برتری فضیلت اور امتیاز کا باعث ہے اسی زبان کی وجہ سے آدمی حیوان ناطق اور دیگر جانور بے زبان کہلاتے ہیں زبان سماج اور تہذیب کی شیرازہ بندی کا ذریعہ ہے انسان کے خیالات اور احساسات کے ترجمان تین ہیں اشارہ، تکلم، تحریر۔ زبان کا تعلق دوسرے ذریعہ اظہار یعنی تکلم سے ہے۔

اصطلاح میں زبان وہ مخصوص آوازیں ہیں جو انسان بالقصد نکالتا ہے جن کے ذریعہ اپنا ذہنی مفہوم واضح کرتا ہے مشہور ماہر لسانیات ہنری سوئٹ کا بھی یہی خیال ہے۔ "تکلم کے سبب جو آوازیں نکلتی ہیں اور جن سے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے وہی زبان ہے" ہر قسم کا شور جو صوتی آلات سے پیدا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی زبان میں بامعنی و بامقصد ہوتا ہے، زبان کے معنی جب خیالات کی ترجمانی کے لئے جائیں گے تو اشارے اور تحریر بھی اسی میں شامل ہوں گے لیکن صرف قوتِ گویائی یا تکلم کے ساتھ زبان کا مفہوم سمجھا جائے گا تو اس کا دائرہ صرف ملفوظ آوازوں کی حد تک محدود ہو جائے گا جو انسان بالارادہ ادا کرتا ہے اور جب چاہے انھیں بار بار دہرا سکتا ہے۔ معنیہ معنیٰ میں یہ آوازیں اپنا مفہوم بدلا نہیں کرتیں۔

زبان کی ابتدا COMMENCEMENT OF LANGUAGES

زبان کی ابتداء کے بارے میں مختلف خیال پائے جاتے ہیں۔ آج تک کسی ایک نظریہ پہ ماہرین لسانیات کا اتفاق نہ ہو سکا۔ چند مشہور نظریے پیش ہیں۔

الوہی نظریہ (DIVINITY THEORY) زبان کے آغاز کے بارے میں سب سے قدیم خیال یہ ہے کہ یہ خدا کی دین اور الہامی عطیہ ہے مذاہب اس ضمن میں متفق الرائے ہیں۔

آریہ مذہب = سنسکرت کو دیو بھاشا کہتا ہے۔

بدھ مت = پالی پراکرت کی قدامت پر اصرار کرتا ہے اور اسے آسمانی زبان کا درجہ دیتا ہے۔

یہودیت = عبرانی کو قدیم ترین زبان قرار دیتی ہے اس کو خدا کی خطا سے تعبیر کرتی ہے۔

مسیحیت = عیسائی مذہب کے مطابق ابتداء میں محض ایک زبان تھی۔ بعد میں مختلف زبانیں دراصل خدائی عتاب کا نتیجہ ہیں تاکہ انسان ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ سکیں۔ وہ بھی عبرانی کی قدامت کا تصور رکھتے ہیں۔

اسلام = قرآن مجید کے مطابق خدا نے حضرت آدم کو اشیاء کے نام سکھائے۔ قرآن، کلام الٰہی ہے اسی وجہ سے عربی آسمانی زبان قرار پاتی ہے۔

جین مت = اردھ ماگدھی پراکرت کو انسان وحیوان کی ازلی زبان مانتا ہے[1]

فردی نظریہ (PERSONAL THEORY) مذاہب کے علاوہ بعض افراد نے بھی اپنی زبانوں کو ازلی قرار دیا ہے۔ دلندیزی عالم بے کانس نے ڈچ زبان کو، بعض نے گوتھی (قدیم جرمن) کو۔

فطری نظریہ (NATURAL THEORY)

---

[1] لسانی مطالعے ص ۳۲

نظریات زبان کی ابتدا کے بارے میں

- الوہی نظریہ
- فردی نظریہ
- فطری نظریہ
  - صوت تقلیدی نظریہ
  - جھنکار نظریہ
  - مادوں کا نظریہ
  - نجائی نظریہ
    - محنت کے نعرہ کا نظریہ

یہ نظریہ فنیا غورث، ہیڈاکرلٹس (۴۸۰ ق م) اور افلاطون (۳۴۷ ق م) کا ہے۔ فطرت نے کسی جبلّی ضرورت کے تحت زبان کو جنم دیا چنانچہ اشیاء اور ان کے ناموں میں کوئی فطری تعلق ہوتا ہے۔

صوت تقلیدی نظریہ (ONOMATOPOEIC - THEORY) انسان نے کتّے، بلّی، بکری، کوّے، کوئل وغیرہ کی آوازوں کی نقل کر کے الفاظ کی تخلیق کی۔ جیسے بھوں بھوں سے بھونکنا، گو سے (CUCKOLD) اور کک سے (COQUET) وغیرہ۔ بچّے جانوروں کو اس آواز سے موسوم کر دیتے ہیں جو ان سے سنتے ہیں میاؤں (بلی) میں، میں (بکری) پوں، چوں (چڑیا) وغیرہ اس نظریہ کو اسی وجہ سے صوت تقلیدی نظریہ کہا جاتا ہے [1]

جھنکار نظریہ (PATHOGENIC THEORY) جانوروں کی آوازوں کی نقل کی طرح مختلف مظاہر فطرت اور چیزوں کے ٹکرانے کے سبب پیدا ہونے والی گونج جھنکار وغیرہ کی نقل سے جو آوازیں ملفوظ ہوئیں وہ زبان کے آغاز کا سبب بنیں

مادّوں کا نظریہ (DING DONG THEORY) جب آدمی کسی شئے کی جھنکار سنتا ہے اس کی صدائے بازگشت کے طور پر خود اس کے منہ سے ویسی ہی کوئی آواز نکل جاتی ہے۔ مثلاً دھات پر چوٹ پڑنے سے ٹن لکڑی پر ضرب پڑنے سے کھٹ کی آواز۔ شاید اس کے زیر اثر زبان کا استخراج ہوا ہو کیوں کہ یہ آوازیں ہی مادّہ ہیں ابتداء میں آوازیں بہت تھیں بعد میں گھٹتی گئیں اس نظریہ کی بنا یہ ہے کہ صوت اور اس کے مفہوم میں ایک خاص اور پوشیدہ تعلق موجود ہوتا ہے۔

فجائی نظریہ (INPERJECTIONAL THEORY) مختلف مشاہدات سے مختلف جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں انھیں جب موزوں آوازوں میں ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ اسی طرح کے جذبات کی ترجمانی کے لئے مختص ہو جاتے ہیں جیسے ہائے، اف، تف وغیرہ اسے پوہ پوہ نظریہ بھی کہا جاتا ہے

محنت کے نعرہ کا نظریہ (YO HE YO THEORY) اس نظریہ کو نوائرے (NOIRE) نے پیش کیا۔ سخت محنت کے زیر اثر ہانپنے سے جو آواز نکلتی ہے یا اجتماعی مشقت کے وقت جو آوازیں لگائی جاتی ہیں وہ آغاز زبان کا سبب بنیں۔ یورپی ملاح لنگر کھینچتے وقت "یہ ہے یو" اور ہندوستانی مزدور اور ملاح ہیو یا ہائی سو یا بیا ہیا کی صدا لگاتے ہیں۔ ڈارون کے مطابق انسان کے آلات نطق محنت کے

---

[1] زبان اور علم زبان صفحہ ۲

وقت حرکات جسم کی نقل کرتے ہیں تو کچھ آوازیں پیدا ہوتی ہیں انھیں آوازوں نے زبان کو جنم دیا[1] مشہور محقق پروفیسر عبدالقادر سہوری نے زبان اور علم زبان میں ڈاکٹر گیان چند صاحب نے اپنی تالیف لسانی مطالعے میں اس بارے میں بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور زبان کے آغاز کے ضمن میں مندرجہ بالا نظریات کے علاوہ اور بہت سے نظریات پیش کئے ہیں جو یقیناً بے حد بصیرت افروز ہیں۔ "زبان کا جنم لینا کیا ہے؟ حالات وظروف کے مطابق بدل بدل کر نیا روپ اختیار کرنا ہے"[2]

زبان کے آغاز کے بارے میں ان توجیہات کے باوجود کسی ایک خیال پر ماہرین کا عدم اتفاق محض قیاسات کے سبب سے ہے۔ کسی ایک نظریہ پر متفق بھی کس طرح ہوں جب کہ خود انسان کی ابتدا و نشوونما کی تفصیلات اور ماقبل تاریخ واقعات آج تک بھی پوری طرح احاطہ تحقیق میں نہیں آسکے ہیں۔ دوسری بڑی وجہ مسلسل تغیرات کا فطری قانون ہے لہٰذا ایسے میں محض مفروضات کی بنیاد پر بعض باتوں کو مانتے ہوئے آگے بڑھنا مجبوری ہے۔

مختلف انسانی نسلوں میں الگ الگ زبانوں کا وجود اور ان کی متنوع خصوصیات نے "دنیا کی تمام زبانوں کے ایک ہی منبع" کے نظریہ کو پیچیدہ بنا رکھا ہے۔ اس ضمن میں ایک بات قابل توجہ ہے کہ مختلف انسانوں میں چوں کہ ایک ہی فطرت کارفرما ہے بہ حیثیت انسان ان میں بعض مشترک خصوصیات نمایاں ہیں ونیز اس حقیقت کو بھی عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ تمام انسانی نسلیں ایک ہی فرد کی اولاد ہیں جو رفتہ رفتہ پھیلتے گئے اور علحدہ علحدہ نسلوں، گروہوں، قبیلوں اور خاندانوں میں بٹتے گئے ہیں تو ہمیں یہ باور کرنے میں کچھ مانع نہیں کہ دنیا کی جملہ زبانیں ہیں یا ان کے گروہ اور خاندان ہیں باوجود لسانیاتی خصوصیات میں زمین و آسمان کے فرق کے ایک ہی منبع زبان سے تعلق رکھتی ہیں۔

زبان کی ابتدا کے بارے میں تحقیق بشریات، عمرانیات (SOCIALOGY) اور تاریخ وغیرہ کے میدانوں میں بے حد اہم اور کارآمد ہوتی ہے بہرحال زبان انسان کا اہم ترین تخلیقی کارنامہ ہے اس نے محض بے ہنگم آوازوں کو بامعنی بنایا۔ کلمات کو خیالات اور اشیاء کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ زبان جذبات، احساسات، تجربات و مشاہدات کے تبادلہ اور اعمال و حرکات کی راہیں متعین کرتی ہے۔

---

[1] لسانی مطالعے بحوالہ زبان اور علم زبان [2] اور لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری

زبان کا ارتقاء EVOLUTION OF LANGUAGE

زبان کا ارتقاء کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح ایک منظّم اور مرتّب اصول کے زیر اثر ہوتا ہے۔ جو انسانی خیالات میں لمحہ لمحہ ترقی پذیر تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے خیال میں زبان برابر اولتی بدلتی اور حالات کے مطابق نت نئے روپ دھارتی رہتی ہے۔ "زبانوں کی خرادپر زبان ترشتی تراشتی، چھلتی چھلاتی اور کٹ کٹا کر سڈول بنتی رہے گی۔ ردّوبدل زبان کی زندگی ہے اور یہی اس کا ارتقاء ہے اس لئے زبان کا ارتقاء اس کی زندگی ہے"[1]

زبان کے ارتقاء کے اسباب

- طبعی اسباب
- نسلی محرکات
- ذہنی عوامل
- مذہبی وجوہات
- علوم وفنون کا حصّہ

انسانی زندگی ابتداء میں سادگی سے عبارت اور تکلّفات سے عاری تھی لیکن آہستہ آہستہ تہذیب وشائستگی کے دائروں نے تکلّفات اور بناوٹ کو راہ دی۔ زبان کا تعلق زندگی حقیقتوں سے بہت گہرا ہے جب زندگی تکلّفات کا شکار ہونے لگی تو زبان بھی سادگی فضاء سے نکل کر تصنّع (HYPOCRISY) اور بناوٹ کے حلقوں میں محصور ہوتی گئی اس کے اثرات اصوات، الفاظ، قواعد، اشکال جملوں کی ساخت، تراکیب الفاظ کے مفاہم، معانی غرض ہر شعبۂ زبان میں رونما ہونے لگے[2]

کسی بھی زبان کے ارتقائی مدارج سمجھنے کے لئے ہمیں چار پانچ سو سال پرانے روپ کو سامنے رکھ کر آج کل کی مروّجہ زبان سے تقابل کرنا پڑے گا۔ زبان کے ارتقائی عمل میں کئی اسباب کارفرما ہوتے ہیں جنھیں جانے بغیر یہ انسانی لسانی تغیّرات اور زبان کے ارتقاء کی کیفیت سمجھنی مشکل ہے

طبعی اسباب (NATURAL CAUSES) دنیا کے مختلف مقامات کے طبعی حالات یکساں نہیں ہوتے۔ کہیں زیادہ سردی ہوتی ہے تو کہیں گرمی، کہیں زیادہ بارش ہوتی ہے تو کہیں برسوں بارش نہیں ہوتی، کہیں موسم سخت ناقابل برداشت تو کہیں بے حد خوشگوار اسی طرح کہیں پہاڑیاں ہیں تو کہیں وادیاں، کہیں ریگستان ہیں تو کہیں نخلستان اور کہیں جزیرے ہیں تو کہیں ساحلی سلسلے۔ ان حالات کا انسان کی زندگی، معاشرت، عادات واطوار مزاج وکردار اور تہذیب سے گہرا تعلق

---

[1] اردو لسانیات ص ۱۵ [2] بحوالہ زبان وعلم زبان

ہوتا ہے۔ جس کا لازمی اثر اس کی زبان بھی قبول کرتی ہے۔

نسلی محرکات (ETHNOLOGICAL REASONS) دو مختلف انسانی نسلوں کے درمیان جب مصاہرت قائم ہوتی ہے تو ان کی زبانیں ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں۔ الفاظ اور لہجہ کا تبادلہ ہوتا ہے اس کے زیر اثر بعض وقت نئی زبان جنم لیتی ہے۔

ذہنی عوامل (ACUTELY ACTIONS) فرد یا قوم کے ذہنی میلان کا زبان سے غیر محسوس لیکن گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کی عہد بہ عہد تاریخ کے مطالعے سے اس کے بولنے والوں کے ذہنی و فکری مزاج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ذہنی میلانات زبان کے ارتقاء میں بھرپور اور اہم حصہ لیتے ہیں ہر دو طریقہ سے اس کا مطالعہ ممکن ہے یعنی زبان کے مطالعہ کے واسطہ سے اس کے بولنے والوں کے ذہنی میلان کا اور اس کی ذہنیت کے ذریعہ اس کی زبان کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔

مذہبی وجوہات (RELIGIOUS CAUSES) زبان کے ارتقاء میں مذہب کے اہم کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب زندگی کے تمام شعبوں اور انسانی تہذیب سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ مذہبی تحریریں ہر زمانے میں معیار رہی ہیں اس سے ہمیشہ زبان و ادب متاثر ہوتے رہے ہیں۔ جدید مزاج میں مذہبی ادب کو کلاسیکل سرمایے کے الفاظ سے بہت اعتبار حاصل ہے لیکن اس سے ارتقاء پر اثر بھی پڑ جاتا ہے۔

علم و فنون کا حصہ (CONTRIBUTION OF ARTS & SCIENCE)

زبان کی ترقی میں مختلف علوم و فنون کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ تحقیقات اور علم کی اشاعت کے ضمن میں جو سرگرمیاں ہوتی ہیں ان کا بالراست اثر زبان پر مرتب ہوتا ہے نئی نئی اصطلاحات نئی نئی ترکیبیں عالم وجود میں آتی ہیں جو زبان کی ترقی کا باعث بنتی ہیں۔ علوم و فنون کی نت نئی ترقیوں کے ساتھ زبان کی ترقی وابستہ ہوتی ہے۔

قانون فطرت کے اٹل اصول کے تحت کوئی چیز ہمیشہ ایک حالت میں باقی نہیں رہتی تو زبان کسی طرح اس دائرے سے باہر ہو سکتی ہے زبان جو ماضی کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے مستقبل میں بھی اس میں تغیر و ترقی کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم فرماتے ہیں۔ زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے۔ (۱) قوم کا استقلال (۲) سلطنت کا اقبال

(۳) اس کا مذہب (۴) تعلیم و تہذیب۔ اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں پر قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہوں گے اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ مر جائے گی۔ مرنا اس کا یہی ہے کہ خواص و عوام کی زبانیں اس کے بولنے اور قلم اس کے لکھنے سے منہ پھیر لیں۔ یعنی کہیں نہ بولی جائے۔ نہ اس میں تالیف و تصنیف کا رواج رہے۔ [1]

زبان اور خیال کا ایک دوسرے سے اٹوٹ رشتہ ہے خیال کے بغیر زبان کا کام کچھ نہیں۔ جب انسان کے ذہن میں خیال پیدا ہوتا ہے تب اس کے اظہار کے لئے زبان کی ضرورت پڑتی ہے جب خیالات میں ترقی اور تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہے تو زبان پر بھی اس کا اثر مرتب ہوتا ہے۔

صوت SOUND

ہر زبان صوتی ہوتی ہے انسان کو اپنا مافی الضمیر (INTENTION) ادا کرنے کے لئے اس کا وسیلہ لینا پڑتا ہے ہر انسان کے جسم کے بالائی حصہ میں اعضاء تکلّم ہوتے ہیں۔ صوت یا آواز عضوی فعلیات کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر زبان کا تصوّر محال ہے ہر زبان میں مخصوص اور محدود اصوات کا استعمال ہوتا ہے لسانیات میں صوتیات کے مطالعہ کی بڑی اہمیت ہے اس میں آواز کی ترسیل کے اسباب اور سننے کے مسائل پر توجہ دی جاتی ہے۔ انسان کے مختلف اعضاء جیسے پھیپھڑے، حلق، منہ، ناک اور کان اس میں یعنی بولنے سننے میں اپنا، اپنا حصہ ادا کرتے ہیں طب کے شعبہ علم الاعضاء (PHYSIOLOGY) کے خطوط پر لسانیات میں ان پر بحث کی جاتی ہے۔

جتنی اصوات جس زبان میں مستعمل ہوں وہ اسی زبان سے متعلق ہو جاتی ہیں ہر زبان کے اصوات بھی تغیّر پذیر ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں کسی بھی زبان کی صوتی خصوصیات یکساں رہیں لازمی نہیں ان کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ کان اصوات کو حدوں میں لاکر پابند کرتے ہیں ہم بیک وقت کئی آوازیں سنتے ہیں لیکن ہمارے کان ان اصوات کو ان کے مفاہیم کے ساتھ بہت تھوڑی مقدار میں قبول کرتے ہیں جن سے ہماری واقفیت ہوتی ہے ہمارے کانوں تک یوں تو بہت سی آوازیں پہنچتی ہیں مگر ہر آواز ہمارے فہم و ادراک کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی۔

---

[1] ۔ سخندان فارس ص ۲۷

لفظ (WORD)

ملفوظ آوازوں کا نام زبان ہے آواز خاص معنوی علامت کے طور پر لفظ میں ڈھلتی ہے اس طرح کی کئی آوازیں، ایک زبان کی صورت میں منضبط ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں ہر آواز اپنا ایک مفہوم ایک شناخت اور ایک علامت رکھتی ہے۔ آواز میں تغیّر و تبدّل کی راہیں بھی طے کرتی ہیں۔ ان کے معنی کبھی کبھی جگہ چھوڑ بھی دیتے ہیں تاہم کسی بھی زبان کا سارا دارومدار ملفوظ آوازوں ہی پر ہوتا ہے گویا "الفاظ بامعنی آوازیں ہیں۔ چرند اور پرند بھی ایسی آوازیں نکال سکتے ہیں جن کے معنی ہوتے ہیں وہ خوف ظاہر کرتے ہیں۔ خوشی اور خواہش بھی ظاہر کر سکتے ہیں مگر اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتے۔ جانداروں میں ایک انسان ہی ہے جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے اس کو بیان بھی کر سکتا ہے۔ زبان وہ چیز ہے جس پر تمام انسانی تعلقات قائم ہیں۔ یہ الفاظ سے بنتی ہے اور الفاظ سانچے ہیں جن میں خیالات ڈھلتے ہیں۔ چنانچہ ہر لفظ جو کسی چیز کے لئے بنتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی خیال لپٹا ہوتا ہے[1]

لفظ کی پیدائش چاہے جس طریقہ پر ہو ہر حال میں انسان کا ذہن اور قوت متخیلہ ضرور کارفرما ہوتی ہے۔ انسانی ذہن سوچ بچار غور و فکر کا مرکز ہے ہر پل یہ مصروف رہتا ہے کوئی بھی شئے جسے وہ دیکھتا محسوس کرتا ہے اس کا ذہن اس کا عکس اتارتا ہے پھر اس کے لئے کوئی مناسب سا نام تجویز کرتا ہے جب وہ نام اعضاء (SPEECH ORGANS) تکلّم کے ذریعہ آواز کے روپ میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو گویا لفظ کی صورت گری ہو جاتی ہے یہ بامعنی آواز اس شئے سے متعلق مخصوص ہو جاتی ہے اور "لفظ" کے طور پر اپنا وجود منوا لیتی ہے گویا لفظ تصور و تخیّل کی وہ تصویر ہے جو صوتی روپ میں متشکل ہوتی ہے اس میں ذہنی اُپج اور تکلّمی عضلات کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے الفاظ میں "صاحب زبان اپنے ماضی الضمیر اور حرکت اعضاء کے مجموعہ کو آواز کے رنگ میں کانوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ پہلے کچھ اشارے تھے۔ پھر کچھ آوازیں پھر باہمی اتفاق سے کچھ الفاظ آپس کے سمجھنے سمجھانے کے لئے مقرر ہو گئے پس جب آفرینش بڑھے اور

---

[1] الفاظ کا مزاج ص ۱۵ از غلام یزدانی

آبادی پھیلے، تب بھی واجب ہے کہ وہی الفاظ کام میں لائیں کہ سب کی سمجھ میں آئیں"[1] الفاظ ظاہر میں ہوائی جنبش ہیں لیکن حقیقت میں مستقبل چیزیں ہیں تم ضرور پوچھو گے کہ الفاظ مستقل چیزیں کیوں کر ہو سکتے ہیں کہ جب تمہیں کوئی چیز چاکو یا قلم درکار ہوتا ہے۔ اگر ایک لڑکے سے بھی کہتے ہو تو فوراً اٹھا لاتا ہے دور ہو یا پاس حالاں کہ تم نے فقط لفظ کہا تھا۔ چاکو یا قلم کی تصویر بنا کر نہیں دی تھی۔ دیکھو لفظ نے اُس کے دل پر اصل شئے کا کام دیا[2]۔

"زبان مفروضہ صوتی علامات کا مجموعہ ہے یعنی ان مفرد آوازوں کی ترکیب سے جنھیں انسان اپنے منہ سے نکال سکتا ہے ہزاروں مرکب آوازیں یا الفاظ بن سکتے ہیں۔ یہ آوازیں مختلف چیزوں کے لئے بطور نام کے استعمال کی جاتی ہیں منشاء یہ ہوتا ہے کہ انسانی حافظہ پر اس چیز کی تصویر کو چشم تصور کے سامنے پیش کر دے جس کا نام لیا جائے مثلاً جب ہم قلم (PEN) کہتے ہیں تو ہمارے دماغ میں قلم کی تصویر آتی ہے۔ پنسل کی نہیں۔ پنسل (PENCIL) کی تصویر اسی وقت سامنے آتی ہے جب ہم پنسل کہتے ہیں گویا الفاظ انسان کے دماغ میں مختلف چیزوں کی تصویریں پیش کرنے کے ذرائع ہیں الفاظ کی کثرت استعمال سے یہ تصویریں تحت الشعور میں چلی جاتی ہیں اور دماغ کو بروقت تصویر کشی نہیں کرنی پڑتی"[3]

الفاظ ہی پر گفتگو کا اختصار اور خیالات کی ترجمانی (INTERPRET) کا دارومدار ہوتا ہے۔ الفاظ وہ علامتی آوازیں ہیں جنھیں باہمی سمجھوتے سے مان لیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کرنے والے کچھ نہ سمجھ پائیں گے۔ محض چیخ پکار شور شرابا کو الفاظ یا زبان نہیں کہا جا سکتا غموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی بھی چیز کے لئے جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ پہلے کسی نہ کسی ہم شکل و ہم مزاج شئے کے لئے استعمال کئے گئے لفظ کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ فعل اس واقعہ کا نتیجہ ہے کہ انسان دماغ میں اس شئے کو دیکھنے کے بعد گذشتہ کی ایک ایسی شکل منعکس ہو جاتی ہے جس کو اس نے کچھ نہ کچھ نام دے رکھا تھا۔ اور اس انعکاس کے ساتھ ہی اس کے متعلق کوئی بھی لفظ ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے جو اس ابتدائی نام سے زیادہ دور نہیں ہوتا۔ فارسی اور اردو الفاظ "نے" اور "بانسلی" جو ایک خاص آلۂ موسیقی کے نام ہیں اس نباتی اشتراک اصلیت کا نتیجہ

[1، 2] سخندان فارس ص ۱۲، ۱۵، ۱۶ [3] فن تحریر کی تاریخ ص ۳

ہیں جو جنگل کی "نے" اور "بانس" کے ساتھ مخصوص اصطلاحوں کو حاصل ہے [1]

ہر آواز اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ آوازوں کے ان بامعنی اور بے معنی جوڑوں کو جب متشکل کیا جاتا ہے تو الفاظ ڈھلنے لگتے ہیں۔ یہ زبان کی لفظی تعمیر میں آوزوں کا بنیادی کردار ہوتا ہے چوں کہ الفاظ آوازوں سے ترکیب پاتے ہیں اور آوازیں مختلف ہیں لہٰذا الفاظ میں اختلاف یا تعدّد مختلف آوازوں کی وجہ سے ہے آواز درحقیقت حرف کی صورت پاتی ہے یہ حروف جب ہجے میں ترکیب پاتے ہیں تو لفظ متشکل ہوتا ہے گویا لفظ کئی آوازوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

- بامعنی
  - مستقل کلمہ
  - غیر مستقل کلمہ
- بے معنی

انسانی آلاتِ صوت لامتناہی آوازیں پیدا کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ تکلّم نظام تنفّس کا ایک اتفاقی عمل ہے اس کی بنیادی توانائی سینہ سے پیدا ہوتی ہے یہاں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ الفاظ کی تخلیق اور اُپج میں دماغ ہی کا نہیں بلکہ دیگر اعضائے جسمانی کا بھی اہم ترین حصّہ ہوتا ہے۔

لفظ کی تشکیل (FORMATION OF WORD)

وہ بامعنی آواز جو اعضاءِ تکلّم کے ذریعہ قصداً (DELIBERATELY) نکالی جائے اصطلاح میں لفظ کہلاتی ہے کائنات کے مظاہر اور اشیاء کے مشاہدہ سے انسان اپنے ذہن میں ان کے متعلق جو نام تجویز کرتا ہے۔ اسے صوتی شکل میں ڈھالتا ہے تو لفظ کی پیدائش ہوتی ہے اور یہی ملفوظ آواز اس شئے سے مستقل طور پہ وابستہ ہو جاتی ہے اب کبھی اس شئے کا تصور یا ذکر کیا جائے گا تو وہی مخصوص ملفوظ آواز اس کے لئے نکالی جائے گی۔ لفظ کے متعلق یوں بھی تشریح کی جاسکتی ہے کہ وہ ملفوظ آواز جو کسی خاص تصور کو پیش کرے" لفظ ہے

الفاظ کی تشکیل تدریجی (GRADUALLY) طور پر عمل میں آتی ہے۔ قوتِ

---

[1] ہندوستانی لسانیات ص ۲۹

گویائی ایک عظیم نعمت ہے۔ پیدا ہونے والا بچہ بھی اس دولت سے اگرچہ کہ بہرہ مند ہوتا ہے اور لاشعوری طور پر اس سے استفادہ بھی کرتا ہے سردی، گرمی، بھوک، پیاس، درد و تکلیف کے احساس کے اظہار کے لئے بچہ روتا ہے اس کے رونے کے سبب جو آوازیں نکلتی ہیں اگرچہ انھیں الفاظ یا باقاعدہ زبان کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا تاہم وہ اپنا مدعا و مفہوم اس واسطہ سے دوسروں تک پہنچا دیتا ہے رونا فطری امر ہے یہ لاشعوری طور پر بعض دفعہ شعوری طور پر مفہوم کی ادائیگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔ یہ تو خیر ایک اضافی بات تھی دراصل کوئی بھی بچہ پیدا ہوتے ہی بات چیت کرنا نہیں سیکھ جاتا بلکہ بتدریج وہ اس لائق ہوتا ہے بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اس کا ماحول اسے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے قوت گویائی کے استعمال کے طریقے سکھاتا ہے۔

فطری طور پر انسان تقلید پسند (IMITATIVE) واقع ہوا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اس کی نقل کرتا ہے بچہ کو جب مختلف اصوات خاص انداز سے سننے کو ملتے ہیں تو اس کے حواس باطنی متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس کا ذہن ان آوازوں کی تصویریں بنانے لگتا ہے پھر رفتہ رفتہ وہ ان صوتی تصویروں کو تکلم کے ذریعہ لفظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ابتداء میں اسے کافی محنت کرنی پڑتی ہے بار بار کسی خاص ملفوظ آواز کو سنتے رہتے اور پھر ان کی مسلسل نقل کرنے کی بنا پر وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان آوازوں کی ہو بہو نقل کر سکے۔ اس طرح اس میں یہ صلاحیت بڑھتی جاتی ہے تقلید کی ان منزلوں میں اس کا حافظہ حس کا حواس باطنی سے تعلق ہے، اپنا کام پوری تندہی کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔ بچہ نے جو کچھ سنا اور سننے سے جو تصویریں ذہن نے بنائی انھیں حافظہ محفوظ کرتا جاتا ہے اور جب بھی ضرورت ہو، وہی ذہنی تصویر صوتی روپ میں اعضاء تکلم کے ذریعہ ترسیل کرتا ہے۔

الفاظ کی تشکیل کے فطری طریقے بالعموم یکساں ہوتے ہیں لفظ کی بناوٹ میں انسانی ارادہ اور ذہنی کاوش کا اہم حصہ ہوتا ہے البتہ بعد میں لفظ کی صوتی شکل اور ہیئت میں تغیر ممکن ہے کیوں کہ اس کا براہ راست تعلق سننے اور ادا کرنے کے مسلسل عمل اور برتاؤ کے ڈھنگ سے ہوتا ہے جیسے کسی خاص شئے کے لئے انسان کا وضع کردہ لفظ جب کوئی سنتا ہے اور پھر اسے دہراتا ہے تو ادائیگی کے وقت اگر ٹھیک ڈھنگ نہ ہو تو پھر وہ لفظ اپنی شکل بدلتا جاتا ہے اگر بار بار وہ لفظ صحیح ڈھنگ سے ادا نہ ہو تو کچھ عرصہ بعد اس کی صوتی شکل تبدیل ہو جائے گی۔ نتیجتاً ایک لفظ کی

جگہ اس سے ملتا جلتا لفظ استعمال میں آئے گا۔ زبانوں کی ترقی میں اس صورت حال کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں صوتی انحراف (DEFORMATION) کہا جاتا ہے یہ انحراف کبھی انفرادی طور پر اور کبھی اجتماعی طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سبب کے علاوہ صوتی انحراف کی اور بھی کئی صورتیں ہیں یہ صوتی تبدیلیاں الفاظ کی تشکیل اور زبانوں کی تقسیم کے ضمن میں بنیادی اثر ڈالتے ہیں۔ صوتی تبدیلیاں بعض وقت غیر منظم اور بعض دفعہ منظم اور مرتب طریقہ سے عمل میں آتی ہیں۔

الفاظ کی پیدائش کے متعلق اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ لفظ وہ بامعنی آواز ہے جو کسی خاص تصور کو پیش کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی لازمی نہیں کہ وہ جس خیال کو پیش کرتا ہے ہمیشہ صرف اسی مفہوم کو ادا کرے اور مخصوص تصور کے ساتھ جڑا رہے بلکہ ضرورت ماحول اور موقع کے لحاظ سے یا پھر اپنے ساتھ کسی اور لفظ کے متصل ہو جانے کی بنا پر اپنے معنی و مفہوم کو بدلتا بھی ہے۔

الفاظ کی تخلیق کے کئی اسباب ہیں بعض وقت کسی بھی چیز کے متعلق مخصوص لفظ محض مشابہت اور خاصیت کی یکسانی کی بنیاد پر ملتے جلتے دوسرے لفظ کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔ کبھی کسی شئے کے موجد (INVENTOR) کے نام کی نسبت کی وجہ سے کبھی خاص مقام سے تعلق کے سبب سے کبھی عادات و مزاج کی بنیاد پر، کبھی نسلی اور جدی نسبت کی بناء پر اور کبھی مخصوص علاقوں کے سبب سے افراد اور اشیاء نام پاتے ہیں [1]۔

بعض دفعہ ایک ہی لفظ مختلف حالات میں الگ الگ مفہوم دیتا ہے اُردو کا ایک فعل ہے "اٹھانا" اس میں کتنے پوشیدہ مفاہیم ہیں جو موقع و محل کے اعتبار سے ہر جگہ الگ مفہوم ادا کرتا ہے مثلاً وزن اٹھانا، پتھر اٹھانا، جوتا اٹھانا، آواز اٹھانا، دل اٹھانا، چھت سر پہ اٹھانا، سایہ اٹھانا، سامان اٹھانا، بار اٹھانا، مصیبت اٹھانا وغیرہ ایسا بالعموم ماحول کی تبدیلی، خیال کی تبدیلی اور گفتگو کی سہولت کی بناء پر ہوتا ہے۔

لفظ کی قسمیں (SORTS OF WORD)

الفاظ بنیادی طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) سادہ اور (۲) قواعدی

---

[1] ۔ ہندوستانی لسانیات۔

سادہ لفظ: ہمیشہ کسی تصوّر یا خیال کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ بعض خاص حالات میں وہ اپنے مختص مفہوم سے گریز بھی کرتے ہیں۔ بالعموم وہ اپنی حالت نہیں بدلتے بل کہ اپنی حالت' یعنی مفہوم برقرار رکھتے ہیں۔ سوائے استثنائی صورت کے ورنہ ان کا اچھوتا پن باقی نہیں رہ سکتا۔

قواعدی لفظ: قواعدی لفظ آزاد حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جب تک وہ کسی اور کے ساتھ ترکیب نہ پالیں ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔ یہ جوڑ والے لفظ ہوتے ہیں۔ یہ اپنے ماقبل اور مابعد کے ساتھ ہر وقت معنی تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہ جملوں میں بطور کلمہ کے قواعدی پابندی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ دو اجزاء پر مشتمل ہوا کرتے ہیں۔ ایک اصل لفظ دوسرا قواعدی سابقے ولاحقے [1]۔

الفاظ کی ان دو نوعتوں کو اصطلاح میں مادّہ اور مشتق سے موسوم کیا جاتا ہے مادّہ اور مشتق کسی بھی زبان کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مشتق الفاظ کے مقابل مادّہ لفظ بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال دنیا کی تمام زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ مادّہ بنیادی تصوّر اور مفہوم رکھتا ہے اسی کے ساتھ سابقوں اور لاحقوں کو جوڑ کر ہی الفاظ کے خزانوں میں اضافہ کیا جاتا ہے گویا زبان کو مالا مال کرنے والے یہ اہم ذرائع ہیں۔

ارتقائی عوامل EVOLUTIONARY ACTIONS

دنیا کی ہر شئے تغیّر و تبدّل کے مراحل طے کرتی ہوئی ارتقاء کی منزلیں سر کرتی ہے۔ زبان دنیا کی کسی بھی دوسری چیز کے مقابل زیادہ اس تبدیلی کے اصول کو اپناتی ہے۔ زبانوں کے ارتقاء میں فطری قانون' حالات' واقعات' انسانی کوششوں کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ غیر محسوس طریقہ پر ان کے زیر اثر زبان خود بخود بدلتی جاتی ہے۔ زبان کا پورا انحصار الفاظ کے خزانوں پر ہوتا ہے۔ جب لفظ یا جملہ بدلتے ہیں یا مفاہیم تبدیل کرتے ہیں یا شکل و صورت بدل لیتے ہیں تو ظاہر ہے زبان از خود بدلتی جائے گی۔ زبان کی یہ تبدیلی افادی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ لفظ کی شکل و صورت اور معنی و مفہوم کی تبدیلی کے کئی اسباب ہیں ان سے نقصان تو نہیں ہوتا البتہ زبان ارتقاء کی منزلیں طے کیا کرتی ہے۔ الفاظ یا زبان میں تغیر و تبدل یکبارگی نہیں ہو جاتا بلکہ صدیوں کے مسلسل اور تدریجی

---

[1] زبان اور علم زبان

عمل سے ہوا کرتا ہے۔ تغیّر دار تقاء زبان کے اسباب یہ ہیں۔

صوتی تغیّرات (PHONETIC CHANGE)

زبان کے فطری ارتقاء میں صوتی تغیّرات کی بنیادی کوشش ہوتی ہے۔ نسلوں کے درمیان اکثر و بیشتر بے پناہ تبدیلیاں راہ پاتی ہیں۔ طرز زندگی معاشرتی ضابطے، رہن سہن کے طریقے عادات و اطوار، مصروفیات و مشاغل میں ہونے والی غیر محسوس تبدیلیوں کا اثر آنے والی نسلوں کے ورثہ پر پڑتا ہے دادا پڑدادا کی عادتیں ان کے اخلاف تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ بدل جاتی ہیں۔ جس طرح طرز رہائش، آداب معاشرت اور معاشی وسائل وغیرہ میں بدلاؤ آتا ہے زبان کے معاملہ میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے آوازوں، لہجہ، طرز گفتگو میں انجان تبدیلی سے صوتی تغیّرات وقوع پذیر ہوتے ہیں جو زبان کے ارتقاء کا باعث ہوتے ہیں۔

زبان کے تغیّرات کے اسباب

- صوتی تغیّرات
  - طرز ادائیگی کے سبب
  - الفاظ کا تبادلہ
  - جغرافیائی اسباب
  - طرز تخاطب
  - سیاسی اسباب
  - مذہبی اسباب
  - سماجی اسباب
  - علمی اسباب
    - اصلاحی کوششیں
    - جیسے مظہر تحریک

طرز ادائیگی کے سبب (PHRASEOLOGICAL REASON) کسی بھی لفظ کی ادائیگی کا طرز ہمیشہ معیّن نہیں ہوتا۔ بولنے والے کا انداز بدل جاتا ہے یا کسی وجہ سے حقیقی تلفظ ادا نہ ہو یا پھر سننے والے کی اپنی سماعت کا قصور ہو تو بھی اس کا اثر تلفّظ کی تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جیسے لالٹین (لانٹرن) قلالین (فلانل) اور طبر (تبر) وغیرہ۔

الفاظ کے تبادلوں کے سبب (EXCHANGES OF WORDS CAUSE) ایک زبان بولنے والا اگر دوسری زبان بولنے والوں کے پاس چلا جائے تو اپنی سہولت کی خاطر اس زبان کے کئی الفاظ اپنائے گا اور اپنی زبان کے الفاظ انھیں مستعار دے گا جو آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی زبان کا حصہ بننے لگیں گے۔ اجنبی زبانوں کے الفاظ کے تبادلے سے زبان متاثر ہونے لگے گی۔ صوتی طور پر اور مفہوم کے اعتبار سے الفاظ اپنی اصلیت کھو کر نئی شکل، صورت معنی و مفہوم اپنائیں گے یہ عمل بھی دس بیس برسوں میں نہیں بلکہ صدیوں اور نسلوں کے

درمیان ہوتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بڑے پیمانہ پر مختلف زبانوں کے الفاظ متبادل ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں کلاسیکی زبان کے الفاظ جدید زبانوں میں آئے جیسے عربی الفاظ کی انگریزی میں منتقلی کی یہ مثال ہے الکحول (ALCOHOL) العرق (ARRACK) الربع (ARROBA) القصبہ (CASBAH) قہوہ (COFFEE) الذرہ (DURRA) الحریم (HAREM) جرۃ (JAR) الرباب (REBE) سفری (SAFARI) زعفران (SAFFRON)[1] اس کے علاوہ دیگر زبانوں نے بھی ایک دوسرے کے الفاظ کا وسیع تر پیمانے پر تبادلہ کیا ہے۔ الفاظ کے تبادلوں کے سبب تین طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ (۱) ساخت (۲) معنی (۳) آواز

۱۔ ساخت، معنی، اور آواز من وعن تبدیل ہوتے ہیں ۲۔ ساخت اور آواز بدلتی ہے معنی نہیں۔

۳۔ معنی بدلتے ہیں ساخت و آواز نہیں۔

جغرافیائی اسباب (GEOGRAPHICAL REASONS) زبانوں کے ارتقاء میں جغرافیائی حالات کا حصہ ناقابل نظرانداز ہوتا ہے۔ انسان فطرتاً تغیر پسند واقع ہوا ہے۔ انسانی گروہوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو ہجرت کرنے کا مزاج بہت قدیم ہے۔ جب سرد علاقے کے لوگ گرم علاقے میں آجائیں۔ یا پہاڑی لوگ میدانی علاقوں میں بس جائیں۔ جزائر کے رہنے والے ریگستانوں میں رہنے لگیں یا صحرانشین متمدن علاقوں میں بود و باش اختیار کرلیں تو نئے مقام پر اپنے مخصوص نام اشیاء اور جانوروں وغیرہ کے لئے استعمال کرتے ہیں تو مقامی زبانیں بدلتی ہیں بیرونی الفاظ کا داخلہ زبان کے لئے نیا سانچہ تیار کرتا ہے

طرز تخاطب کے سبب (BY THE FORM OF CONVERSATION) مخاطبت کے انداز کا تلفظ اور معنی پر اثر پڑتا ہے۔ نرمی، جوش، سختی، جذباتیت، الفاظ کو مختلف شکلیں دیتی رہتی ہیں۔

سیاسی اسباب (POLITICAL REASONS) سیاسی اتھل پتھل بھی زبانوں کو متاثر کرتی ہیں۔ فاتحین مغلوب قوموں کو اپنی زبان اختیار کرنے پر بعض دفعہ بزور اور بعض دفعہ مصلحت سے آمادہ کرتی ہیں کئی طرح سے زبان متاثر ہوتی ہے لفظ اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹتے ہیں اور معنی پر

---

[1] المورد قاموس عربی انگریزی

بھی اثر پڑتا ہے۔ زبانوں کی ہیئت ترکیبی اور الفاظ کی تشکیل میں سیاسی اسباب کا بہت زیادہ حصّہ ہوتا ہے رومیوں کے یونان پر تسلّط کی بناء پر وہاں کی زبان متاثر ہوئی۔ ہندوستان کی قدیم بولیوں نے آریہ زبان کا اثر جلد قبول کیا۔ جو آج تک موجود ہے ایران میں مختلف نظریات نے پناہ لی اس کے نتیجہ میں فارسی زبان وسیع تر بنیادوں پر پھیلی۔ ہندوستان میں ایرانیوں کے داخلہ کے سبب یہاں فارسی کا اثر بڑھنے لگا اسی طرح عربوں کی آمد سے عربی کا مقامی زبانوں میں بول بالا ہوا۔

مذہبی اسباب (RELIGIOUS REASONS) زبان کے مطالعہ اور تحریری ذخائر کی چھان بین سے کسی بھی ملک کی عہد بہ عہد تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ جان بیمز اور تارا پوروالا نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں عہد قدیم میں سنسکرت کا غلبہ مذہبی ذہن کا پتہ دیتا ہے اور مابعد رومانیت کا زور ہوا۔ مذہب کے اثر سے زبانیں نیا روپ اختیار کرتی ہیں۔ مذہبی تحریریں یقیناً ہر دور میں ایک معیار سمجھی جاتی رہی ہیں اسی پر ادبی تحریروں کا معیار کیا جاتا ہے گویا مذہب کا اثر و نفوذ زبان کے ہر گوشہ پر کہیں زیادہ اور کہیں محدود نظر آتا ہے۔

سماجی اسباب (SOCIAL REASONS) زبان کی تشکیل اور ارتقاء میں عوام کے اہم ترین کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یہ اور بات ہے کہ اس میں ان کا خاص منشاء داخل نہیں ہوتا بالکلیہ غیر محسوس طریقہ پر لوگ الفاظ کے خزانوں میں اضافہ کرتے جاتے ہیں جو ان کی ضروریات کا تقاضہ ہوتا ہے اس طرح وہ زبانوں کی تعمیر اور زبانوں کے تغیر ہر دو امور میں بھرپور حصہ لیتے ہیں مگر انجان طریقے سے، بعد میں یہی تبدیلیاں مستقل حیثیت اختیار کرلیتی ہیں۔

علمی اسباب (LITERALLY CAUSES) زبان کے ارتقاء اور الفاظ کی تشکیل میں اہل علم و ادب کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ لسانیات کے ماہرین اور علماء ان [illegible] وان پیچیدگیوں اور زبان و بیان کے پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں جو عامۃ الناس کی لاپرواہیوں اور روزمرّہ کی بول چال کے بدلتے دھاروں کی وجہ سے اثر انداز ہوتے ہیں الفاظ کی تحقیق اور تفتیش کے ذریعہ جائز اور نامناسب الفاظ کو علیحدہ کرنا علماء لسانیات کی اہم خدمت ہے وہ لفظی ذخائر کی تنقیح معنی اور حال کی تبدیلیوں کی جانچ پڑتال کرکے زبان کے معیار کو باقی رکھنا وہ علمی سبب ہے جس سے زبان جلا پاتی ہے۔ ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم نے اپنی تالیف ہندوستانی لسانیات میں اپنے زمانہ قیام فرانس کے ایک واقعہ کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ لفظی خزانے کی تنقیح کے لئے قائم سرکاری اکیڈیمی نے ایک خاص غیر ثقہ لفظ کو اپنی زبان میں قبول کرنے سے انکار کردیا تھا جس پر بڑا ہنگامہ

ہوئیں، ہڑتالیں ہوئیں، جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے، اخبارات میں مضامین شائع ہوئے اور طلباء نے اکیڈیمی کے اراکین پر حملے کئے یہ سب کچھ ہوا مگر اکیڈیمی نے اُس لفظ کو قبول نہیں۔

اُردو میں مظہر تحریک اس طرح کی علمی کمیٹیاں اور لسانی اکیڈیمیاں (LINGUISTIC ACADAMIES) یورپ کے مختلف ملکوں میں قائم ہیں جن کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی غیر ثقہ اور ناجائز لفظ زبان میں داخل نہ ہونے پائے۔ جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی زبان کے الفاظ جرمن زبان سے خارج کر دیئے گئے۔ ہندوستان میں بھی اُردو شاعری میں بھاشا کے الفاظ کو ترک کرنے کی ایک منظم تحریک مرزا مظہر جانِ جاناں کی سرکردگی میں شروع ہوئی جس کی وجہ سے اردو شاعری کو غیر زبانوں کے الفاظ سے محفوظ کیا جانا ممکن ہو سکا۔ صنعت ایہام کا رواج زبان کی بنیادی خوبیوں اور ظاہری شکل وصورت کو بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ مظہر تحریک سے اس پر روک لگائی گئی۔ اور زبان کو کھوکسو اور ٹک جیسے الفاظ سے پاک کیا گیا و تیز غیر ثقہ الفاظ متروک قرار پائے [1]

وضع اصطلاحات (PHRASEOLOGY)

زبانوں کی ترقی اور بقا کے سلسلہ میں علماء اور ماہرین لسانیات کی گراں قدر خدمات سے کوئی اہل زبان انکار نہیں کر سکتا۔ ہر زبان میں جدید الفاظ مختلف طریقوں سے ہوتا رہتا ہے مگر الفاظ اس وقت تک سند قبولیت نہیں پا سکتے تا وقتیکہ علماء انھیں جائز قرار نہ دیدیں۔ "اصطلاح کی ضرورت ایسی نہیں کہ جس سے لوگ آگاہ نہ ہوں۔ اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطالب کے ادا کرنے میں طول لاطائل سے کسی طرح بچ نہیں سکتے جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے وہاں بڑے بڑے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان کو بار بار دہرانا پڑتا ہے لکھنے والے کا جدا وقت ضائع ہوتا ہے اور پڑھنے والے کی طبیعت ملول ہوتی ہے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتے ہیں" [2]

اصطلاحات کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لکھنے اور پڑھنے میں آسانی، وقت کی بچت، مفاہیم

---

[1] ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر زور مرحوم

[2] وضع اصطلاحات سید وحیدالدین سلیم

اور مطالب کی ترسیل میں آسانی ہوتی ہے ۔ یہ بات زبان کی ترقی اور معلومات کی وسعت پر دلالت کرتی ہے ۔ بلاشبہہ اہلِ علم وفضل کی علمی کاوشوں اور عرق ریزیوں کے نتیجہ میں اصطلاحات وضع ہوتی ہیں۔ الفاظ کی ترتیب وتشکیل اور اصطلاحات کا معیار علماء و ماہرین کے علم و مطالعہ کی وسعت، صلاحیتوں اور علمی معیار کے تابع ہوتا ہے۔ وضع اصطلاحات کا کام زبان کی ترقی و بقا میں اساسی موقف رکھتا ہے ۔ جدید الفاظ اور اصطلاحات کے اضافہ کے ذریعہ ہی زبان ترقی کے مدارج طے کرتی ہے ۔

اصطلاح سازی میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی نقید المثال عظیم الشان خدمات اُردو دنیا کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی جس اعلیٰ پیمانے پر عمدگی اور معیاری انداز سے اُردو میں وضع اصطلاحات کا کام یہاں ہوا ہے وہ ساری دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس ادارہ کو ملک کے چوٹی کے علماء اور ماہرین لسانیات کا تعاون و اشتراک اور حکومت آصف جاہی کی پوری، پوری سرپرستی حاصل تھی ۔

تحریر کا ارتقاء

EVOLUTION of WRITING

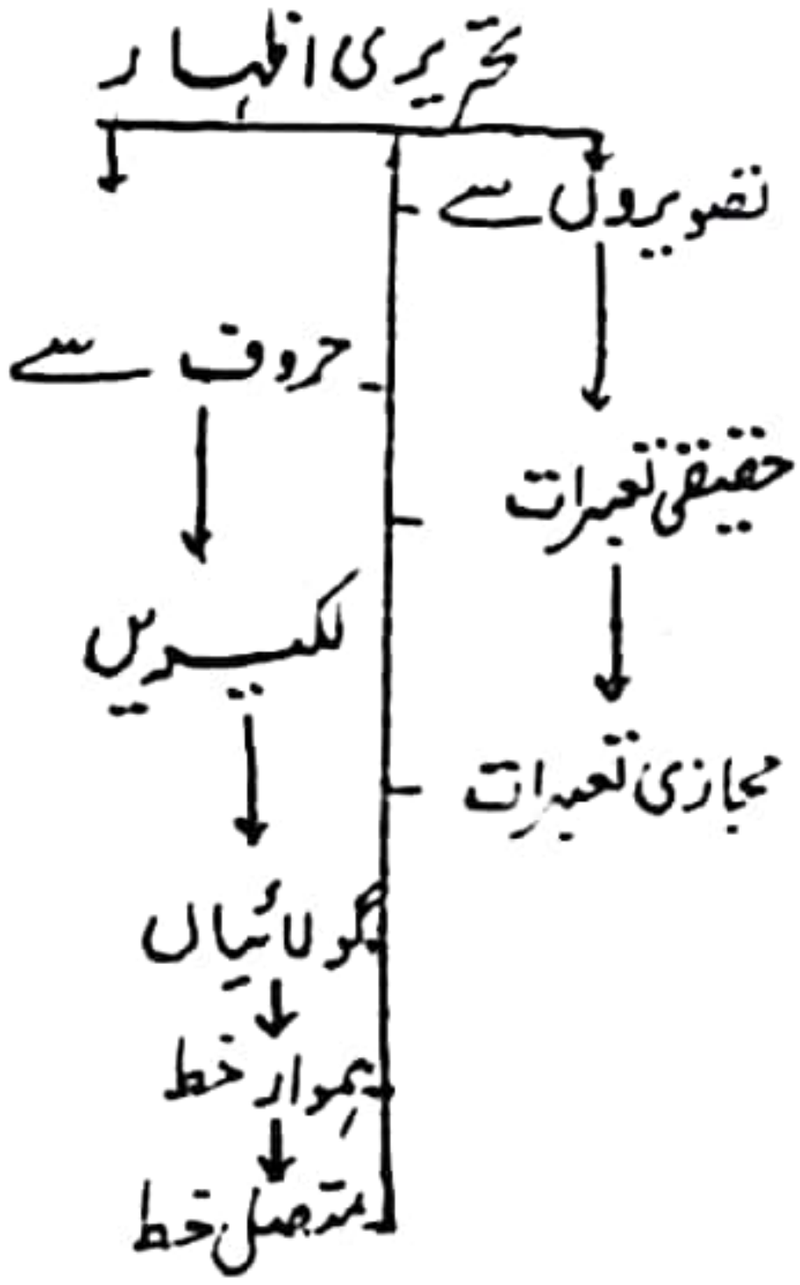

تحریر کو انسانی ترقی، ذہنی عروج، تہذیب وشائستگی کی علامت اور زبان کے ارتقاء کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے ۔ تحریر کے ذریعہ خیالات کا اظہار دو طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ (۱) تصویر سے (۲) حروف سے یہ ہر دو صورتیں زمانہ قدیم سے آج تک کسی نہ کسی طریقہ و انداز سے رائج ہیں۔

تصویری خط (PICTORIAL WRITING) "پہلے مختلف اقوام نے تصویریں بنانا سیکھا۔ اس کے بعد تصویری خط ایجاد کئے۔ اچھی تصویر وہ سمجھی جاتی ہے جو اصل کی ہو بہو نقل ہو۔ لیکن تصویری تحریر کا مقصد مصوری کا کمال دکھانا نہیں ہوتا بلکہ کسی خیال کا ناظر کے دماغ میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔"

"اول اول تصویروں کو پڑھا نہیں جاتا تھا بل کہ دیکھ کر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تصویریں

دو طرح کی ہوتیں۔ (۱) حقیقی تعبیرات۔ (۲) مجازی تعبیرات۔

حقیقی تعبیرات (PRIMARY SIGNS) جیسے چاند سورج بنا کر چاند سورج ہی مراد لینا۔

مجازی تعبیرات (ASSOCIATIVE SIGNS) جیسے سورج بنا کر دن، سال یا سونا مراد لینا اور چاند بنا کر رات، مہینہ یا چاندی مراد لینا۔"

"جب یہ محسوس کیا گیا کہ ہر خیال کی تصویر نہیں بنائی جا سکتی تو معدودے مرکب تصاویر کو مجازی معنوں میں استعمال کیا جانے لگا مثلاً چینی خط میں محبت یا ممتا کے لئے عورت اور بچے کی تصویر بنائی جاتی ہے اور باپ کے لئے ہاتھ اور چھڑی کی تصویر"۔

"ابتداء میں تصویری خط کو دیکھ کر سمجھا جاتا تھا پڑھا نہیں جاتا تھا بعد میں ہر تصویر کو اس کے نام سے پکارا جانے لگا عموماً ہر تصویر ایک لفظ کے قائم مقام ہوتی اگر کوئی تصویر ایک سے زائد خیالات کو ظاہر کرتی تو اس کے متعدد نام ہوتے [1]۔

لکیریں۔ "تصویری تحریر میں کاتب جزئیات و تفصیلات میں نہیں جاتا بلکہ تصویروں کے صرف وہی حصے پیش کرتا ہے جو اس کے مقصود کی طرف اشارہ کر سکیں پھر یہ تصویریں مختصر ہو کر آڑھی ترچھی لکیروں کا مجموعہ بن جاتی ہیں اس طرح تصویری خط لکیروں کی لکھائی میں بدل جاتا ہے"[2]

دائرے اور گولائیاں۔ "سامان کتابت نے تحریر کی صورتوں کو کافی متاثر کیا۔ جب پتھر کی سلوں، مٹی کی خام اینٹوں، لکڑی یا دھات کی تختیوں پر سخت اور نوکدار آلات سے لکھتے تھے تو نقوش زاویے دار تھے لیکن جب چمڑے، بھوج پتر، یا کاغذ پر لکھا جانے لگا تو ان میں گولائی پیدا ہو گئی۔"

ہموار خط۔ "وقت اور محنت کی بچت کے خیال نے انسان کو زود نویسی پر مجبور کیا اور وہ قلم اٹھائے بغیر لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حروف آپس میں ملنے لگے اور ان کی شکلیں بدل گئیں اس طرح دو خط پیدا ہوئے (۱) یادگاری یا آثاری خط (MONUMENTAL WRITING) اسی کو ہم ہموار خط کا نام بھی دے سکتے ہیں۔" جسے پتھر کی سلوں اور لکڑی یا دھات کی تختیوں پر احتیاط کے

---

[1] بحوالہ فن تحریر کی تاریخ ص ۸ [2] بحوالہ فن تحریر کی تاریخ ص ۷

کندہ کیا جاتا' اس کے حروف برابر اونچائی کے ہوتے ۔"[1]

متصل خط : دوسرا خط گھسیٹ یا رواروی خط (CURSIYE WRITING)
نرم سطح پر تیزی سے لکھا جانے والا خط جس کے حروف متصل اور گولائیاں لئے ہوتے ۔ اسی کو متصل خط کا نام دیا جا سکتا ہے ۔

حروف ۔ " تحریر مختلف ادوار میں ارتقاء کی مختلف تدریجی منزلوں سے گذرتی ہوئی جب کمال کو پہنچی تو حروف کی شکل میں منضبط ہوئی ۔" تحریر بھی ایک فرضی چیز ہے یعنی ان آوازوں کو جنھیں انسان گفتگو میں استعمال کرتا ہے جب علامت کے طور پر مقرر کر دیا جاتا ہے اور اس پر ایک مخصوص نسلی گروہ متفق ہو جاتا ہے تو ان علامتوں کو حروف کا نام دیا جاتا ہے انھیں اصطلاح میں حروف تہجی یا حروف تہجی (ALPHABETIC SCRIPTS) بھی کہا جاتا ہے حروف کی ایجاد نے تحریر کے مسائل آسان کر دیئے حروف تہجی دراصل حروف بسیط اور حروف علت کی الگ الگ علامتوں کے تعین کا نام ہے ان سے حروف کی تعداد سینکڑوں ہزاروں سے گھٹ کر محض چند رہ گئی ۔

حروف کے آغاز کے بارے میں نظریات

مختلف نظریئے :۔ حروف کی ایجاد و آغاز کہاں ہوا اور اس کی ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے یہ معجزۃ الآرا مسئلہ آج تک حل نہ ہو سکا ۔ مختلف اقوام کو اس ضمن میں دعویٰ ہے تاہم ۔

- حروف کے آغاز کے بارے میں
  - سامی نظریہ
  - فنیقی نظریہ
  - مصری نظریہ
  - کریٹ نظریہ
  - سنیائی نظریہ

سامی نظریہ اس انقلاب آفریں ایجاد کا سہرا سامی قوم کے سر ہے ۔"[2] کیوں کہ سامی حروف ہی سے دنیا کے تمام قدیم و جدید حروف تہجی ماخوذ ہیں ۔

فنیقی نظریہ فنیقی قوم نے حروف تہجی ایجاد کئے ماہرین کی ایک جماعت اس خیال کی حامی ہے ۔ لیکن جب فنیقی رسم خط کے ماخذوں کی گہرائی سے مطالعہ کیا گیا تو سامی کتبوں اور فنیقی خط میں بنیادی یکسانیت پائی گئی جس کی بناء پر سامی اور فنیقی رسم الخط کو ایک ہی مانا گیا اس طرح

---

[1] بحوالہ فن تحریر کی تاریخ ص ۷۸

فرانسیسی محقق انامل ڈی ردز کا نظریہ جس کی تائید مشہور ماہر لسانیات آئزک ٹیلر نے کی تھی، مسترد کر دیا گیا۔

مصری نظریہ اہل مصر نے حروف ایجاد کئے اور فنیقی رسم الخط کا ماخذ مصری حروف ہیں یہ نظریہ بعض ماہرین مصریات کا ہے جن میں قابل ذکر ایڈیمیٹی اور سر نلنڈرس پیٹری ہیں۔ قدیم ظروف پر منقوش علامتوں نے ان کے نظریہ کو تقویت بخشی۔ ایسی نشانیاں مصر کے علاوہ کریٹ، سائرس کپریا، سیڈیا اور ایسین وغیرہ ممالک میں بھی ملیں۔

کریٹ نظریہ مشہور محقق سر آرتھر ایونس نے فنیقی رسم خط کو کریٹ کے خط سے ماخوذ بتایا ہے۔ لیکن کئی اسباب کی بناء پر علماء لسانیات نے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے

سینائی نظریہ: بعض ماہرین حروف کی ایجاد کا ماخذ سینائی تصویری خط کو بتلاتے ہیں۔ انگریز محقق ڈاکٹر گارڈنر نے فنیقی کا ماخذ بھی اسی کو بتایا ہے سینا، فنیقیہ، شام اور مصر کے درمیان واقع ہے۔ یہ نظریہ اگرچہ کہ مشہور ہے مگر ابھی بہت سی باتیں اس کو تسلیم کرنے میں مانع ہیں جن میں نمایاں بات یہ ہے کہ صرف دو چار لفظوں سے قطع نظر سینائی کتبے آج تک پڑھے نہ جا سکے ہیں۔

ان مختلف نظریات کے پیش نظر قطعی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تاہم سامی نظریہ کو اگر قبول کر لیا جائے تو بہت سی مشکلات حل ہوتی نظر آئیں گی۔ سامی حروف کی ایجاد کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م کے بعد اور (۵۰۰) ق م سنے پہلے کا مانا جاتا ہے۔ اسی عہد میں شامیوں کے زیر اقتدار مصر اور شام کے علاقے تھے ان کا سیاسی عروج حروف تہجی کی ایجاد میں معاون ثابت ہوا ہوگا[1]

رسم خط۔ "کسی زبان کو لکھنے کی معیاری صورت کا نام رسم خط ہے"[2] کوئی بھی زبان سیکھنے والا حروف کے ذریعہ اپنے مقصد کا آغاز کرتا ہے اور یہی کسی زبان کی اہم اور بنیادی ضرورت ہوتی ہے اور ابتداء سے انتہا تک ناگزیر بھی۔ تعلیم کے شروع میں طالب علم کی نظر، یادداشت اور قلم سے پہلے لفظوں کی صورتوں سے شناسا ہوتے ہیں ابتداء میں وہ صورت نویسی سیکھتا ہے لفظوں کے معنی و مفاہیم کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت بعد میں پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے بنیادی حیثیت الفاظ کے املا کی ہے جو تحریر کے لئے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔

املا (ORTHOGRAPHY) رسم خط کے مطابق صحت سے لکھنے کا نام

---

[1] بحوالہ فن تحریر کی تاریخ [2] اردو املا۔

املا ہے۔ املائی تغیرات بھی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں یعنی وہ زبان کے عمل ارتقاء کے مختلف مرحلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تغیر نافذ نہیں کیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ خود بخود یہ روئے کار آیا کرتا ہے [1]

انیسویں صدی اور اس سے پہلے کے متعدد مخطوطوں میں لفظ "ماں" (بہ معنی مادر) نون کے بغیر ملتا ہے۔ یہی صورت "دونوں" کی ہے ("ما" اور "دونو") اُس زمانے میں اور اس سے پہلے بھی "ہیں" (بہ معنی "تے") اور "سیں" (بہ معنی "سے") مستعمل تھے۔ "تڑپھنا" تو بہت بعد تک مستعمل رہا۔ اب ان لفظوں کی صورتیں بدل گئی ہیں یہ تغیر ہے جو ارتقاء زبان کی عمل کی نشاندہی کرتا ہے [2]

املا	تحریر کی شکلیں
اصلاح اس سے مختلف عمل ہے	
مثلاً انجمن ترقی اردو نے ایک زمانے میں یہ طے	رسم خط
کیا تھا کہ وہ لفظ جن کے آخر میں "ی" لکھی	املا
جاتی ہے مگر پڑھتے الف آتا ہے ان کو اُردو میں	لغت

الف ہی لکھنا چاہئے جیسے اونا، اعلا اور منتقا وغیرہ (عربی کے مطابق، ادنیٰ، اعلیٰ اور منتقیٰ وغیرہ) یہ اصلاح ہے اصلاح نافذ کی جاتی ہے جب کہ تغیر رونما ہوتا ہے [3]۔

لغت (DICTIONARY) استناد کا اہم ترین ذریعہ ہوتا ہے اس میں لفظوں کے اجزا کے ساتھ ساتھ، ان کی ترتیب کا بھی تعین کیا جاتا ہے جب کہ املا لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے اور جو طریقہ ان حرفوں کے لکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے وہ رسم الخط کہلاتا ہے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ "املا لفظوں کی صحیح تصویر کھینچتا ہے" املا میں کسی لفظ میں شامل حروف کی ترتیب صورت اور ان کے جوڑوں کی بنیادی اہمیت ہے لفظ میں حرفوں کا تعین اور ترتیب بھی املا کے دائرے میں آتی ہے۔ لفظوں کے املا اور حروف کے تعین کی نسبت ہی سے لغت میں لفظوں کی فصلیں قائم کی جاتی ہیں۔ [3]

[1،2،3] اُردو املا۔ رشید حسن خاں

باب دوم

زبانوں کی تقسیم (CLASSIFICATION OF LANGUAGES)

مشہور امریکی محقق اور ماہر لسانیات لوئی گرے کا خیال ہے کہ دنیا بھر میں ان گنت بولیاں اور زبانیں ہیں تاہم بولیوں کو چھوڑ کر صرف باقاعدہ زبانوں کی تعداد دو ہزار سات چھیانوے (۲۷۹۶) ہے آیا یہ ساری زبانیں ایک ہی منبع سے تعلق رکھتی ہیں یا ان کے ماخذ الگ الگ ہیں یہ مستقل بحث ہے مختلف زبانوں کے صوتی احوال، الفاظ کی بناوٹ، فقروں اور جملوں کی نوعیت جملوں میں الفاظ کے جوڑ اور ان کی ترتیب اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہیں کہ دنیا کی ساری زبانیں یکساں نہیں ان میں مختلف النوع تضادات موجود ہیں اسی لئے انکی تقسیم ناگزیر ہے تاکہ اس موضوع کے مطالعہ میں آسانی ہو سکے۔

زبانوں کی گروہ واری تقسیم کئی طرح سے کی جاتی ہے۔ صوتیات، الفاظ، تراکیب، تاریخی، نسلی اور خاندانی بنیادوں پر ماہرین نے ان کی تقسیم کی ہے۔ علماء لسانیات نے زبان اور بولی میں تفریق کی ہے اس وجہ سے دنیا بھر میں جتنی بولیاں اور زبانیں مستعمل ہیں ان کی صحیح تعداد کا تعین مشکل امر ہے تاہم صرف زبانوں کے متعلق جو اعداد و شمار ملتے ہیں انھیں سامنے رکھ کر ان کی خصوصیات کی اساس پر ان کی تقسیم ایک حد تک ممکن اور نسبتاً آسان کام ہوگا۔

زبان کی قواعدی تقسیم

- یک لفظی
- اشتقاقی
  - ترکیبی
  - تحلیلی

زبانوں کی تقسیم کا کام مرحلہ وار انداز کا ہے ماہرین علم زبان نے سب سے پہلے زبانوں کو وسیع تر مفہوم کے ساتھ دو بڑی جماعتوں میں تقسیم کیا ہے۔

(ا) قواعدی (ب) خاندانی

قواعدی تقسیم (GRAMMATICAL CLASSIFICATION)

زبانوں کی قواعدی تقسیم، صوتی احوال، ان کے فرق و امتیاز، جملوں کی بناوٹ اور لفظوں کے آپسی تعلقات کی بنا پر کی جاتی ہے۔ اس جماعت کو ان ہی خصائص کی بنیاد پر چار ذیلی جماعتوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ **یک لفظی** (MONOSYLLABIC) اس ذیلی تقسیم میں "وہ یک لفظی زبانیں آتی ہیں جو غیر نمو پذیر ہیں اور جن کے الفاظ اپنی جگہ پر تنہا مکمل ہوتے ہیں، نہ ان کی شکل تبدیل ہوتی ہے۔ نہ ان میں کوئی لفظ یا کسی لفظ کا جزو جوڑ سکتے ہیں اور نہ ان سے کوئی لفظ مشتق ہوتا ہے ان کی گردان نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کی سب سے مشہور مثال چینی زبان کی ہے"[1]

۲۔ **ترکیبی** (ORGANIC) "دوسری قسم ان زبانوں کی ہے جو بنیادی لفظ میں دوسرے الفاظ یا الفاظ کے ٹکڑے جوڑنے سے بنتی ہیں ان کے یہ جوڑ الگ الگ کئے جا سکتے ہیں ہر جوڑ اپنی جگہ الگ معنی رکھتا ہے یا رکھتا رہا ہوگا اس کی سب سے زیادہ واضح اور معروف مثال "ترکی" سے ہے"[2]۔

۳۔ **اشتقاقی** (DARIVATIVE) "اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بنیادی لفظ یا مادّہ میں الفاظ یا اجزائے الفاظ جوڑ کر نئے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں یہ نئے الفاظ حالت اور زمانے کے تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی معنوی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اس میں اکثر سامی اور آریائی زبانیں ہیں"[3]

۴۔ **تحلیلی** (ANALATIC) یہ اشتقاقی زبان کی ایک بہتر ترقی یافتہ شکل ہے جس میں اشتقاق یا مشتق جزو اصل لفظ میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ اس کے الگ وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ جو سابقے اور لاحقے اشتقاقی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں وہ تحلیلی منزل میں پہونچ کر صوتی تغیرات اور دوسری وجہوں سے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ کسی لفظ میں جوڑے ہوئے اجزا کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اکثر زبانیں ارتقاء کی اسی منزل میں ہیں یعنی ترکیبی سے تحلیلی جانب قدم بڑھا رہی ہیں"[4]۔

خاندانی تقسیم (LINEAGIC CLASSIFICATION) "زبانوں

---

[1] [2] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ مقدمہ ص ۲۵

کی تقسیم جن دو بڑی جماعتوں میں کی گئی ہے خاندانی جماعت دوسری قسم ہے دنیا میں بولی جانے والی ہزاروں زبانوں میں ہر ایک کی الگ الگ شناخت دشوار ہے البتہ نسلی اور تاریخی لحاظ سے جو خاندانی جماعت بنائی گئی ہے اسی پس منظر میں چند بنیادی مشابہتوں اور خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے علماء لسانیات نے اس جماعت کو آٹھ بڑے خاندانوں میں تقسیم کر دیا ہے ان میں کا ہر ایک خاندان اپنے بولنے والوں کی کیفیات، اپنے علاقوں اور ممالک کے احوال، قبائل کے مزاج و نیز ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والی مختلف زبانوں کے آپسی تال میل، ربط و ضبط، رشتے اور تعلقات کی وضاحت کرتا ہے جن کا مطالعہ لسانی نقطہ نظر سے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

زبانوں کی خاندانی تقسیم

- سامی
- آفریقہ کی بانتو
- ہند چینی
- دراوڑ
- ملایائی
- منڈا
- امریکی
- ہند یوروپی

ابتداء میں ساری دنیا کو چار عظیم لسانی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱) امریکی حلقہ (۲) بحر الکاہل کا حلقہ (۳) افریقی حلقہ (۴) یوریشیائی حلقہ۔ دراصل خاندانی جماعت کے آٹھ بڑے خاندان کا ان ہی سے تعلق ہے اور دنیا میں آج جتنی زبانیں مستعمل ہیں وہ سب نسلی و تاریخی اعتبار سے ان خاندانوں ہی سے وابستہ ہیں۔ آٹھ بڑے خاندان السنہ یہ ہیں۔

زبانوں کے خاندان LANGUAGES FAMILIES

(۱) سامی (۲) آفریقہ کی بانتو (۳) ہند چینی (۴) دراوڑ (۵) ملایائی (۶) منڈا (۷) امریکی (۸) ہند یوروپی

۱۔ **سامی خاندان السنہ**:۔ یہ خاندان حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند سام بن نوح سے منسوب ہونے کی وجہ سے سامی کہلاتا ہے[1] اس خاندان السنہ کی زبانیں کئی حیثیت سے بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ عہد قدیم میں سامی خاندان السنہ کا اثر دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر نمایاں تھا۔

---

[1] ہندوستانی لسانیات ص ۵۲

آج بھی اس کے زیر اثر ایک وسیع علاقہ ہے جہاں نہایت ترقی یافتہ صورت میں اس کی زبانیں مروج ہیں اگرچہ کہ اس کی بعض زبانیں تغیرات اور ارتقائی عمل کے سبب کچھ کی کچھ ہوگئی ہیں تاہم بعض بنیادی خصوصیتوں اور واحد سرچشمہ کی پہچان کے ساتھ دنیا کے ۳ بڑے خطوں میں نہ صرف رائج ہیں بل کہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

سامی بولنے والوں کا سیاسی عروج، ایک زمانہ میں اس خاندان السنہ کے علمی و تہذیبی خزانوں کو مالا مال کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا تھا اگرچہ آج یہ حالت باقی نہیں اس کے باوجود سامی خاندان کی اہمیت اس کی بعض زبانوں کی وجہ سے ہمیشہ باقی رہے گی۔ کیوں کہ اکثر مذہبی کتابیں ان میں ہیں اس خاندان السنہ کی تاریخ حالیہ تحقیقات کی روشنی میں پانچ ہزار سال سے زیادہ قدیم تسلیم کی گئی ہے سامی کی یوں تو کئی شاخیں ہیں ان چند بے حد معروف ہیں ہر ایک شاخ کی کئی زبانیں ہیں، جن کی تفصیلات طوالت کا باعث ہوں گی۔ چند کا اجمالاً تذکرہ مفید ہوگا۔

آشوری یا بابلی (BABYLONIAN) یہ سامی قوم کے ابتدائی عہد کی زبان تھی جو شام اور بابل کے علاقوں میں بولی جاتی تھی اس شاخ کی بہت ساری زبانیں مفقود ہوگئی ہیں۔ اور قدیم دستیاب کتبوں سے ہٹ کر ان کی تفصیلات موجود نہیں۔

کنعانی :- یہ سامی خاندان کی ایک اہم شاخ ہے بعض علما و لسانیات کنعانی کو ہی فنیقی کا سرچشمہ بتلاتے ہیں۔ کنعانی کی اہم اور مشہور زبان عبرانی (HEBREW) ہے یہ یہودیوں اور نصرانیوں کی مذہبی زبان ہونے کی بنا پر قدر و منزلت پا گئی ہے قدیم عہد نامجات اور یہودیوں کی مقدس کتاب عبرانی میں ہے عبرانی یہودیوں کے گھروں میں ہمیشہ ہی بولی سمجھی جاتی رہی ہے آج بھی یہ زبان مستعمل ہے بل کہ اسرائیل کے سیاسی وجود نے اس کو حیات نو بخشی ہے۔

آرامی :- (ARAMAIC) آرامی اور کنعانی کا آپسی ربط گہرا ہے۔ فلسطین میں یہ کبھی ادبی درجہ پر فائز تھی ایک زمانہ میں اس کا اثر تمام مغربی ایشیا، اور مصر پر بھی قائم تھا۔ انجیل مقدس کے کئی ابواب آرامی میں قلم بند کئے گئے تھے بالمیری اور نبطی زبانیں بھی آرامی سے متاثر تھیں۔

عربی :- (ARABIC) عربی زبان کو جو وقعت اور اہمیت سامی خاندان میں حاصل ہے وہ کسی کو نصیب نہیں۔ سامی کی بنیادی خصوصیتیں، لسانی روپ، رنگ و آہنگ، لہجہ

واسلوب عربی میں جھلکتا ہے۔ عربی کو زمانہ قدیم ہی سے بے پناہ وسعت اور پھیلاؤ ملا۔ اس زبان کی کئی بولیاں دور دراز مقامات پر پھلنے پھولنے لگیں بعد میں یونانی اور ایرانی سے ارتباط کے نتیجہ میں اس زبان کو مزید فروغ ہوا۔

ان وجوہات سے قطع نظر "قرآن حکیم" کا عربی زبان میں نزول اس زبان کے عظیم الشان ارتقاء استحکام اور بقا کا سبب بنا۔ اس کا اثر و نفوذ مغربی ایشیاء کے علاوہ ساری دنیا میں پھیلنے لگا۔ کیوں کہ دنیا کے ایک بڑے مذہب کی مقدس تعلیمات اس میں ہونے کی وجہ سے جہاں جہاں اسلام کے ماننے والے تھے یا ہیں وہاں عربی کی مقبولیت، اہمیت اور عزت قدرتی بات ہے۔ قرآن مجید نے عربی کو عام زبانوں کی سطح سے بلند کر کے اس کو تقدس اور رفعت عطا کیا آج کل نہ صرف عرب علاقوں بلکہ دنیا کے اور حصوں میں عربی سے عام دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ عربی کے ارتقاء ترویج و اشاعت میں عرب ممالک کے مختلف علمی ادارے بالخصوص مصر کا جامعہ ازہر نمایاں حصہ لے رہا ہے عربوں کے معاشی استحکام نے بھی اس کام میں تیزی پیدا کردی ہے۔

سامی خاندان السنہ

- آشوری یا بابل (کئی شاخیں) مفقود
- کنعانی
- آرامی
- عربی
- حمیری
- حبشی (کئی شاخیں)

حمیری (HAMITO - SEMITIC) یہ زبان بھی سامی خاندان السنہ ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ بعد میں یہ مہری زبان کے نام سے پہچانی جانے لگی۔

حبشی بولیاں: (HAMITIC LANGUAGES) حبشہ کے قدیم لوگوں کی بولیوں کا تعلق بھی سامی خاندان السنہ سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بولیاں الگ الگ علاقوں میں جداگانہ حیثیت سے مستعمل تھیں ان پر یونانی اور قبطی کا اثر غالب تھا۔ ان میں کی کئی بولیاں صفحہ ہستی سے مٹ گئی ہیں صرف ایک ادھ بولی مذہبی رسوم کی حد تک باقی ہے ان علاقوں میں جہاں یہ بولیاں رائج تھیں آج کل مہری زبان بولی جاتی ہے جس پر سومالی زبان کا اثر نمایاں ہے۔

۲۔ آفریقہ کا بانتو خاندان السنہ (BANTU LANGUAGES) براعظم

آفریقہ میں جو زبانیں رائج تھیں ادھر ہی انھیں بانتو خاندان السنہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ آفریقی چوں کہ قبائل زندگی کے عادی ہیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں وہ اپنے اپنے ڈھنگ سے رہتے بستے ہیں ان کے افتاد طبع کے پیش نظر ان کی زبانوں کی کثرت تعجب خیز نہیں۔ آفریقہ کے بانتو خاندان کی چند مشہور زبانیں یہ ہیں۔

آفریقہ کا بانتو خاندان السنہ

- سواحلی
- بائن ٹاٹ
- سوڈانی شاخیں
  - اوے
  - منفو
  - نگونگے
  - کنوری
  - فلوٹک
  - باوسا

سواحلی زبان (SWAHILI)

یہ افریقہ کے مشرقی ساحل کے علاقے کی مشترک زبان ہے اس میں ادبی ذخیرہ بھی ملتا ہے۔ پہلے عربی رسم خط تھا مگر اب رومن رسم خط مقبول ہو رہا ہے۔

بائن ٹاٹ (BAINTAT)

یہ اگرچہ کہ قدیم باشندوں کی زبان ہے مگر آج بھی اس کے بولنے والوں کی تعداد لاکھوں ہے۔

سوڈانی (SUDANIC) اس کی کئی شاخیں ہیں جیسے اوے، منفو، نگونگے، کنوری، فلوٹک اور باوسا وغیرہ [1]

ان کے علاوہ آفریقہ کے بانتو خاندان کی زبانوں کی (۱۵۰) سے زاید شاخیں ہیں [2]

۳۔ **ہند چینی خاندان**: مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کے وسیع ترین علاقوں میں اس خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہند چینی بہت وقیع اور ادبی حیثیت سے مالا مال خاندان السنہ ہے زبانوں کی ان گنت شاخیں اس سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہند چینی کی معروف لسانی اکائیوں میں سب سے زیادہ اہم زبان چینی ہے۔ اس کے علاوہ سیامی، ہمالیائی یا تبتی اور برمی اہم ترین شاخیں ہیں۔

چینی (CHINESE) اپنی ساخت کی انفرادی خصوصیات کی بنا پر چینی زبان ساری زبانوں سے اچھوتی اور ممتاز تر ہے۔ یہ یک رکنی مادوں پر مشتمل، سابقوں لاحقوں سے بے نیاز زبان ہے اس کا ہر لفظ مادہ اور مجرد خیال کا حامل ہوتا ہے چینی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔

---

[1] بحوالہ زبان اور علم زبان [2] ہندوستانی لسانیات

اس کی ادبی قدامت پانچ ہزار سال پرانی ہے چینی ادب کا ایک خاص مقام ہے کیوں کہ یہ بلند پایہ معیاری ہی نہیں بل کہ قدیم ترین بھی ہے [1]۔

سیامی (SIAMESE) ہند چینی خاندان کی اس اہم شاخ کو تھائی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سیام میں بولی جاتی ہے اس کے علاوہ اور چھ زبانیں بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱) کمبوجا میں، کھویا کمبوجن (ب) وسطی سیام میں، لاؤس (ج) برما میں، کھاتی۔ (د) پیگو میں، مون (ھ) تناسرم میں، شان اور (و) شمالی برما میں پلاونگ [2]۔

ہمالیائی (TIBETAN)

اس کو تبتی بھی کہتے ہیں اس میں (۲۳) شاخیں ہیں جو مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ ہمالیائی کو میکس ملر نے تحت ہمالیائی کہا ہے (۱) بھوٹیا یا بھوٹانٹا۔ (۲) سکم میں، لچا۔ (۳) سکم میں، لمبو (۴) وادی ارن اور مشرقی نیپال میں کرانتی (۵) مشرقی نیپال اور بلند سلسلہ کوہ میں، برمی۔ (۶) اسی علاقہ میں، گرتنگ (۷) وسطی نیپال میں، نیوار (۸) تشیبی سلسلہ کوہ اور وسطی نیپال میں، مگار (۹) تشیبی سلسلہ کوہ اور وسطی نیپال میں برانبو (۱۰) اودھ کی ترائی میں، چی پانگ (۱۱) والپو ہاپو (۱۲) گستدا (یہ تین بولیاں) الیتہ مشرقی نیپال میں، ہایو بولی جاتی ہے (۱۳) مغربی نیپال میں، سنوار (۱۴) مغربی نیپال میں سُریا (۱۵) کناوری یا لچان (۱۶) تمبرسکا (۱۷) ہندیسی (چار زبانیں) اور وسطی نیپال میں، (۱۸) دراہی یا دوری (۱۹) دن وار (۲۰) پہری (۲۱) کسوار (۲۲) پکھیا (۲۳) تھکسا۔ زبانیں بولی جاتی ہیں [3]۔

برمی (BURMESE) ہند چینی خاندان کی اس شاخ کو لولو بھی کہتے ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل زبانیں شامل ہیں (۱) برمی (۲) نیپال اور بھوٹان کی ترائی میں، دہی ل (۳) نیپال اور بھوٹان کی ترائی میں، می چی (۴) کاچر میں، بورو (۵) گارو کی پہاڑیوں میں، گارو (۶) آسام کے شمالی سرحد پر ۵ زبانیں (۶ تا ۱۰) (۶) اکا۔ (۷) اور (۸) مشمی (۹) میری (۱۰) ڈوفلا (۱۱) آسام کے جنوبی سرحد پر (۵ زبانیں) ۱۱ تا ۱۵، کیا (۱۲) میکر (۱۳) آنگامی (۱۴) ناگا (۱۵) سنگ فو (۱۶) چٹاگانگ کے شمالی اور پہاڑی علاقہ میں، کوکی (۱۷) اراکان میں (۶) زبانیں (۱۷ تا ۲۲)، لُمی (۱۸) کومیا (۱۹) مرو (۲۰) سک (۲۱) تنگلو (۲۲) رونگھینگ، (۲۳)

---

[1] بحوالہ زبان اور علم زبان ۲/۳ [2] بحوالہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

زیادے کولان کی بولیاں' تعداد میں بہت ہیں۔ (۲۴) منی پوری بولیاں (۲۵) کورتگ بولیاں (۲۶) کارن بولیاں

(۴) دراوڑ خاندان السنہ (DRAVIDIAN LANGUAGES) دراوڑی خاندان کی زبانوں کا تعلق زیادہ تر ہندوستان کے وسیع تر جنوبی حصّہ سے ہے اس خاندان کی زبانوں کے دوسری زبانوں کے ساتھ رشتے کے متعلق ماہرین لسانیات مختلف نظریات کے حامی ہیں۔ فنواگری' منہیجو داڑو' سمر پائی' کریٹی اور آسٹریلیا کی زبانوں سے دراوڑ زبانوں کے تعلق کو جوڑنے کی کوشش ایک زمانہ سے جاری ہیں اس ضمن میں کافی تحقیقاتی کام ہو چکا ہے اور جاری ہے۔ دراوڑی خاندان السنہ اپنی خصوصیتوں اور لسانی خوبیوں کی بناء پر سب سے الگ اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ اس خانوادہ کی جن (۱۲) زبانوں کا جان بیمز نے تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہیں۔ (۱) تلگو (۲) ٹامل (۳) کنڑی (۴) ملیالم (۵) تُو تو (۶) کدوگو (۷) تودو (۸) بودوگر (۹) اُرولار (۱۰) کوہاتر (۱۱) براہوئی (۱۲) سنگھالی سنگھالی کے ضمن میں بیمز نے لکھا ہے کہ میکس تلر نے اس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت کی بناء پر آریائی میں شمار کیا ہے۔

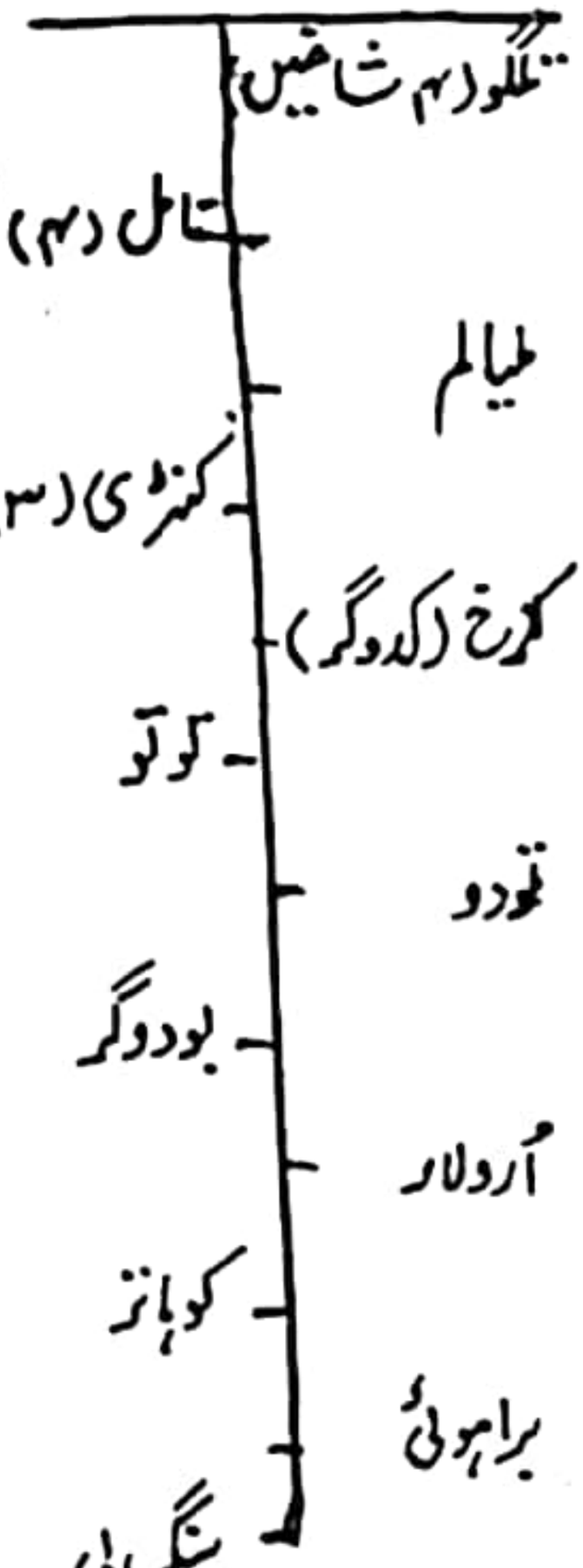

تلگو (TELUGU) دراوڑی خاندان کی مشہور زبان ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد چھ کروڑ سے متجاوز ہے اس کا علاقہ آندھرا اور تلنگانہ کے علاوہ متصل علاقوں پر مشتمل ہے۔ تلنگی زبان کا ادبی سرمایہ بہت وقیع ہے زیادہ تر شعری صورت میں پایا جاتا ہے اس زبان میں گیارھویں صدی عیسوی ہی سے تصنیف کا کام ملتا ہے اسی عہد کی ایک تصنیف بھی دستیاب ہوتی ہے۔ جو اب تک دریافت شدہ قدیم ترین کتاب ہے اس زبان کی کئی شاخیں ہیں جن میں بہت کم فرق و امتیاز پایا جاتا ہے تلگو زبان کی فصاحت اسے دراوڑی خاندان میں ممتاز کرتی ہے اس کی چند شاخیں یہ ہیں (۱) کومٹاؤ (۲) سالیوری (۳) شمالی سرکاری (۴) گولری وغیرہ۔

تامل (TAMIL) تامل زبان اپنی اہمیت اور قدامت کی بناء پر دراوڑی خاندان میں بہت ممتاز ہے ۔ یہ ہندوستان کے انتہائی جنوب اور جنوب مشرقی ساحلی علاقوں کے علاوہ سری لنکا کے نصف شمالی علاقوں میں رائج ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد (۶ تا ۷) کروڑ نفوس پر مشتمل ہے تامل بہت قدیم اور ادبی حیثیت سے بلند پایہ زبان سمجھی جاتی ہے تامل ادب اپنے معیار کے اعتبار سے بہت وقیع ہے اس زبان کی خصوصیت ہے کہ اس میں بول چال روزمرہ کی زبان جدا ہے اور ادبی غرض وغایت کے لئے مستعمل زبان الگ ہے ۔ تامل چونکہ بہت پہلے ہی نشو ونما کی منزلیں طے کرکے ارتقاء کے زینوں پر قدم رکھ چکی تھی اس وجہ سے اس کا ادبی سرمایہ بہت وسیع اور قابل قدر ہے اس زبان کی کچھ تصانیف کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ (۲) ہزار سال سے زیادہ پرانی ہیں اسی سے اس زبان کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔ تامل کی (۴) مشہور شاخیں یہ ہیں ۔

پروکل : خانہ بدوش قبیلوں کی زبان ہے ۔

کسودا : نیلگری کے میدانی آبادیوں کی زبان ہے ۔

اردل : نیلگری کے قرب وجوار میں سکونت پذیر ایک ذات کی زبان ۔

جیمی : اس کی دو شاخیں : کیلنڈی اور برگنڈی ہیں ۔

ملیالم (MALAYALAM) اس کے بولنے کی تعداد (۲) کروڑ سے کہیں زیادہ ہے ۔ یہ زبان ہندوستان کے جنوب مغربی ساحلی علاقوں یعنی سرگودہ اور ٹریچنڈرم تک بولی جاتی ہے ۔ ابتداء میں اس کو تامل ہی کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا ۔ مگر علماء نے اس کے گہرے مطالعہ کے بعد اس خیال کی تردید کی اور اسے بالکلیہ جداگانہ اور آزاد زبان قرار دیا ۔ ملیالم میں بھی ادب کا ایک قابل لحاظ سرمایہ موجود ہے اور حالیہ عرصہ میں اس میں قابل قدر اضافہ بھی ہوا ہے اور اس کا سلسلہ جاری بھی ہے اس کے علیحدہ شاخیں نہیں ہیں پھر بھی یہ نحیرہ عرب میں اکثر جزائر میں رائج ہے ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک عرصہ تک یہ تامل کی تبع تھی مگر آج کل صورت حال بدل گئی ہے ۔ رسم خط شاعری اور نثری ادب میں اس نے اپنی علیحدہ اکائی منوالی ہے ۔

کنڑی (KANNARESE) دراوڑی خاندان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے کنڑی ایک جداگانہ حیثیت کی حامل زبان ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد (۴) کروڑ کے لگ بھگ ہے ۔ اس کا علاقہ ریاست کرناٹک اور اطراف واکناف پر مشتمل ہے ۔ اس کی مشہور شاخیں بڑک کوردمیا اور بیجاپوری ہیں ۔ کنڑی ادب بھی کافی قدیم ہے نویں صدی عیسوی میں تصنیف وتالیف کا ثبوت ملتا ہے ۔

اسی عہد میں حکومتی سرپرستی کی بنا پر کنڑی کو خوب فروغ ہوا۔ کنڑی کے زبانداتوں پر سنسکرت کا اثر نمایاں ہے۔ آج بھی کنڑی معیاری ادب کی پیش کشی میں کسی سے کم نہیں۔

کرخ (KIRGHIZ) اس کو کرد گو بھی کیا جاتا ہے اس کے بولنے والے بنگال کے مغربی علاقوں اور اڑیسہ کے جنوبی حصّوں میں آباد ہیں اس میں کسی ادبی سرمائے کا پتہ نہیں چلتا۔

براہوئی۔ دراوڑی خاندان کی اس زبان کا چلن بلوچستان میں ہے جہاں اس پر فارسی کا زیادہ دباؤ ہے اس میں فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں اس کے باوجود اس کا باقی رہنا خود ایک تعجّب خیز بات ہے۔

(۵) ملایائی خاندان (MALAYO - POLY - NESIAN LANGUAGES)

اس مشہور خاندان السنہ کا اثر و نفوذ براعظم ایشیا کے بعض ممالک کے علاوہ آسٹریلیا کے بعض علاقوں پر قائم ہے ملایائی خاندان اپنی بعض خوبیوں کی بنا پر سارے لسانی خاندانوں میں منفرد مقام کا حامل ہے۔ اس خاندان کی کئی زبانیں مختلف جزائر اور سواحلی علاقوں میں رائج ہیں۔ بعض ماہرین لسانیات ملایائی خاندان کا رشتہ آسٹرو ایشیائی سے جوڑتے ہیں جو بحرالکاہل کے خطّے میں نہایت مضبوط موقف کی حامل ہے۔ بہرحال ملایائی خاندان وسیع و عریض علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس خاندان کی ادبی تاریخ سنہ ۱۲۰۰ء سے دستیاب ہے۔ ملایائی خاندان کے ہمزاد، اوشنیا، پاپوان، آسٹریلیائی اور تاسمانیائی وغیرہ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ملایائی خاندان کو انڈونیشیائی خاندان کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ملایائی خاندان میں کافی عظیم الشان ادبی سرمایہ موجود ہے یہ خاندان ترقی یافتہ زبانوں پر مشتمل ہے اس خاندان کی یوں تو کئی شاخیں ہیں۔ ان میں مشہور ملیشیائی اور پولی نیشیائی ہیں چونکہ ملایائی کے بولنے والوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اس وجہ سے اس زبان میں عربی الفاظ محاورے وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں ملایائی کے ہمزاد خاندان اور شاخیں آج کل اس موقف میں ہیں۔

اوشینیا (OSINIAN) ملایائی خاندان کا اوشینیا زبان سے گہرا ربط و تعلق ہے اس وجہ سے اس کو آسٹرونیشیائی زبان سے بھی موسوم کیا جاتا ہے یہ جزائر اوشینیا میں بولی جاتی ہے۔ اس کی بھی کئی شاخیں ہیں۔

تاسمینیائی (TASMANIAN) یہ خانوادہ آج کل مفقود ہے۔

پاپوان (PAPWAN) یہ ایک امتزاجی زبان ہے اس میں سابقے اور لاحقے

دونوں رائج ہیں یہ زبان ساخت کے لحاظ سے منفرد ہے۔

آسٹریلیائی (AUSTRALIAN)

اس خاندان میں زبان کی دو جماعتیں ہیں شمالی اور جنوبی ہر جماعت میں کئی شاخیں ہیں لیکن بدقسمتی سے اب اس کے بولنے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے اندیشہ ہے کہ یہ زبانیں بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔

ملایائی خاندان السنہ

- ادشینیا کئی شاخیں
- پاپوان
- آسٹریلیائی
- ملیشائی
- پولی نیشیائی

ملایائی خاندان کی یوں تو کئی شاخیں ہیں اول الذکر تین زبانیں ملایائی کی ہمزاد ہیں ان میں مشہور ترین ملیشائی اور پولی نیشیائی ہیں۔

ملیشیائی (MALAY SIAN) ملایائی خاندان کی اہم شاخ ہے یہ زبان ملیشیا اور اطراف واکناف کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اس میں عربی الفاظ کثیر تعداد میں ملتے ہیں

پولی نیشیائی (POLYNESIAN) یہ بھی بے حد اہم زبان ہے اس میں ادبی ذخیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

۲۔ منڈا خاندان (MUNDA LANGUAGES) یہ خاندان السنہ کول سے بھی باور کیا جاتا ہے علما و لسانیات اس خاندان کا رشتہ و تعلق آسٹرک زبان سے بتلاتے ہیں آسٹرک فیملی ایشیائی شاخوں میں کول کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ منڈا یا کول بولیاں ہندوستان سے متعلق ہیں اس خاندان کا حلقہ اثر کافی وسیع ہے مغربی بنگال کے علاقوں کے علاوہ بہار، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ سے گزر کر مدراس کے ضلع گنجام (جنوبی ہند) تک یہ خاندان پھیلا ہوا ہے اس کے بولنے والے اگرچہ کہ دراوڑ بولیوں کے علاقوں میں گھرے ہوئے سے ہیں تاہم یہ اپنی انفرادیت اور لسانی شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس خاندان کی ایک شاخ شمال میں ہمالیہ کی پہاڑیوں میں شملہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ منڈا خاندان اپنی بعض اچھوتی خصوصیات کی بنا پر بے حد ممتاز خاندان ہے ہندوستان کی مقامی زبانوں پر جگہ جگہ اس کا گہرا اثر نمایاں ہے ڈاکٹر تارپور والا کے بموجب بہاری زبان میں فعل کی گردان کا پیچیدہ نظام اسی کی دین ہے۔ دوسری ہندوستانی زبانوں میں منڈا کے اثر کی وجہ سے کئی قواعدی امور ابھرے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف گنتی کے جیسی نظام کو بھی منڈا کا اثر

فرماتے ہیں۔ [1]

منڈا خاندان السنہ کی زبانیں ہندوستان کے بیشتر حصوں میں رائج ہیں۔ جن کی اجمالی کیفیت درج ذیل ہے

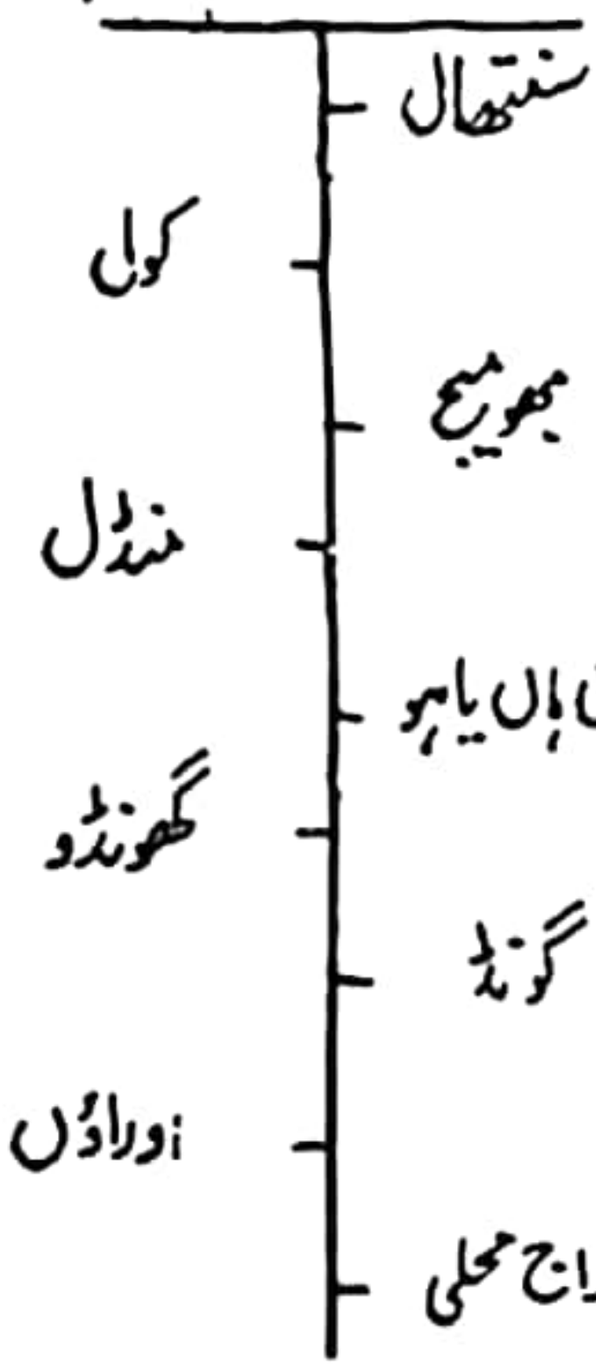

سنتھال (SANTALI) منڈا خاندان کی پہلی اور اہم شاخ ہے یہ عوام کے ایک بڑے طبقہ میں مقبول ہے۔ اس میں تحریر سرمایہ بھی موجود ہے۔

کول (KOOLIAN) یہ زبان اس خاندان السنہ کی بنیادی زبان ہے منڈا خاندان بعض دفعہ اسی کے نام پہ کول خاندان سے یاد کیا جاتا ہے۔

بھومیج (BHOMEJ) یہ بھی منڈا خاندان کی زبانوں میں مشہور شاخ مانی جاتی ہے۔

منڈل: یہ زبان چھوٹا ناگپور کے علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

کوی ہاں یا ہو: (YAO) منڈا خاندان کی اہم زبان ہے اس میں بلا کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

گھونڈو: (GANDA) یہ زبان سمبھل پور وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔

گونڈ: (GAUND) منڈا خاندان کی قبائلی زبان ہے یہ بے حد قدیم مانی جاتی ہے۔

اوراؤں (ARAON) یہ زبان سرگوجا اور اطراف واکناف میں بولی جاتی ہے۔

راج محلی (RAJ MAHALI) یہ زبان بھی منڈا خاندان کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے اس کا حلقہ اثر بھی کافی حد تک وسیع ہے [2]

۷۔ **امریکی خاندان**: (AMERICAN) امریکی خاندان السنہ دنیا کے تمام لسانی

---

[1] بحوالہ زبان وعلم زبان [2] بحوالہ ہندوستان لسانیات و ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

خاندانوں میں کئی وجوہ کی بناء پر ممتاز تر خاندان ہے یہہ بہت بڑا اور کئی ذیلی خاندانوں پر مشتمل ہے ان خاندانوں کی زبانیں منفرد کیفیات کی وجہ سے اپنی اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔ ساری زبانوں میں بنیادی خاندانی خصوصیت کا اشتراک انھیں ایک دوسرے سے مربوط اور متصل رکھتا ہے۔

امریکی خاندان آج دنیا کے ترقی یافتہ خانوادوں میں سب سے آگے ہے اس خاندان کی ذیلی شاخیں یہ ہیں۔

(۱) کینیڈا اور ممالک متحدہ کی زبانیں (۲) میکسیکو اور وسطی امریکہ کی زبانیں (۳) جنوبی امریکہ کی زبانیں: ایمی قبیل ذکر کینیڈا اور ممالک متحدہ کی زبانیں آنگوں کی ہوکا اور اردکوا نے دین اور وکوٹا ہیں۔ ان میں نے دین کی دو تین ذیلی شاخیں بھی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور زبان اتھاپاس کن زبان ہے جو شمالی امریکہ کے سب سے زیادہ وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان کینیڈا میں بحرالکاہل سے لے کر خلیج ہڈسن کے آگے ممالک متحدہ اور میکسیکو تک پھیلی ہوئی ہے۔

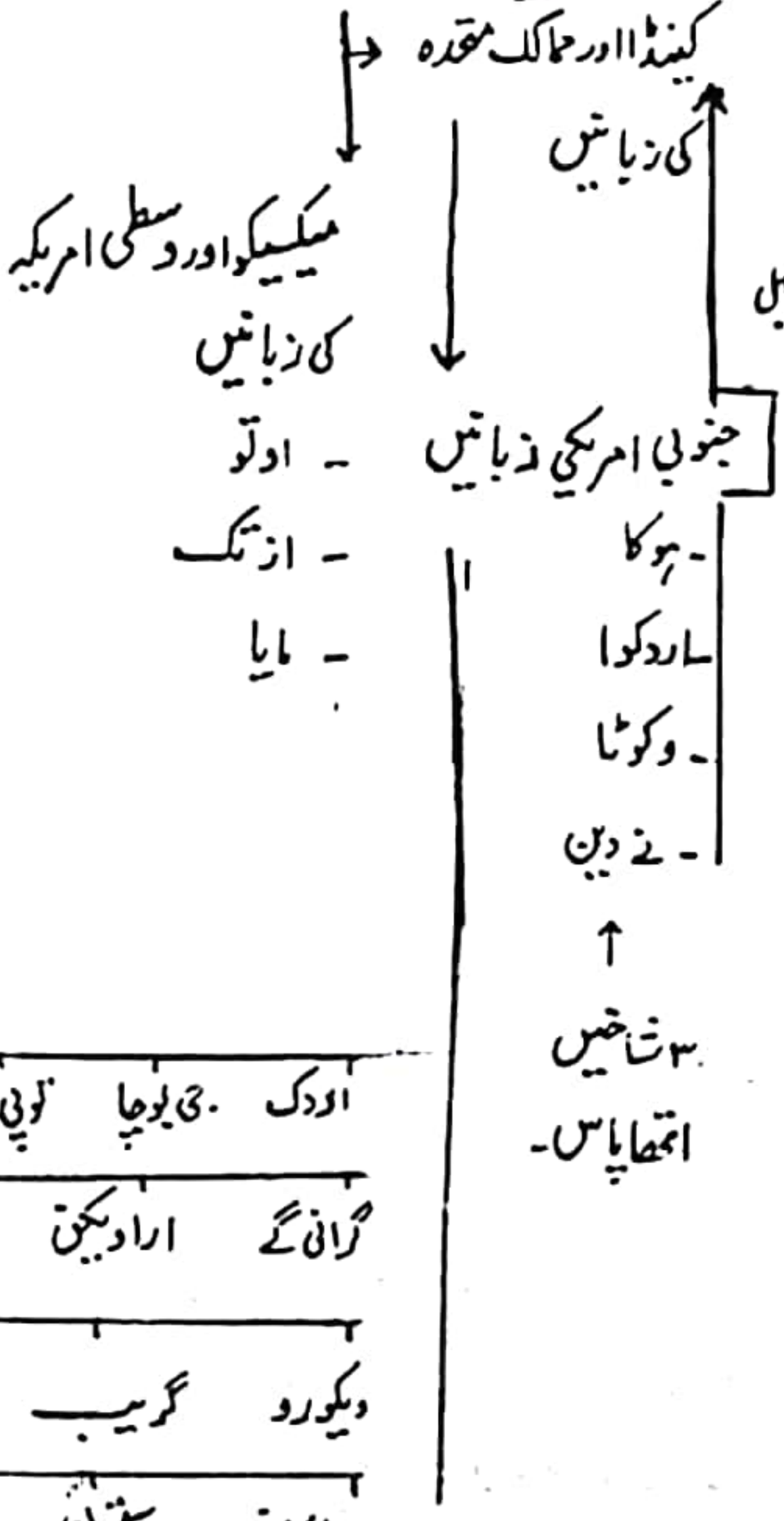

میکسیکو (MAXICO) اور وسطی امریکی کی زبانیں، = اُدتو ازتک اور مایا ہیں۔ ان کی بھی کسی بولیاں ہیں جن میں اُدتو ازتک کی ایک بولی ازتک بہت قدیم اور بے حد اہم ہے۔ مایا زبان کا پرانا ادب بھی ہے اور یہ امریکہ کی ان چند زبانوں میں شامل ہے جو لکھی جاتی ہیں۔

جنوبی امریکہ کی زبانیں (SOUTH AMEICAN) جی یوچا، توپی، گرانی گے، ارادیکن، دیکورو، گریب، روناسینی اور ستون اہم زبانیں ہیں ان میں ارادک خاندان کی بولیاں شمال میں فلوریڈا سے لے کر پراگوے تک اور مشرق میں پرایا سے لے کر امیزان .....

تک پھیلی ہوئی ہے [1]

۸۔ ہند یورپی خاندان: (INDO-EUROPEAN LANGUAGES) دنیا بھر کی زبانوں کی زمرہ بندی کے تحت جتنے خاندان مانے گئے ہیں ان سب میں ہند یورپی خاندان بہت بڑا، اہم ترین اور بے حد وقیع مانا جاتا ہے کیوں کہ یہ خاندان ایسے ذیلی کنبوں سے بنا ہے جس کے ہر گھرانے کی ان گنت شاخیں ہیں اور ہر شاخ خود کئی کئی زبانوں پر مشتمل ہے۔ پورے یورپ اور افریقہ، امریکہ کے اکثر ملکوں و نیز براعظم ایشیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں اس خاندان السنہ کی زبانیں بولی جاتی ہیں ادبی نقطۂ نظر سے بھی اس خاندان کو بے حد اہمیت حاصل ہے دنیا بھر کے ادب کا ایک بہت بڑا سرمایہ اس کی زبانوں میں موجود ہے اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دنیا کی مشہور اور ترقی یافتہ زبانیں ہند یورپی قبیلے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، فارسی، سنسکرت اور اردو اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان زبانوں میں جدید علوم و فنون کا تحقیقاتی مواد بھی ہے اور قدیم ادب کا اعلیٰ ترین اثاثہ بھی۔ اس لحاظ سے اس خاندان کی اہمیت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ ہند یورپی خاندان کی زبانیں بنیادی طور پر بڑی مشابہت رکھتی ہیں اگرچہ کہ بظاہر ان میں بُعد اور فرق نظر آتا ہے۔

علماء لسانیات نے آریہ قبائل کا اسی خاندان السنہ سے رشتہ قائم کیا ہے آریائی زبانوں کے مطالعہ نے اس خیال کو تقویت پہنچائی ہے کہ ان کی آپسی مماثلت و نیز ہند یورپی خاندان کی دوسری شاخوں کی زبانوں کے ساتھ ان کی مجموعی مشابہت یہ ثابت کرتی ہے کہ آریہ جو زبانیں بولتے تھے وہ بہرحال اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ان کا منبع ہند یورپی ہی ہے۔ اس نظریہ کے حامی لگ بھگ تمام ماہرین و محققین ہیں۔ البتہ آریہ قوم کی ابتدائی بود و باش کہاں تھی اس بارے میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ آریہ قوم کے لوگ وسطی ایشیاء کے وسیع میدانی علاقوں میں بستے تھے۔ کثرت آبادی اور معاشی ضروریات نے انھیں نقل مقام پر مجبور کیا وہ مختلف گروہوں کی شکل میں یورپ کے دور دراز مقامات، جرمنی، ایران اور ہندوستان وغیرہ میں جا ڈیرہ جمایا اور مستقل طور پر بس گئے وہ اپنے ساتھ اپنی معاشرت کے اصول اپنے عقائد اور اپنی زبانیں بھی لے گئے۔ چوں کہ ان زبانوں کے خواص اور بنیادی باتیں ہند یورپی سے بڑی حد تک مشابہت کی حامل ہیں اس وجہ سے آریہ قوم کی زبانیں اسی خاندان السنہ سے رشتہ رکھتی ہیں۔

ہند یورپی خاندان کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ تنہا یہ خاندان السنہ

---

[1] بحوالہ زبان اور علم زبان

آٹھ دس بڑے بڑے لسانی کنبوں پر مشتمل ہے۔ ہندیورپی خاندان کی اہم شاخیں یہ ہیں۔
(۱) ہندایرانی (۲) آرمینی (۳) البانوی (۴) ہیلینی (۵) بلقانی (۶) اٹالوی (۷) کیلٹک (۸) ٹیوٹونی یہ ترتیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے "ہندوستانی لسانیات" میں دی ہے۔

ڈاکٹر سید احتشام حسین صاحب نے "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے مقدمہ میں اس کی تہذیب اس طرح کی ہے۔ (۱) آرمینی (۲) بالٹوسلانی (۳) البانوی (۴) یونانی (۵) اطالوی (۶) کیلٹک (۷) ٹیوٹونی (۸) ہندایرانی۔

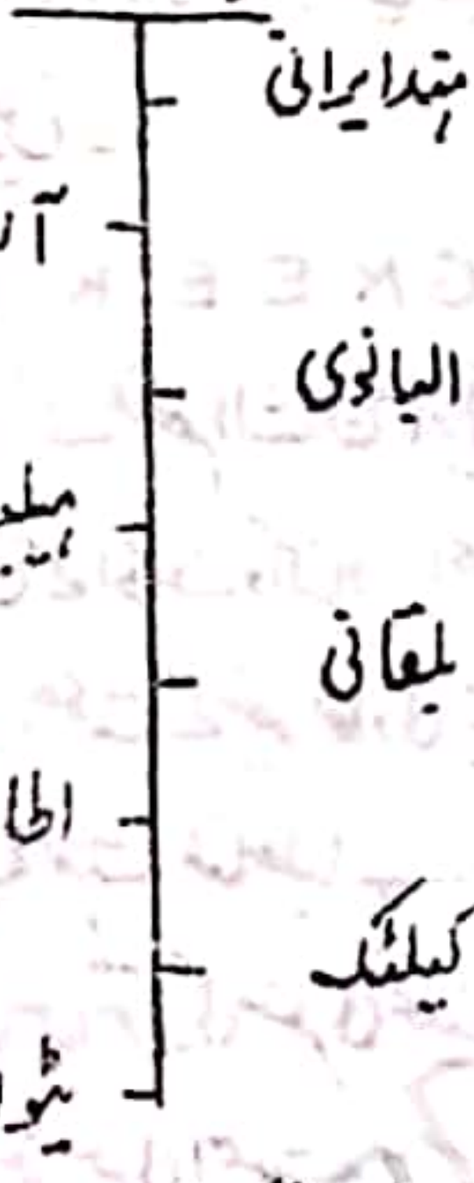

پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب زبان اور علم زبان میں ہندیورپی زبانوں کو (۲) بڑے گروہوں میں تقسیم کرکے ان کی یوں درجہ بندی کی ہے۔ (۱) کنتم گروہ (۲) شتم گروہ اوّل الذکر گروہ کے تحت چھ ذیلی لسانی کنبے رکھے ہیں۔ (۱) کلٹی (۲) جرمانی یا ٹیوٹونی (۳) اطالوی (۴) یونانی یا ہیلینی (۵) ہٹائیٹ (۶) طخارین یا توخاری اور موخرالذکر گروہ کی زبانیں (۷) البانوی (۸) بالٹوسلانی (۹) آرمینائی (۱۰) آریائی یا ہند اریائی۔

ہندیوروپی خاندان السنہ کی شاخیں

آرمینی (ARMENIAN) ہندیوروپی خاندان السنہ کا یہ ذیلی خاندان ایشیائے کوچک میں اپنا اثر رکھتا ہے۔ اس علاقے میں رہنے والے لاکھوں لوگ اس کنبہ کی زبانیں بولتے ہیں۔ آرمینی کا قدیم تاریخی تسلسل ہے اس کے قدیم ترین نمونے مینجی حروف کی شکل میں دریافت ہوئے ہیں۔ یوں تو یہ دنیا کی قدیم ترین زبانوں کا مجموعہ ہے لیکن پچھلے دو ہزار سال سے اس کی نوعیت بدل گئی ہے کیوں کہ اس میں مسیحی تعلیمات کا قدیم ذخیرہ پایا جاتا ہے یہ چرچ کی پسندیدہ زبانیں قرار پاتی تھیں

آرمینی کا زمانہ قدیم ہی سے ایران سے گہرا واسطہ رہا ہے اس وجہ سے اس پر فارسی کا غالب اثر دکھائی دیتا ہے۔ فارسی کے توسط سے عربی الفاظ اور روزمرہ بھی اس میں مستعمل ہیں۔ فارسی کے سابقے اور لاحقے بھی آرمینی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

آرمینی کی کئی شاخیں ہیں جن میں اکثر یوروپ کے سرحدی حصوں اور ترکی وغیرہ میں رائج ہیں اس میں معیاری ادبی ذخیرہ بھی دستیاب ہے تاہم اس کتبہ کی بعض شاخیں صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہیں بعض کے آثار باقی ہیں۔

یونانی (GREEK) ہندیوروپی خاندان کی اس شاخ کو ہیلینی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یونانی زبان ایک عظیم الشان تاریخی ورثہ رکھتی ہے۔ یہ نہایت ترقی یافتہ کتبہ ہے اس میں دیسوں شاخیں ہیں جو یونان کے اطراف واکناف بالخصوص یونانی جزائر میں رائج تھیں۔ یونانی کتبہ اپنے ادبی خائر معیاری علمی اثاثے اور فلسفہ وحکمت کے عظیم مواد کی بناء پر بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یونانی کا لہجہ ہندیوروپی خاندان میں آریائی زبانوں میں بہت ممتاز ہے۔ یونانی ادب کا باعث افتخار سرمایہ زیادہ تر شعری صورت میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ہومر کی شعری تخلیقات بہت ہی اہم سرمایہ ہیں۔

یونانی کی غیر معمولی اہمیت کا سبب اس کا ادبی علمی خزانہ ہے جو شاعری، نثری تخلیقات، علوم عصریہ فنون جدیدہ، فلسفہ، حکمت اور فن طب پر مشتمل ہے۔ یہی خصوصیت اس کتبہ کو دیگر خاندانوں سے ممیز کرتی ہے۔ یونانی کا ارتقاء کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ہر دور شاندار ادبی ولسانی ارتقاء سے عبارت ہے قدیم وجدید یونانی کے درمیان کے ادوار اپنے کلاسیکی اور عبوری ادب کی بناء پر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یونانیوں نے ادیوں پر ذہنی غلبہ پالیا تھا، اگرچہ کہ انھیں سیاسی ہزیمت اٹھانی پڑی تھی، اس کے نتیجہ میں یونانی کے اثرات رومن زبان پر نمایاں ہیں۔ قدیم یونانی کے مقابل جدید یونانی نے ترقی وعظمت کے کمال پر نظر آتی ہیں۔ آج بھی جدید یونانی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں موجود ہے۔

البانوی (ALBANIAN) یہ ایک قدیم ترین قوم کی زبان کا باقی ماندہ اثاثہ ہے یہ نخیرہ اڈریاٹک کے مشرقی علاقے کے ایک وسیع وعریض حصہ میں بولی جانے والی زبانوں کا کتبہ ہے اس زبان پر ترکی کے اثرات نمایاں ہیں اس کی کئی شاخیں مختلف قبیلوں میں مروج ہیں۔ اسی وجہ سے اس کے بولنے والوں کی صحیح تعداد کا تعین مشکل ہے۔

اطالوی (ITALIAN) اس کنبہ کو دو ذیلی گھرانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) آسکن ایرین (۲) قدیم لاطینی اطالوی کنبہ کی زبانوں کو رومانی (رومن) زبانیں بھی کہا جاتا ہے قدیم لاطینی رومن زبانوں کا مجموعہ ہے ان میں رومینائی۔ رہائٹو رومانی، ہسپانوی۔ فرانسیسی اور پرتگالی زبانیں شامل ہیں۔ یہ ساری زبانیں انتہائی ترقی یافتہ، علوم و فنون سے مزین اور ادبی شہ پاروں سے مالا مال ہیں ان زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ اطالوی کنبہ کی کئی زبانیں مفقود ہیں تاہم جتنی زبانیں موجود ہیں وہ ہر اعتبار سے نہایت بلند پایہ اور اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کنبہ کی بعض زبانوں کو بین الاقوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہے۔

اطالوی کنبہ کی شاخیں

- آسکن ایرین
- قدیم لاطینی
  - رومینائی
  - رہائٹو رومانی
  - ہسپانوی
  - فرانسیسی
  - پرتگالی

لاطینی گھرانہ چوں کہ رومن زبانوں سے متشکل ہوا ہے اس وجہ سے اس کی ایک خاص انفرادیت ہے۔ روم کے رہنے والے چوں کہ عیسائی مذہب کے پیرو تھے لہذا مسیحیت کا تمام تر مذہبی مواد رومن زبانوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ لاطینی گھرانہ کو اس اعتبار سے مرکزیت حاصل ہو گئی مذہبی ادب کی بنا پر اس کی وقعت میں بے حد اضافہ ہوا۔ چرچ سے نسبت نے اس کو ترقی اور توسیع کے نادر مواقع عطا کئے جو کسی اور لسانی کنبہ یا زبان کو حاصل نہ تھے۔ یوروپ کی اور زبان پر لاطینی کے گہرے اثرات اسی کا نتیجہ ہیں۔ الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کے ضمن میں تقریباً ساری یوروپی زبانیں لاطینی کی مرہون احسان ہیں۔ اطالوی زبانوں کے علاقے میں غیر لاطینی زبانوں کے رواج نے رومن زبانوں کو ایک نئی شکل و صورت، رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔

بلقانی (BALTIC LANGUAGES) اس لسانی کنبہ کو بالٹو سلانی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کنبہ کی قدیم زبانیں اگرچہ کہ آج کل ناپید ہیں۔ اس کی باقی ماندہ زبانوں کو دو مختلف شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) لیتھوانائی (۲) لٹک ان کی ہر شاخ کئی زبانوں پر مشتمل ہے۔ بلقانی کی دو مشہور شاخوں کی بنیادی زبانیں چرچ سلانی بلغاری، روسی، چیکوسلواکی، سورابی اور پولی ہیں۔

چرچ سلانی : مذہبی اغراض سے مخصوص گروہ ہے اس میں مذہبی کتب، تعلیمات

مسائل اور انجمن مقدس کے مختلف تراجم ہیں۔ اس وجہ سے اس زبان کا ایڈا احترام ہے۔

روسی: اس کی بھی کئی قسمیں ہیں جو روس کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں رائج ہیں۔

چیکوسلواکی: یہ ایک معیاری زبان ہے اس میں بہترین ادبی ذخیرہ موجود ہے۔

پولی: اس زبان میں ادب کا اعلیٰ معیاری مواد ملتا ہے اس لحاظ سے یہ بہت بلند پایہ ہے

ان بلقانی زبانوں کو مختلف قسم کے حالات اور موانعات کا سامنا کرنا پڑا مگر بہرحال ان زبانوں نے اپنی سلامتی و بقا کی خاطر ہر قسم کی جدوجہد کی اور ترقی کے زینے طے کرتی رہیں ان زبانوں کے بولنے والوں کی کاوشیں بے کار نہ ہو سکیں۔

بلقانی کنبہ کی شاخیں

لٹک
لیتھوانائی
چرچ سلانی
سورابی
بلغاری
روسی
چیکوسلواکی
پولی

کیلٹک CELTIC: ہندیورپی خاندان السنہ کی ایک اہم شاخ ہے اس کنبہ کی زبانیں ایک زمانہ میں یورپ کے ایک بہت بڑے حصے میں رائج تھیں ان کے اثر و نفوذ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایشیائے کوچک تک بھی ان کے بولنے والے موجود تھے آج بھی برطانیہ کے اکثر جزائر میں اس کنبہ کی اکثر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں مشہور ائرش، اسکاچ گیلی، کارنش اور بریٹنی ہیں۔ کیلٹک کنبہ میں ادبی سرمائے بہت بڑے پیمانہ پر موجود ملتا ہے

آئرش (IRISH) اس زبان میں قدیم ادب کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا کام بڑے زور و شور سے کیا جا رہا ہے۔ اس زبان کا حلقہ اثر بھی کافی وسیع ہے۔ اس زبان کی ہمزاد دوسری زبانوں میں بھی اسی طرح کے رجحانات ملتے ہیں۔

یہ لسانی کنبہ ایک عظیم الشان ماضی رکھتا ہے مگر بدقسمتی سے آج یہ سکڑتا ہی جا رہا ہے اس کنبہ کی زبانوں کے ادبی سرمائے معیارات اور تاریخی پس منظر کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس کنبہ کی زبانوں کے بولنے والے ان کے دوبارہ رواج اور پھیلاؤ کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔

ٹیوٹونی (TOTONIC) ہندیورپی خاندان السنہ کی ہر شاخ یا ذیلی کنبہ اپنے وسیع حلقہ خدمت، دائرہ کار مقبولیت اور ارتقاء کی بناء پر الگ الگ خصوصیات کا حامل ہے لیکن ان میں ٹیوٹونی کنبہ کی بات ہی اور ہے یہ کنبہ اپنے شاندار ماضی کا تہ ماضی ترقی پذیر ۔۔۔

تاریخ 'پھیلاؤ' ادبی معیار اور عصری علوم وفنون کے سرمائے کی بناء پر سب میں ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اس کنبہ کی بعض قدیم شاخیں آج کل مفقود ہیں تاہم جتنی زبانیں آج باقی ہیں وہ اپنی جگہ نہایت بلند پایہ اعلیٰ معیاری اور بہترین ادبیت کی حامل ہیں۔ ان زبانوں میں قدیم ترین گاتھی، آلس لینڈی نڈرلینڈی اور ولندیزی ہیں اور نہایت ترقی یافتہ زبانیں جرمن اور انگریزی ہیں۔

جرمن (GERMAN) ٹیوٹونی قبیلہ جرمانی بھی کہلاتا ہے۔ جرمن زبان علمی وفنی اعتبار سے بے حد اہم ہے اس زبان میں ادب کا اعلیٰ ترین سرمایہ موجود ہے۔ گذشتہ صدی اور جاری صدی کے اوائل میں یہ زبان عروج وکمال کی انتہائی منزلوں پر پہنچ چکی تھی لیکن جنگِ عظیم کے بعد اس کا وہ اثر ونفوذ باقی نہ رہا تاہم اس کا شاندار ماضی کا اثاثہ اس کی اہمیت کو کبھی بھی کم نہ کرے گا۔

انگریزی (ENGLISH) اس زبان میں دنیا بھر کے علوم وفنون کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ انگریزی زبان دنیا کے مقبول ترین زبانوں میں صفِ اوّل میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ صرف یوروپ ہی نہیں بلکہ تمام براعظموں میں یکساں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ زبان بین الاقوامی سطح پر رابطہ کی زبان بن گئی ہے۔ دنیا بھر کے بیسیوں ملکوں میں اس کی سرکاری حیثیت مانی جاتی ہے۔ برطانیہ کے سیاسی عروج کی بناء پر اگرچہ انگریزی کو سابق میں بہترین مواقع ملے مگر برطانیہ کے اقتدار کے دائرہ کی تنگی کے باوجود انگریزی کی مقبولیت ختم نہ ہو سکی بلکہ دن دونی رات چوگنی ترقیات کا سلسلہ جاری ہے اس کا پھیلاؤ دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے

انگریزی زبان میں ادب کا ایک انتہائی قیمتی سرمایہ اس کو دیگر تمام زبانوں سے ممیّز کرتا ہے۔ اس میں دنیا کا اعلیٰ ترین ادبی مواد ملتا ہے۔

ہند ایرانی (INDO - IRANIAN LANGUAGES) ہند یورپی خاندان السنہ کی سب سے عظیم وقدیم شاخ ہند ایرانی ہے بل کہ اس خاندان کی صحیح جانشین اور بنیادی خصوصیات کی

حامل شاخ ہے۔ اس کنبہ کی سینکڑوں زبانیں دنیا بھر کے ایک وسیع و عریض علاقہ میں رائج ہیں۔ اس کنبہ کی کئی اہم شاخیں ہیں۔ ان کی تقسیم منطقہ واری بنیادوں پر کی جاسکتی ہے ماہرین نے انھیں تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی مشرقی، جنوب مشرقی اور مغربی۔

ہند ایرانی کنبہ کی شاخیں

- مشرقی۔ ایرانی
- مغربی پشاچہ
- جنوب مغربی۔ ہندآریائی

ہند ایرانی زمانہ قدیم میں بھی انتہائی ترقی یافتہ تشکل میں موجود تھی اس کا ثبوت وہ آثار ہیں جو کھدائیوں کے دوران تحریری صورت میں برآمد ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے مشرقی کو ایرانی یا ختنی مغربی کو پشاچہ اور جنوب مغربی شاخ کو ہندآریائی سے موسوم کیا ہے جبکہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس خاندان ہی کو آریائی کہا ہے بجائے ہند ایرانی کے اور اس کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک ایرانی اور دوسرا ہندوستانی۔ موخر الذکر کو ہندآریائی سے موسوم کیا ہے۔

ہند ایرانی کنبہ کئی ذیلی گھرانوں پر مشتمل ہے ایران، ہندوستان اور پاکستان کی لسانی تاریخ کا اس سے نہایت گہرا رشتہ ہے اس خاندان کی زبانیں دنیا کے ادب کا بہترین اور منتخبہ حصہ رکھتی ہیں۔ جن میں فارسی اور سنسکرت کے ادبی اور مذہبی سرمائے کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس کنبہ کی اکثر زبانیں ہندوستان اور ایران ہی میں پرورش پائی ہیں۔

ایرانی: (PERSIAN) اس گھرانے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کا قابل قدر ادب موجود ہے چوں کہ ملک ایران زمانہ قدیم میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اس وجہ سے دنیا بھر کے خیالات یہاں پہنچتے اور وہ ایرانی زبانوں میں منتقل ہو کر اس کے علمی و ادبی خزانے کو مالا مال کرتے تھے۔ اگرچہ وہ کئی دفعہ سیاسی حالات کی بناء پر تباہ و تاراج ہوئے مگر اس کے باوجود ایرانی زبانوں میں وہ ادبی علمی اور مذہبی ذخائر دوبارہ اکٹھا ہوتے گئے۔ اس کی چار شاخیں بے حد مشہور ہیں (۱) غلچہ (پامیری زبان) (۲) وخی بولیاں (۳) سرنجونی (۴) میخانی۔ پشتو اور بلوچی زبانیں بھی اسی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی مغربی شاخ فارسی کہلاتی ہے فارسی میں قدیم و جدید کے علاوہ کُردی زبان بھی شامل ہے۔ جدید فارسی نے اپنا اثر اکثر دوسری زبانوں پر ڈالا ہے بالخصوص اردو پر اس کا گہرا اثر ہے۔

پشاچہ: (PUSHACHA) ہند ایرانی کی دوسری اہم شاخ پشاچہ ہے۔

یہ شمالی مغربی سرحدی ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے (۳) ذیلی گروپ ہیں (۱) کافر (۲) چترالی یا کھوار (۳) شنا۔ کافر زبان کی بولیوں میں یشکلی' دی الا کلا سب گوارپتی اور لیتی اور شنا کی بولیوں میں مختلف چھوٹی چھوٹی بولیوں کے علاوہ کوہستانی زبان کی (۳) شاخیں اور کشمیری زبان شامل ہے۔ بعض ماہرین کوہستانی اور کشمیری کو پشاچہ کنبہ کی راست شاخیں کہتے ہیں[1]

ہند آریائی لسانی کنبہ (INDO-ARIAN LANGUAGES)

ہند آریائی ہند یوروپی خاندان السنہ کی زبانوں کی ہندوستانی شاخ جو ہند ایرانی کی حقیقی جانشین اور ایرانی کی برادر کہلاتی ہے ہند آریائی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے ان زبانوں کے بولنے والے آریہ کہلاتے ہیں انکا اصلی وطن ہندوستان نہیں بل کہ یہ لوگ نقل مقام کر کے ہندوستان آکر بس گئے تھے ان کے وطن کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ زیادہ تر اسی پر اتفاق ہے کہ یہ لوگ لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال پہلے وسطی ایشیا (MIDDLE ASIA) سے ہجرت کر کے گروہ در گروہ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ آریہ قوم ایک قدیم اور متمدن تاریخ رکھتی ہے ایشیائے کوچک میں اس صدی کے اوائل میں جو آثار دریافت ہوئے ہیں ان سے ان کی تہذیبی معاشی' اور مذہبی زندگی کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ لوگ وسطی ایشیا کے ممالک میں نہایت مہذب زندگی کے حامل تھے۔ کثرت آبادی معاشی مسائل اور حالات زمانے نے ان پر جب عرصہ حیات تنگ کر دیا تو وہ اپنے اصلی وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اور مختلف ٹکڑیوں کی شکل میں ہجرت کرنے لگے۔ ڈاکٹر سونیتی چیٹرجی نے کہا ہے کہ وہ دو بڑے گروہوں میں بٹ کر مغرب اور جنوب مشرق کی سمتوں میں روانہ ہوئے[2]

ہند یوروپی زبانیں بولنے والی آریہ (ARIAN) قوم کا ایک گروپ جو مغرب کی طرف چل نکلا وہ مختلف خاندانوں اور کنبوں کی شکل میں سارے یوروپ میں پھیل گیا۔ جہاں آرمینی' یونانی' البانی' کیلٹک' جرمن اور دیگر لسانی خاندانوں کے وجود کا سبب بنا۔

دوسرا گروہ جنوب مشرق کی جانب نکلا اور یہ دو شاخوں میں منقسم ہو کر ایران اور ہندوستان میں داخل ہوا۔ یہاں پہ ایرانی' پشاچہ اور آریائی زبانیں عالم وجود میں آئیں اور

---

[1] ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر زور [2] بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقاء (انگریزی) سونیتی کمار چیٹرجی بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ناشر سید بکڈپو چھتا ایڈیشن۔

بعض کے مستقلاً یہیں جا بسنے کا ثبوت مختلف آثار اور حقائق سے ملتا ہے۔ ایران میں آریائی تہذیب اور ان کے لسانی ارتقاء کی ایک طویل تاریخ ہے اور خود ایک مستقل موضوع ہے۔

ایران ہی میں ہندیورپی بولنے والی قوم آریہ نے ہندایرانی کے روپ میں ایک جدید لسانی خاندان کی تشکیل کی۔ یہی ہندایرانی ہی جنوب مشرق کے تمام علاقوں میں رائج آریائی زبانوں کی بنیاد قرار دی جاتی ہے۔ ہند آریائی کا اسی سے راست تعلق ہے [1]

آریاؤں کے ہندوستان میں آنے کے متعلق سنین کا صحیح تعین مشکل ہے کیوں کہ یہ ایک ہی وقت میں سارے کے سارے مل کر نہیں آگئے بل کہ رفتہ رفتہ مختلف جتھوں کی شکل میں کئی سو سالوں میں آتے رہے، تاہم مورخین نے ڈھائی ہزار تا ڈیڑھ ہزار قبل مسیح کے درمیان کا زمانہ ان کی آمد کے متعلق بتایا ہے۔ یہاں پر آریہ سیاسی دبدبہ اور عسکری طاقت کے ساتھ نہیں آئے اور نہ اقتدار و حکومت ان کا مقصد تھا بل کہ محض آبادکاری، تلاش معاش اور فراہمی روزگار ان کی غائت تھی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ان کو یہ آسانی داخلہ نصیب نہ ہوا بل کہ مقامی باشندوں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ بعض دفعہ سخت معرکہ آرائیاں بھی ہوئیں۔ وقتاً فوقتاً جب بھی کوئی نیا جتھہ آتا اسے مقامی لوگوں کے ساتھ کشاکشی کرنی پڑتی۔ بالعموم آنے والے کامیاب ہوتے اور اپنے لئے یہاں جگہ پیدا کر لیتے۔ جب تک وہ ایک متحدہ طاقت نہ بن گئے یہی صورت حال رہی پھر آہستہ آہستہ یہ بات باقی نہ رہی بعد میں آنے والوں کے لئے آسانیاں پیدا ہوتی گئیں۔

ہندوستان کی قدیم آبادیاں بھی یہاں کے اصلی باشندے نہ تھے وہ بھی بہت پہلے بیرونی علاقوں سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر آفریقہ اور فلسطین وغیرہ سے آنے والوں کی اکثریت تھی۔ ان کے بعد آسٹرک (AUSTRIC) قبائل آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ہندوستان کے قدیم باشندگان کے متعلق جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک متمدن معاشرہ رکھتے تھے ان کے پاس ایک عمدہ مذہبی تصور اور نظام موجود تھا۔ آریاؤں کو یہاں ایک متمدن اور مذہبی اعتبار سے مکمل ماحول ملا۔ آریاؤں کے بزور داخلہ کے بعد مقامی باشندوں اور نووارددوں کے درمیان زیادہ دنوں تک اجنبیت باقی نہ رہی آہستہ آہستہ رواداری فضا پیدا ہونے لگی وہ ایک دوسرے سے مفاہمانہ رویہ اپنائے جس کا اثر

---

[1] زبان اور علم زبان، پروفیسر عبدالقادر سروری

ان کی اجتماعی زندگی پر پڑنے لگا۔ طرز معاشرت، مذہبی عقائد اور زبانیں آپس میں میل جول سے متاثر ہونے لگیں۔ یہ اور بات ہے کہ آریہ لہجہ میں اپنی انفرادیت اور شناخت کی برقراری کے لئے مقامی باشندوں کے ساتھ ویسے روادار باقی نہ رہے جیسے یہاں قدم جمانے تک تھے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے مقدمہ تاریخ اردو میں لکھا ہے کہ آریاؤں کے ساتھ ان کی ترقی پذیر زبانیں بھی یہاں آئیں تھیں ان زبانوں میں ان کے مذہب، معاشرتی اصول اور علوم وفنون کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی تھا اس وجہ سے مقامی زبانوں پر ان کا فوری اور گہرائی کے ساتھ اثر مرتب ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے بموجب آریاؤں کا رسم الخط "براہمی" بے حد ترقی یافتہ تھا ہندوستان میں اردو اور کشمیری کو چھوڑ کر تمام زبانوں کے رسم الخط اس سے فیضیاب ہوئے ہیں کہ ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کا ماخذ آریہ رسم الخط براہمی ہی ہے خود براہمی نے یہاں ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی ہیں [1]

آریائی زبانوں کے ارتقاء کا تسلسل ایران سے پنجاب تک قائم ہے ایرانیوں اور ہندوستانیوں میں سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی مماثلتوں نے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی کہ آریا دراصل ان دونوں ملکوں ہی میں اپنی تمدنی زندگی کی نشو ونما اور تکمیل کر چکے۔

ہند آریائی زبانوں کے وسیع تر مطالعہ کی اغراض کے پیش نظر ان کی زمانی ومکانی تقسیم لازمی ہے۔

زمانی تقسیم :۔ (۱) عہد قدیم (۲) عہد وسطیٰ (۳) عہد جدید

مکانی تقسیم :۔ (۱) شمال مغربی (۲) جنوب مغربی (۳) وسطی (۴) مشرقی (۵) جنوبی۔

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب

باب سوم

ہند آریائی زبانوں کی زمانی تقسیم

PERIODWISE CLASSIFICATION OF INDO-ARIAN LANGUAGES.

عہد قدیم = یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ آریائی قبیلے مختلف اوقات میں مختلف گروہوں کی شکل میں ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اپنے ساتھ وہ ایک مشترک زبان لائے تھے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی خاص لسانی سانچہ میں ڈھلی ہوئی نہ تھی بل کہ اپنی آوازوں کی کثرت الفاظ کی بہتات اور معنیات کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ گویا آریائی زبان کے عہد قدیم کا روپ تھا۔ اس عہد میں آواز اور الفاظ کے پھیلاؤ میں لامحدودیت کے باوجود آریائی زبان نہ صرف بول چال بل کہ تحریری شکل میں بھی ملتی ہے۔ اس میں مذہبی منتروں کا لکھا جانا اس کی اہمیت کا اظہار کرتا ہے یہ منتر کب لکھے گئے عام خیال یہ ہے کہ آریاؤں کے قیام ایران اور ورود ہند کے زمانے میں وہ ضبط تحریر میں لائے گئے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے مشرقی ایران سے پنجاب تک آریائی زبان کے ارتقاء کے تسلسل کا ذکر کیا ہے۔ بنگالی زبان کی ابتداء اور ارتقاء جلد اول ص ۳۹) چٹرجی کے حوالے سے انہوں نے قندھار سندھ کے کنارے اور جمنا کی وادی کی ان مذہبی منتروں کی تصنیف

ہند آریائی زبانوں کی زبانی تقسیم

- عہد قدیم
- عہد وسطی
- عہد جدید

عہد قدیم

- سنسکرت دور
  - ویدک دور
  - قدیم پراکرت دور

کے مقامات کے طور پر نشان دہی کی ہے [1]

ویدوں کے منتر بتاتے ہیں کہ ان کی زبان سادگی کا عمدہ نمونہ اور بالکلیہ غیر بنا دٹی نوعیت کی تھی۔ رگ وید کے منتر اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ویدک دور (VEDIC PERIOD) آریہ زبان کے عہد قدیم کے زمانہ کا حقیقی تعین مشکل ہے کیوں کہ کوئی بھی پھیلی ہوئی زبان کسی خاص اصول کے تحت ایک ساتھ ہر جگہ ارتقائی عمل کو جاری نہیں رکھ سکتی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک مقام پر جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ضروری نہیں کہ ہر مقام پر اسی طرح کا تغیر واقع ہو یہ ساری باتیں آہستہ آہستہ رونما ہوتی ہیں مثلاً [illegible] اور پنجاب کے علاقوں میں زبان کی جو تبدیلیاں ہوئی ہوں گی ضروری نہیں کہ ملک کے وسطی اور مشرقی حصوں میں اسی وقت ویسی ہی تبدیلیاں آئی ہوں یہ الگ بات ہے کہ تبدیلیوں کا اثر جلد یا دیر سے پوری زبان کے ڈھانچہ پر مرتب ہو۔ بہر حال عہد قدیم کے متعلق مختلف ماہرین مختلف مدت کا تعین کرتے ہیں تاہم یہ محض قیاس ہے کیوں کہ لسانی تاریخ میں سنین کا تعین قطعیت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے آریہ زبان کا عہد قدیم (۱۵۰۰) ق م سے (۵۰۰) ق م تک بتایا ہے [2]۔

ڈاکٹر زور مرحوم نے بھی لگ بھگ یہی طریقہ بتایا ہے [3]۔

پروفیسر سروری صاحب نے (۱۵۰۰) ق م تا (۶۰۰) ق م بحجہ (۹۰۰) سو سال کی مدت کو آریائی کے عہد قدیم کا زمانہ کہا ہے [4]

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے "ہند آریائی اور ہندی" میں عہد قدیم (۱۵۰۰) ق م تا (۶۰۰) ق م ۹ سو سال مدت فرض کیا ہے [5]

اکثر محققین نے ویدک زبان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی عوامی حیثیت اور عام بول چال کی زبان ہونے کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت کو نہیں گھٹایا ہے چالو زبان اگرچہ کہ ادبی نہیں مانی جاتی لیکن ادبی زبان کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوا کرتا ہے۔ عہد قدیم کی ویدک زبان تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ تقریباً تمام آریائی قبائل میں بولی جاتی تھی۔

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۳۲ چھٹا ایڈیشن ڈاکٹر مسعود حسین خاں، سرسید بکڈپو علی گڈھ [2] ہندستانی لسانیات ڈاکٹر زور مرحوم [3] زبان اور علم زبان [4] ہند آریائی اور ہندی

ہندوستان کے وسیع و عریض علاقوں میں جب آریا پھیلنے لگے تو ان کی زبان میں کئی غیر محسوس تغیرات ہونے لگے بالخصوص صوتیات کے شعبہ میں مقامی تلفظات اور لہجہ کا اثر نمایاں ہونے لگا یہی وہ بنیادی سبب ہے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی ویدک زبان میں فرق و امتیاز کرتا ہے جیسے مغربی ہندوستان کے آریہ "ل" کی آواز بھی "ر" کی آواز میں ادا کرتے تھے قدیم فارسی میں بھی یہی خصوصیت نمایاں ہے اس کے برعکس مشرقی ہندوستان میں "ر" کی آواز نہیں ملتی اس کے بجائے وہاں "ل" کی آواز پائی جاتی ہے وہ آریہ کو آلسیہ کہتے تھے۔

آریہ قبائل یوں تو اپنی ایک زبان لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے مگر جب وہ یہاں آئے اور مغرب سے لے کر مشرق تک ہندوستان میں بس گئے تو ان کی زبان مقامی بولیوں کے ساتھ ارتباط کی بناء پر بتدریج اپنا روپ بدلنے لگی۔ تلفظ اور معنیات کے شعبے متاثر ہونے لگے چند صدیوں ہی میں آریہ زبان کی مرکزی حیثیت کئی جگہ سے بکھرنے لگی زبان کا ڈھانچہ جگہ جگہ سے بدلنے لگا یہی ارتقاء و تغیر کا وہ عمل ہے جو کسی کو بھی ایک حالت میں ہمیشہ برقرار رہنے نہیں دیا کرتا۔ آریہ زبان اپنی شکل و صورت بدلنے لگی اور زبان کی بنیادی خصوصیات متغیر ہونے لگیں۔

چونکہ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں اساسی طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن ظاہراً ان میں بہت سا فرق نظر آتا ہے۔ مقامی بولیوں کے اثر سے جب روزمرہ کی آریائی زبان کے تلفظ جگہ سے ہٹنے اور بدلنے لگے، لہجہ ادائیگی کے ساتھ ساتھ تراکیب اور معنیات میں تغیرات نمایاں ہونے لگے تو مذہبی اور دانشور طبقے نے زبان کی انفرادیت اور اچھوتے پن کی برقراری کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کام کے لئے تحریر و تصنیف کا بنیادی رول ناقابل فراموش ہے اور یہ ذمہ داری مذہبی پیشوا طبقے نے سنبھالی۔ یہاں مشکل یہ تھی کہ مغربی علاقوں میں بسنے والی آریہ نسل اپنی خالص آریائی زبان کے ورثہ کے تحفظ کے ضمن میں بے حد حساس تھی لیکن اندرونی اور مشرقی حصوں کے لوگ مقامی رنگ میں رنگ چکے تھے غیر محسوس ڈھنگ سے زبان بھی بدل رہی تھی اس وجہ سے ان دونوں بازوں کے آریاؤں میں خود ایک طرح کی دوری سی پیدا ہو گئی مغربی اپنے آپ کو ذہنی اور لسانی اعتبار سے برتر اور مشرقی ہند کے آریاؤں کو کم تر سمجھنے لگے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ ہے کہ آریائی مذہب کے بنیادی تصورات، گیت، بھجن اور منتر تحریری شکل میں محفوظ موجود تھے اور مسلسل ان میں اضافہ بھی ہو رہا تھا اور وہ سب ویدک زبان ہی کے سانچہ میں لکھے جا رہے تھے۔ اور اس کی حیثیت قطعی طور پر ادبی مانی جاتی ہے۔ اس کو برہمنی تصانیف کا زمانہ بھی کہا جاتا ہے [1]

---

[1] ہندآریائی اور ہندی۔ چٹرجی صـ۵۷ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔

اِن حالات کے تفصیلی جائزے سے آریائی زبانوں کے تغیّر پذیر مراحل کا اندازہ ہو سکتا ہے بالخصوص بول چال کی زبان اس قدر جلد اور تیزی سے بدلنے لگی کہ مختلف مقامات پر اس کی رفتارِ تبدیلی کا اعتبار کرتے ہوئے ڈاکٹر چیٹرجی اور دیگر ماہرین نے اس کو تین گروہوں میں منقسم کیا ہے۔

اُدیچیہ : شمال مغربی ہندوستان کی زبان

مدھیہ : مدھیہ دیش یا وسطی ہندوستان کی زبان (وسطہ ہند کا لحاظ شمالاً شرقاً کیا جاتا ہے اس میں انبالہ سے الہ آباد تک کا علاقہ سمجھا جاتا ہے)

پراچیہ : مشرقی ہندوستان کی زبان

آریہ ہندوستان میں داخل ہی نہیں ہوئے بل کہ یہاں انہوں نے سیاسی غلبہ بھی حاصل کر لیا شمال مغرب میں افغانستان سے مشرق میں بنگال تک انہوں نے اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں جہاں مذکورہ بالا آریائی زبانوں کا چلن تھا صرف تھوڑے بہت تلفّظات کی تبدیلی کے ساتھ ہر جگہ آریائی ہی رائج تھی۔ ان میں صرف ادیچہ کو اپنے روایتی قدامت پسندانہ رجحانات کی بنیاد پر معیاری زبان مانا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی شستہ اور ٹھیٹ زبان نے انھیں سب میں ممتاز بنا رکھا تھا ملک کے مختلف حصّوں سے لوگ زبان سیکھنے شمال مغرب کے اہلِ زبان لوگوں کے پاس جایا کرتے تھے۔

سنسکرت (SANSKRIT) ویدک دور میں آریاؤں کو زبردست سیاسی غلبہ حاصل ہوا سندھ سے بنگال تک ان کے اقتدار کا سورج چمکتا رہا تھا، آریہ قوم ترقی پذیر اور آسودگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ ہر شعبہ زندگی میں آریا قوم چھائی ہوئی تھی ان کی تہذیب و معاشرت عروج پر تھی۔ ایسے حالات میں ان کی زبان کا پھیلاؤ وسیع تر ہو جانا فطری امر تھا چنانچہ جہاں ادبی اعتبار سے ویدک زبان نے اپنا تحفظ کیا وہیں بول چال کی زبانیں بھی الگ اعتبار پانے لگیں۔ اسی زمانے میں آریائی زبان کو از سرِ نو منظم کرنے کے متعلق غور و خوض کیا گیا۔ مشرق و مغرب کے اختلافات سے قطع نظر کر کے تمام ریاستوں میں بولی جانے والی آریہ زبان کا نئے ڈھنگ سے جائزہ لیا گیا۔ زبان کو ایک دوسرے سے ربط و ضبط کا وسیلہ بنانے کے لئے ہر جگہ رائج الفاظ کو ٹکسالی مانا گیا۔ اور صوبائی تلفّظات سے بالاتر ہو کر راشٹری (قومی) انداز فکر سے کام ہونے لگا ادب میں بالخصوص ہر جگہ اس کا التزام کیا جانے لگا کہ صرف ٹکسالی الفاظ ہی استعمال کئے جائیں اس طرح ویدک دور میں سنسکرت کے لئے مشترکہ طور پر مساعی کی گئی۔ عہد قدیم کی ویدک زبان کا نیا ادبی روپ

سنسکرت کی شکل میں رونما ہوا۔ اس کے باوجود بول چال کی زبانیں ختم نہ ہوئیں بلکہ ویدک دور کی پراکرتوں کے روپ میں باقی رہیں۔ یہ پراکرتیں عام لوگوں کے گھروں، بازاروں اور مزدوریات زندگی کے مفاہیم کی ادائیگی کے لئے رائج رہیں۔ جبکہ سنسکرت ملک کے ہر حصّے میں بسنے والے آریاؤں کے درمیان رابطہ کی زبان اور بالخصوص مذہبی علمی اور ادبی حلقوں کی زبان کی حیثیت سے روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ مگر اس کی یہ ترقی عام آدمی کے لئے فائدہ مند نہ تھی کیوں کہ بہت جلد سنسکرت پر ادبیت اور مذہبیت کا ایسا دباؤ پڑا کہ وہ صرف برہمن یا اگیانی طبقہ کی ہی زبان کہلائی جانے لگی آہستہ آہستہ عوام سے اس کا تعلق ٹوٹنے لگا۔ سنسکرت شستہ آریائی زبان کی حیثیت سے ایک مخصوص دائرہ کی پابند ہوگئی۔ لسانی اصولوں اور قواعد زبان کی زنجیروں نے اس کو صرف علماء اور برہمنوں کا اسیر بنا ڈالا۔

قدیم پراکرت (PARA KARATS) سنسکرت تو اپنی ادبی خصوصیت اور مذہبی حیثیت کی بناء پر مقدس بن گئی لیکن عام آدمی سے اس کا رشتہ کٹ گیا۔ عہد قدیم کے ویدک دور کی دوسری شاخ پراکرت کے روپ میں ملک کے ہر حصہ کے لوگوں کی روزمرہ کی بول چال والی زبان کے طور پر بے پناہ مقبول اور وسیع تر انداز سے ترقی پانے لگی۔ مختلف علاقوں کے پراکرت کئی اسباب کی بناء پر اہمیت اور وسعت پانے لگے۔ چوں کہ مذہبی مواد اور برہمن طبقہ کی گرفت نے سنسکرت کو بے انتہا مقدس اور عوام سے الگ کر دیا تھا اس وجہ سے عوام اس کی جڑاؤں ہمزاد پراکرت کو سینے سے لگائے رہے۔ آریاؤں میں ذات پات، چھوت چھات اور مذہبی اصولوں کی سختی نے سماج کو طبقاتی طور پر کئی حصّوں میں بانٹ دیا تھا اس سے ویدک سماج میں کئی طرح کی کشمکش ہمیشہ جاری رہنے لگیں۔ ٹھیک ایسے بے چین ماحول میں بدھ مت کا آغاز ہوا اس نئے مذہب نے طبقاتی تقسیم، عدم مساوات، چھوت چھات اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف اپنی تعلیمات کے ذریعہ بہت تھوڑے عرصہ میں پورے ملک میں ہلچل سی مچادی۔ لوگ جوق در جوق بدھ مت کے سائے میں آنے لگے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں اس نئے مذہب کا غلبہ ہوگیا۔ سیاسی پشت پناہی نے اس ضمن میں بنیادی رول ادا کیا۔ بدھ مت نے سنسکرت کے بجائے مختلف پراکرتوں کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ برہمنوں کے کٹر پن اور لسانی تعصّب نے اس دور میں سنسکرت کو بالکل محدود کر دیا جبکہ بدھ مت تعلیمات کی اشاعت کے لئے پراکرتوں کا استعمال ان کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ جب بدھ کی سرپرستی نے پراکرتوں کو خوب بڑھاوا دیا تو ظاہر ہے اس میں ادب کا تصور پیدا ہونا فطری بات تھی۔ پراکرت کی ادبی حیثیت پالی

کے روپ میں ظاہر ہوئی پالی میں اعلیٰ ادبی مواد ملتا ہے وغیرہ بدھ تعلیمات جو میناروں، لاٹ اور اسٹوپوں پر کندہ کئے جاتے تھے ان کے لئے اسی پراکرت ادبی زبان "پالی" کا استعمال ہوتا تھا۔ یہ پراکرتیں پہلی یا قدیم کہلاتی ہیں۔ ان میں ویدک زبان کی بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ادبی یا قدیم سنسکرت میں مفقود ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے ہندوستانی لسانیات کا خاکہ میں ڈاکٹر سدھشور ورما کی کتاب "آریائی زبانیں" کے حوالے سے عہد قدیم کی ہند آریائی کو پانچ منزلوں میں تقسیم کیا ہے۔

ویدک منزل: اس میں سنسکرت کا نشوونما ہوتا ہے اور سنسکرت ایک خاص جماعت یعنی پروہتوں کی زبان معلوم ہوتی ہے ویدوں میں وہ الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔ جن سے اس وقت کی دوسری بولیوں کی صوتی خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

اپنی کا زمانہ: اس دور میں سنسکرت ہندوستان کے عالموں کی مشترکہ زبان بن گئی

رزمیہ منزل: اس منزل میں جس میں خاص کر مہا بھارت کی تصنیف ہوئی عام لوگوں کی پراکرتوں سے بہ کثرت الفاظ سنسکرت میں شامل کئے گئے۔

دینوی منزل: اس منزل میں سنسکرت ہندوستان کی سرکاری زبان بن گئی اور اس کا تعلق پروہت جماعت سے ٹوٹ گیا خزانہ الفاظ میں عام لوگوں کی بولیوں سے الفاظ شامل ہو گئے۔

ٹکسالی منزل: اس منزل میں سنسکرت صرف و نحو میں قید ہو کر صرف ایک بناوٹی زبان رہ گئی [1]

عہد قدیم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف سنسکرت ہی کا بول بالا رہا۔ دیگر پراکرتیں ضمنی طور پر رائج تھیں۔ برہمنوں کے عروج کے زمانے میں مذہب، ثقافت، فلسفہ اور ادب کی غیر معمولی خدمات ہوئیں لیکن برہمن نظام کی سخت پابندیوں نے لوگوں کو اس سے دور کر دیا اور نئے مذہب بدھ مت نے سنسکرت زبان اور برہمن طبقہ دونوں کو محدود و محصور کر دیا۔ بدھ مت نے پراکرت کو مذہبی زبان کا درجہ دے کر اس کو بے حد مقدس زبان بنا دیا۔

عہد وسطیٰ: ہند آریائی زبانوں کے ارتقائی تسلسل میں مقامی بولیوں اور نئے مذاہب کے بنیادی کردار کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ عہد قدیم کے آخری زمانے یعنی (۸۰۰-) ق م سے

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، مقدمہ، ص ۳۵ پروفیسر احتشام حسین صاحب

۶۰۰ ق م تک دو سو سال کا دور سنسکرت کے انتہائی عروج و کمال کا تھا۔ پچھلے چند برسوں میں سنسکرت اور عوام کی بول چال والی زبانوں (جنھیں پراکرت کہا جاتا ہے) میں بیّن فرق نمایاں ہو چکا تھا۔ سنسکرت علمی ادبی اور بالخصوص مذہبی زبان قرار دیئے جانے کی بنا پر ایک برتر اور مقدس مقام کی حامل بن چکی تھی۔ اس سے عام لوگوں کے بندھن قائم تو رہے تھے بل کہ گیانی، برہمن اور پروہتوں نے اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لیے سخت نحوی و صرفی اصولوں کا پابند کر کے دیگر آریائی بولیوں سے الگ اور ممتاز حیثیت دے دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود عام بول چال کی زبان بھی برابر اپنے حدود کو وسیع اور اپنے اثرات کو پوری گہرائی کے ساتھ پھیلا رہی تھی۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں برابر اپنے اپنے دائروں میں ترقی کے زینے طے کر رہی تھیں اپنے وقار اور اہمیت کو نبھا رہی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر عام بول چال کی زبان کے وسیع تر پھیلاؤ نے سنسکرت کی ادبی شان اور مذہبی وقار کو نہیں گھٹایا اور نہ سنسکرت نے قدیم پراکرت کے وسیع تر اثر و نفوذ کو روکا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ارتقاء کی منزلیں سر کرتی رہیں۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے سنسکرت کو خواص کی تہذیب یافتہ زبان اور پراکرتوں کو عوام کی فطری بولیوں سے تعبیر کیا ہے[1]

جدید پراکرتیں: عام پراکرتیں قدیم ویدک زبان سے صوتیات و صوریات وغیرہ میں دن بہ دن دور ہوتی جا رہی تھیں جب کہ سنسکرت نے اس سے رشتہ نہ توڑا (۶۰۰ ق م) کے بعد عام بول چال کی زبان نے جدید پراکرتوں کے روپ میں اپنے آپ کو عصری سانچے میں ڈھالنا غیب نہ سمجھا جب کہ سنسکرت کا قدامت پسندانہ رویہ اور سخت ہو گیا۔ حالاں کہ سنسکرت کی ابتدائی غایت رابطہ کی ضرورت کی تکمیل اور قومی یکجہتی کا کردار نبھانا تھی۔ لیکن وہ بدلتے مزاج کا ساتھ نہ دے سکی۔ بل کہ جوں جوں بول چال کی پراکرتیں نئے ملفوظ لباس پہنتی رہیں۔ سنسکرت قدیم ویدک زبان کے ساتھ اپنے مضبوط رشتوں کی وجہ سے اپنی انفرادیت کی برقراری کے لئے ہر ممکن طریقے سے کوشاں رہی یہی سبب ہے کہ اس کی ادبی حیثیت، شستہ کیفیت اور قدر و قیمت میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر عام پراکرتوں میں جدیدیت کا رجحان بڑھتا رہا نئے الفاظ کا داخلہ اور پراکرتوں میں اضافہ اسے مرکز سے بتدریج دور کرتا گیا جب کہ سنسکرت اپنے سرچشمۂ واحد سے وابستگی کو مضبوط تر بنائے رکھی۔ یہ اور بات ہے کہ پراکرتوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے کہیں کہیں سنسکرت کو بھی بعض نئے الفاظ کو قبول کرنے اور بعض تبدیلیوں کو

---

[1] ہندستانی لسانیات کا خاکہ مقدمہ ص ۳۳ پروفیسر احتشام حسین صاحب

جگہ دینے پر آمادہ کیا لیکن جس رفتار سے پراکرتوں نے اپنے لسانی نظام میں تبدیلی اور قدیم الفاظ کو ترک کر کے نئے الفاظ کو اپنانے کا سلسلہ جاری رکھا سنسکرت اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ تاہم سنسکرت کو اپنی انفرادیت کی برقراری کے لئے سخت جہد کرنی پڑی اعلیٰ مذہبی دانشور طبقہ نے اگر سنسکرت کی شناخت کی سلامتی کے لئے انتہاء پسندانہ رویہ نہ اپنایا ہوتا تو آج سنسکرت زبان کی تاریخ کچھ اور ہی تصویر پیش کرتی۔ نئے اور پرانے الفاظ کے فرق کو چیٹرجی نے اس طرح نمایاں کیا ہے۔

پرانے الفاظ	نئے الفاظ	معنی	پرانے الفاظ	نئے الفاظ	معنی
اشوا	گھوڑکا	گھوڑا	رش من	پرستر	پتھر
شون	ککرّ	کتا	اوی	میش	میش بھیڑ
اُکشن	بلی ورد	بیل	راِئس	دھن	دولت
ساہس	بَل	بل قوت	ولشا	گرہہ	گھر
درو	دروکش	درخت روکھ	اُدن	جل (پانیہ)	پانی
آسرک	رکت لوہیا	لہو خون	ہن	ماریا	مارنا
یج	پوجیہ	پوجنا	وچ	کہیپ	کانپنا
رتھ	سکاتا	رتھ گاڑی	ود	کھد	کھانا
وکس	وردھ	اگنا	پرن	پرایا	بھرنا
پیٹ	اُودیا	اڑنا	سو	جنایا	جننا[1]

چوں کہ مشرقی بولیوں میں دندانی آوازیں مخفی آوازوں میں بدل جاتی تھیں (مثلاً "ر" "ڑ" کا "ل" میں بدل جانا) یہ خصوصیات آج بھی بنگال اور بہار کی بولیوں میں پائی جاتی ہیں جبکہ مغربی بولیوں میں یہ تبدیلیاں آہستہ آہستہ بعد کو رونما ہوئیں چناں چہ آج بھی مغربی یوپی (دوآبہ) اور پنجاب

---

[1] ہندآریائی اور ہندی چیٹرجی ص ۶۵

کے علاقوں کی بولیوں میں، لفی آوازوں اور مشدد لفظوں کی کثرت ملتی ہے جو عہدِ وسطیٰ کی پراکرت کی نمایاں خصوصیتیں تھیں اس کے برعکس مشرق کی بولیوں میں حرف علت (مصوتوں) کا استعمال بہ کثرت پایا جاتا ہے[1]۔

ہند آریائی کا وسطی عہد ماہرین (۶۰۰) ق م سے ۱۰۰۰ عیسوی تک یعنی (۱۶) سو سال پر مشتمل بتاتے ہیں۔ اس عہد میں سنسکرت کا زور کم ہو جاتا ہے اور آریائی پراکرتیں اپنے کمال و عروج پہ نظر آتی ہیں کیوں کہ سنسکرت کے محدود ادبی و مذہبی دائرہ کار کے مقابل عوامی بولیاں اپنے طور پر کئی اسباب کی بنا پر ارتقاء کی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ سنسکرت مخصوص اعلیٰ مذہبی گروہ یعنی برہمنوں کی سخت گرفت میں تھی۔ برہمنوں کے شدت پسند مذہبی رویّے نے گویا ایک مذہبی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ مذہب اور سنسکرت زبان پر اعلیٰ طبقہ کی اجارہ داری نے بدھ مت کی صورت میں ایک عوام پسند مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔

مہاتما گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات کے پرچار کے لئے عوام کی بول چال کی زبان پراکرتوں کو اختیار کیا اس طرح ان بولیوں کی قدر و منزلیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ سنسکرت کی علمی و تہذیبی اہمیت کے پیش نظر جب گوتم بدھ کو سنسکرت کے ذریعہ مذہبی تعلیمات اور تبلیغ و اشاعت کے لئے زور دیا گیا تو انہوں نے سختی کے ساتھ انکار کر دیا انھیں سنسکرت پر ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری سخت ناگوار تھی۔ گوتم بدھ کے رویّے نے سنسکرت کی ترقی کو سخت دھکا پہنچایا۔ ایک طرح سے سنسکرت زبان کی عملی ترقی رک سی گئی۔ اور عوامی پراکرتوں کو روز افزوں عروج نصیب ہوا۔ کہ بدھ مت کے مذہبی سرمائے نے ان کو بے حد باوقار اور مقدس بنا دیا۔ ان کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ بدھ مت کے وسیع تر پھیلاؤ اور بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے پراکرتوں کی ترقی کے راستے خود بخود ہموار کر دیئے پراکرتوں کی وسعت سرحدوں کو پار کر گئی۔ ان میں اعلیٰ ادبی اور علمی مواد اٹھا ہونے لگا جس کی وجہ سے ان کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان تمام میں اہم ترین مقام "پالی" کو حاصل ہوا۔ یہ مغربی علاقہ کی پراکرت تھی۔ پالی کو بطور خاص گوتم بدھ اور ان کے پیروؤں کی سرپرستی حاصل تھی۔

بدھ مت کے فوری بعد جین مت نے بھی پراکرتوں کو اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنایا۔ ان دونوں مذاہب نے خواص کی زبان (سنسکرت) کے بجائے عوام کی زبان کو ذریعہ اظہار بنا کر ان کو بے پناہ اہمیت عطا کی۔ ان کے مذہبی اشاعتی کام کی وسعت کے ساتھ پالی زبان بھی ہندوستان کے باہر پہنچی۔ بدھ

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، صفحہ ۳۷

مذہب کے مطالعہ کے لئے آج بھی پالی زبان علماء کا موضوع بنی ہوئی ہے ۔

عہد وسطیٰ کی ہند آریائی پراکرتیں یوں تقسیم کی جاسکتی ہیں (۱) ماگدھی (۲) اردھ ماگدھی (۳) پالی (۴) شورسینی (۵) مہاراشٹری وغیرہ ۔

ماگدھی (MAGDHI) عہد وسطیٰ کی پراکرتوں میں سب سے زیادہ اہمیت ماگدھی کو حاصل ہے کیوں کہ اس میں اشوک کے کتبے ملتے ہیں یہ مگدھ (موجودہ بہار پردیش) کی پراکرت تھی ایک خیال یہ ہے کہ یہ غیر مہذب اور ناہموار زبان تھی چوں کہ یہ آریائی تہذیب کے مرکز سے کافی دور علاقہ میں رائج تھی تاہم اس کی قدیم اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

اردھ ماگدھی (ARDH MAGDHI) یہ بہار اور یوپی کے درمیانی علاقوں میں بولی جاتی تھی اس پراکرت کے قدیم ادب کو نئے مذاہب کے پرچار کے لئے استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ بدھ مت اور جین مت کی قدیم تعلیمات اس میں ملتی ہیں ۔ اور ان کی اکثر کتابیں اسی پراکرت میں لکھی گئی ہیں ۔ اردھ ماگدھی کو سیاسی سرپرستی بھی حاصل تھی یہ درباروں کی مقبول بولی مانی جاتی تھی اس کی ساخت میں شورسینی اور ماگدھی کے نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں ۔

پالی (PALI) پالی کے لفظی معنی ہیں "کتاب کی اصل، عبارت" بعد میں لفظ کتاب کی اصل عبارت کی زبان کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ پالی کو ماگدھی بھاشا کے نام سے بھی یاد کیا گیا حالانکہ اس کا ماگدھ سے کوئی تعلق نہ تھا یہ مدھیہ پردیش کی قدیم بولی سے قریب تر تھی جس کے ملتے جلتے شورسینی پراکرت سے ملتے ہیں ۔

شورسینی (SHORSINI) یہ دوآبہ گنگ و جمن یعنی متھرا اور پنجاب کے علاقوں میں رائج تھی اس پر سنسکرت کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ اعلیٰ سنسکرت بولنے والا طبقہ اس کو استعمال کرتا تھا ۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ اس کا سنسکرت سے قریبی ربط و ضبط تھا کیوں کہ دوآبہ کے علاقے میں یہ سنسکرت کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتی سنورتی نکھرتی دکھائی دیتی ہے ۔ شورسینی کی ادبی حیثیت کو تمام مانتے ہیں ۔

مہاراشٹری (MAHARASHTRI) اگرچہ کہ چیٹرجی نے اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا ہے تاہم اس کی جداگانہ خصوصیت کا دیگر ماہرین نے برملا اظہار کیا ہے ۔ یہ پراکرت اپنے ادبی معیار اور سرمائے کے لحاظ سے دیگر تمام سے ممتاز تر حیثیت کی حامل تھی بل کہ

بعض ماہرین نے اس کو ایک لسانی نمونہ مانا ہے عہد وسطیٰ کا زیادہ تر شعری سرمایہ جو ادب کی بنیادی شان کہلاتا ہے اسی میں پایا جاتا ہے ۔ اس حروف علّت بہ کثرت ملتے ہیں جو زبان میں لوچ کا سبب ہیں۔ اس میں موسیقی اور نغمگی نمایاں ہے اکثر اسی بناء پر اس کو بیرونی علماء نے سب سے فوقیت دی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے' ان کے علاوہ قدیم قواعد نویس اردو چی[1] کے حوالے سے پشاچی کو بھی بطور پراکرت اس فہرست میں شامل کیا ہے[2]

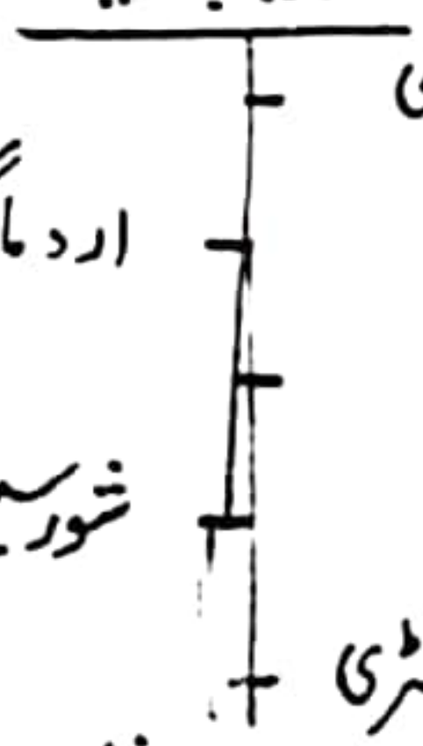

پشاچی (PUSHACHI)

یہ پنجاب اور کشمیر میں بولی جاتی تھی ۔ عوام میں یہ بھوت پریت کی زبان مشہور تھی ہیم چندر نے اس میں ادب کی موجودگی کا دعویٰ کیا ہے مشہور محقق گریرسن نے اس کی دو شکلیں بتائی ہیں۔ خاص اور مخلوط' خالص کی سات اور مخلوط کی چار شکلیں گنائی گئی ہیں۔ قندھار میں شاہی سرپرستی نے اسے خوب فروغ دیا ۔ اس میں معیاری ادب ملتا ہے اور یہ تعلیم کی زبان تسلیم کی گئی۔

پشاچی کی موجودہ شاخیں خالص ہندوستانی نہیں کہلائی جا سکتی کیوں کہ ان میں صوتیاتی اور گرامر کی اختلاف نمایاں ہیں ۔ کیوں کہ بہت پہلے ہی اس کا ہند آریائی سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا ۔ یہ اُن آریائی قبائل کی بولیاں ہیں جو ہندوستان میں داخل ہونے والے آریاؤں سے کٹ کر مغربی شمالی ہند کے پہاڑی علاقوں میں جا بسے ۔ یہ آریائی ہونے کے باوجود آریائی زبانوں سے بہت بُعد رکھتی ہے تاہم اس میں کہیں کہیں ایرانی زبانوں کے انداز جھلکتے ہیں۔

عہد جدید : سرزمین ہند میں ہند آریائی زبان ڈھائی ہزار سال کے طویل ارتقائی سفر میں دو اہم ادوار سے گزر کر ۱۰۰۰ء میں اپنے جدید عہد میں قدم رکھ چکی تھی۔ سیاسی واقعات

---

[1] ہندی بھاشا اور اس کا ساہتیہ کا وکاس۔ ہری اودھ ص ۱۲۷

[2] مقدمہ تاریخ زبان اُردو۔

زمانے کے انقلابات اور بدلتے ہوئے سماجی حالات کا زبانوں پر اثر پڑنا فطری امر تھا۔ لہٰذا ہندوستان میں ان صدیوں میں اندرونی طور پر ہونے والے متغیر سیاسی، سماجی، تہذیبی واقعات نے ہندآریائی زبان کے تقریباً ہر کنبہ کو متاثر کیا۔ اس سے کبھی ان کے حسن اور خوبیوں میں اضافہ ہوا کبھی دلکش نکھار آیا اور کبھی ان میں غیر محسوس تبدیلیاں آئیں۔ اکثر محققین نے عہد وسطیٰ کی آخری صدیوں ہی سے جدید پراکرتوں میں ادبی شان کے پیدا ہو جانے کے بارے میں لکھا ہے۔ عہد قدیم میں جس طرح ویدک زبان کی ادبی شاخ سنسکرت کا نام پائی اسی طرح پراکرتوں نے بھی ادبی جامہ پہننا شروع کر دیا۔ درمیانی عہد کی ابتدائی دو تین صدیاں سنسکرت کے عروج و کمال کی تھیں پھر عوامی پراکرتوں نے سنسکرت کے اثر کو کم کر دیا اور اس کو صرف مذہبی اور علمی طبقات تک ہی محدود کر دیا۔ جدید پراکرتوں میں بدھ مت اور جین مت کی تعلیمات اور گوتم بدھ کی خاص مہربانی نے ان کے دائرہ کار کو وسیع تر کر دیا ان کی اہمیت میں بے حد و حساب اضافہ کر دیا بلکہ بعض پراکرتیں ملک کی سرحدوں کو پھلانگ کر بیرون ملک دور، دور تک اپنا اثر پیدا کر لیں۔ علم و ادب اور مذہبی مواد کی موجودگی نے پراکرتوں کو اعلیٰ ترین ادبی وقار عطا کیا ان کا مزاج بدلنے لگا سنجیدہ فکر تعلیم یافتہ دانشور حلقہ ان کی سرپرستی کرنے لگا۔ ان کا عام لوگوں کی بول چال سے رشتہ ٹوٹنے لگا یہ غیر محسوس ڈھنگ سے عوام سے دور ہونے لگیں۔ ان کے خالص ادبی روپ دھار لینے کے نتیجہ میں عامۃ الناس نے بول چال کے لئے نئے راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ ان پراکرتوں کے بطن سے نئی بولیاں جنم لینے لگیں جو عام لوگوں کی روزمرہ کی گفتگو اور ضروریات کی کماحقہ تکمیل کرنے کے لائق تھیں۔ ماہرین نے ان نئی زبانوں کو اپ بھرنش کا نام دیا۔ یہ اپ بھرنشائیں ہر لحاظ سے عوامی مقبولیت حاصل کرتی گئیں۔ بعض علماء لسانیات کا خیال ہے کہ یہ ساتویں صدی تک اتنی رواج پا چکی تھیں کہ ان کے تحریری طور پر استعمال کئے جانے کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ رام بابو سکسینہ نے کالی داس "وکرموروشی" میں اپ بھرنش اشعار کی موجودگی کی مثال پیش کی ہے[1] ڈاکٹر سدھیشور ورما بھی اس خیال کے حامی ہیں[2]۔

اپ بھرنش (APBHA RANSH) چونکہ جدید آریائی

---

[1] سامان بھاشا و گیان بابو رام سکسینہ ص ۱۸۹ بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۴۴

[2] آریائی زبانیں ص ۵۶ بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۴۵ چھٹا ایڈیشن

زبانوں کے آغاز کو ستائیسویں صدی ق م سے مانا جاتا ہے۔ لہٰذا اپ بھرنش کے آغاز کے ضمن میں تیسری چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی کو مان لیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ (۶۰۰) ق م سے ۱۰۰۰ء تک کا زمانہ یعنی پورے (۱۶) سو برس ہندآریائی زبان کے ارتقاء کا عہد وسطیٰ فرض کیا جاتا ہے تغیر اور ارتقاء پسندی فطری اصول ہے اگر اس درمیانی مدت میں ہندآریائی زبانیں ارتقاء کی مدارج طے کر رہی تھیں تو عین فطری بات تھی کہ درمیانی عہد میں اپ ابھرنش کا آغاز گو یا عہد جدید کے لئے ایک شاندار ترکہ کی تیاری کے مترادف تھا۔ بہرحال ہندآریائی زبانوں کا عہد جدید اپ بھرنشوں کہ عظیم لسانی ورثہ کے ساتھ ستائیسویں سے آغاز ہوتا ہے اور یہ آج تک جاری و ساری بھی ہے گویا ہم اس عہد کو کم و بیش ایک ہزار سالہ بھی مان سکتے ہیں۔

سنسکرت جب عوام کے دائرے سے نکل کر مذہبی اور ادبی حلقوں میں سمٹ گئی اور رفتہ رفتہ ادق اور سنگلاخ بنتی گئی تو عوام کی روزمرہ کی زبانیں پراکرتوں کے روپ میں وسعت پانے لگیں اور ملک کے ہر حصے میں ان کا رواج عام ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد جب پراکرتوں نے ادبی شکل و صورت میں اپنے معیار کو عام سطح سے اونچا کرنا شروع کیا تو عوام کی ضروریات کی تکمیل اب بھرنش یا اپ بھاشا سے ہونے لگیں یہ گویا پراکرتوں کی بگڑی ہوئی صورتیں تھیں جن سے عام لوگ روزمرہ کی بول چال کے تقاضے پورے کرتے تھے پراکرتوں کے ادبی ارتقاء کے دور میں ناخواندہ لوگوں کی یہی بولیاں اپ بھرنش کہلاتی تھیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ادبی سنسکرت کے لفظ کے مقابل کئی متبادل الفاظ پیش کرتی ہیں۔ ایک لفظ کے ہر مقام پر الگ الگ اپ بھرنشوں کا پایا جانا ان بے پناہ عوامی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ ان کے ملک کے ہر حصے میں بڑھتے ہوئے اثر اور پھیلاؤ کو دیکھ کر اہل زبان علماء اور تعلیم یافتہ طبقات نے ان کے مطالعہ کی طرف سنجیدگی سے غور کیا۔ اور ان کو مفید اور با مقصد بنانے کی طرف توجہ کی۔ اس دوران مختلف شعراء اور اہل قلم حضرات نے اپ بھرنش کو ذریعہ اظہار بنانا شروع کیا جو ان کے مستند ہونے کا اولین واقعہ ہے۔ اپ بھرنش کا ہر علاقہ کی زبانوں پر اثر پڑا بعض اپ بھرنشائیں بہت جلد ادبی زبانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس میں بعض دفعہ سیاسی و سماجی محرکات بھی کارفرما رہے۔ اس ضمن میں راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کی مثال شورسینی اپ بھرنش کے لئے کافی ہوگی۔ ادھر گجرات میں مذہبی طبقہ نے اس کی ترویج و اشاعت میں بنیادی رول ادا کیا۔

عہد جدید کی ہندآریائی بولیوں کا سرچشمہ بلاشبہ یہی اپ بھرنشائیں ہی ہیں جس طرح پراکرتوں

میپالی کی اہمیت مسلّمہ ہے اسی طرح شورسینی پراکرت جو شورسینی اپ بھرنش کی منبع ہے اس کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص جدید ترین ہندآریائی زبانیں جن میں ہندی اور اردو سرفہرست ہیں ان کا اصل سرچشمہ یہی شورسینی اپ بھرنش ہے۔ ماہرین نے اپ بھرنشاؤں کے اقسام کے بارے میں محققانہ تفصیلات بیان کی ہیں جن کی روشنی میں ہم انھیں چار بڑی جماعتوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

اپ بھرنش کے ترقی پانے کا بنیادی سبب احیا پسندی کے وہ حالات تھے جن کے تحت برہمن ازم پوری قوت کے ساتھ ابھر رہا تھا۔ بدھ مت کے زوال اور مرکزی حکومت کے خاتمہ، سیاسی انتشار اور اندرون ملک بیرونی عناصر کی آمد نے ہندوستان کے سیاسی، مذہبی اور ثقافتی ڈھانچہ کو بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ ان غیر یقینی حالات میں جب کہ ہندوستانی معاشرت مختلف النوع تضادات اور متصادم کیفیات سے دوچار تھی، لسانی اعتبار سے اضطراب اور بے چینی ناقابل فہم ہیں۔ ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات کا اثر زبان قبول کرتی جا رہی تھی۔ یہی وہ منزل ہے جہاں سے اپ بھرنش یا اپ بھاشا کا آغاز ہوتا ہے جس قدر تیزی سے حالات متغیر ہوتے رہے اپ بھرنش بھی اسی رفتار سے بدلتی اور ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی۔ اور جب صورت حال پرامن اور حسب معمول ہوئی تو قدیم وجدید تہذیبوں کا اختلاط ہوا تصادم کی جگہ مفاہمت راہ پانے لگی۔ مذہبی رواداری کو فروغ ہونے لگا تو زبان بھی خود بخود اپنے خاص دھارے سے لگی۔ امن وسکون کے ماحول میں یہی اپ بھرنش ایک مستقل زبان کی حیثیت سے پہچانی جانے لگی ہر علاقہ کی پراکرت سے اس کی اپ بھرنش کی شناخت ہونے لگی عوام وخواص، عالم وعامی ہر ایک کا اعتبار اس کو ملنے لگا۔ اسی دوران سنسکرت کو بھی نیا وقار حاصل ہوا کیوں کہ بدھ مت و جین مت کے دباؤ کے کم ہو جانے اور ہندو دھرم کی تجدید کی لہر دیر تک ہوں کی بالادستی کے لئے کی گئی کامیاب کوششوں کی وجہ سے حالات نے پلٹا کھایا۔ اس کے باوجود سنسکرت صرف مذہبی حلقوں کی حد تک ہی محدود رہی۔ اس کا دائرہ کار ہمیشہ کی طرح سمٹا سمٹایا ہی رہا تاہم اس کو ایک نئی تازگی ضرور میسر آئی۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ اپ بھرنش کو علماء نے چار بڑی جماعتوں میں تقسیم کیا ہے ذیل میں ان کا اجمالی جائزہ لیا جاتا ہے سب سے پہلے ان کے اقسام بتائے جاتے ہیں۔

قسم اول: ناگر اپ بھرنش: یہ گجرات کے ناگر برہمنوں سے منسوب ہے گجرات اور راجستھان کی قدیم زبانوں کی ادبی شکل اور شورسینی سے بے حد متاثر تھی علماء اور دانشور طبقہ

نے اس کی سرپرستی کی۔

قسم دوم: براچڈ اپ بھرنش: قدیم دور میں سندھ میں اس کا اثر تھا موجودہ سندھی زبان کا سرچشمہ ہے۔

قسم سوم: اپ ناگر اپ بھرنش: قسم اول و دوم کے اختلاط کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتی مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب اس کے علاقے تھے۔

چونکہ عہد حاضر کی تمام ہند آریائی زبانوں کا سرچشمہ یہی اپ بھرنشائیں ہیں اسی لئے ان کی موجودہ عہد میں لسانی نقطہ نگاہ سے بے حد و حساب اہمیت و وقعت ہے اور ان اپ بھرنشاؤں کے اخذ پر اکرت ہیں جو عہد قدیم و وسطی کے عام لوگوں کی بھاشائیں تھیں ان کی مشہور جماعتیں یہ ہیں۔

شورسینی اپ بھرنش: یہ متھرا کے علاقہ سے تعلق رکھتی ہے یہ اس سلسلہ کی سب سے اہم بے پناہ وسیع اور بہت بااثر جماعت ہے بہت ساری بولیوں کا اسی سے تعلق ہے۔ کھڑی بولی یا ہندوستانی، راجستھانی مشرقی پنجابی، گجراتی اور بہت ساری پہاڑی زبانیں۔

ماگدھی اپ بھرنش: اس کا دائرہ نفوذ بہت بڑا اور پھیلا ہوا تھا اسی بنا پر الگ الگ مقامات پر اس کے جداگانہ نام پڑ گئے۔

پراچیہ، گوڑ، ڈھکی، مات کلی اور مگہی وغیرہ۔ بنگالی اور آسامی زبانیں پراچیہ گوڑ اور ڈھکی سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ اڑیا زبان کا سرچشمہ مات کلی تھا بہار کی اکثر زبانیں مگہی سے متعلق ہیں ماگدھی کا بگڑا ہوا نام مگہی پڑ گیا جو بہار کی اہم ترین بولی ہے۔

اردھ ماگدھی اپ بھرنش: اس سے پوربی ہندی یعنی اودھی وغیرہ منسوب ہیں۔

مہاراشٹری اپ بھرنش: بھارت کا صوبہ مہاراشٹر اگی دھ تسمیہ یہی مہاراشٹری ہے اس کا اہم مرکز برار ہے جو مہاراشٹرا کا ایک ضلع ہے۔ ان کے علاوہ ماہرین نے اور کئی اپ بھرنشاؤں کی نشاندہی کی ہے جن میں دو یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

کیکئی اپ بھرنش: لہندا دیس کا پرانا نام کیکئی تھا لہندا (مغربی پنجاب) اور سندھی میں حد درجہ مماثلت ملتی ہے۔ اور سندھی کا تعلق براچڈ اپ بھرنش سے ہے۔

براچڈ اپ بھرنش: سندھی زبان کا سرچشمہ یہی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں اس ضمن میں نہایت محققانہ بحث کی ہے جبکہ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اپ بھرنشوں کے مطالعہ کو سب سے زیادہ الجھنیں پیدا کرنے والا موضوع قرار دیا ہے [۲]۔

ڈاکٹر تارا چند صاحب نے بھی اپ بھرنشوں پر مختصراً بحث فرمائی ہے۔

ڈاکٹر چٹرجی نے اب بھرنش اور سنسکرت کے بارے میں البیرونی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہند آریائی زبان دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک۔ گری پڑی بولی جسے صرف عوام استعمال کرتے ہیں۔ ایک کلاسیکی زبان جسے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقے استعمال کرتے ہیں یہ بہت ترقی یافتہ ہے اس میں تصریف و اشتقاق کے قواعد اصول اور عروض و قواعد کی نزاکتوں کی پابندی کی جاتی ہے [۳]

عہد جدید	
اپ بھرنش	
شورسینی اب بھرنش	
اگدھی اپ بھرنش	
اردھ اگدھی اپ بھرنش	
مہاراشٹری اپ بھرنش	
کیکئی اپ بھرنش	
پراچیڈ اپ بھرنش	

ہند آریائی زبانوں کی مکانی تقسیم

ZONAL CLASSIFICA TION OF INDO-ARIAN LANGUAGES.

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بیرونی لوگوں کی آمد کا سلسلہ ہزاروں سال پہلے سے گزشتہ صدیوں تک جاری رہا۔ سب سے پہلے نیگرائڈ، پھر آسٹرالائڈ، پھر آسٹرک ان کے بعد دراوڑی قبیلے آئے بعض شرقی ملکوں کو منتقل ہوئے اور جو یہاں بس گئے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے ان قدیم اقوام کے بعد ہندوستان میں داخل ہونے والے آریہ تھے جن کے ورود ہند

---

[۱] مقدمہ تاریخ زبان اردو

[۲] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ پروفیسر احتشام حسینی۔ صفحہ ۳۹

[۳] ہند آریائی اور ہندی چٹرجی صفحہ ۹۶

کی تفصیلات پچھلے ابواب میں گذر چکی ہیں۔ یہ بات ثابت ہے کہ آریہ ایک وقت میں ایک ساتھ نہیں آئے بلکہ مختلف اوقات میں الگ الگ جتھوں کی شکل میں آئے ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر دو دفعہ دو بڑے گروھوں میں وارد ہند ہوئے۔ مشہور محقق ہوئرن لے نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے کہ آریہ جب پہلی مرتبہ ہندوستان آئے تو ان کا راستہ ایران، افغانستان، سندھ اور پنجاب تھا ان کا ملک کے اندرونی علاقے میں یہاں کے قدیم باشندگان مثلاً دراوڑیوں سے سخت مقابلہ ہوا طاقتور اور جنگی اصولوں سے پوری طرح واقف کار آریاؤں نے انھیں شکست دیدی اور ہندوستان کے جنوبی علاقوں کی طرف ڈھکیل دیا۔ خود وسطی ہند کے وسیع و عریض میدانی علاقہ پر قبضہ جماکر اپنی بستیاں بسالیں۔ ان کے بعد آنے والوں نے اپنے داخلہ کے لئے جب کوشش کی تو انھیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تاہم انھیں طاقت و قوت کے بل بوتے پر کامیابی مل گئی بعد میں داخل ہونے والے جتھے نے پہلے گروہ سے سخت پیکار کی اور فتح حاصل کرکے ان کے مقبوضہ علاقہ چھین لئے اگرچہ انھیں ملک سے باہر نہیں کیا مگر انھیں ان مقامات سے ہٹا دیا جہاں انہوں نے اپنی آبادیاں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلی تھیں پہلے آنے والوں نے ملک کے مشرق شمال اور جنوب مغربی علاقوں میں دور دور تک نکل جانے ہی میں عافیت سمجھی وہاں انہوں نے نئے سرے سے آبادیاں قائم کیں جبکہ پورا اندرونی وسطی علاقہ نئے آریائی گروہ کے زیر تسلط تھا گویا نووارد آریاؤں نے تین چوتھائی ہندوستان پر قبضہ جما لیا تھا جب کہ قدیم باشندگان اور دراوڑیوں کے زیر اثر ایک چوتھائی حصہ تھا۔

مشہور مستشرق سر جارج ابراہم گریرسن نے اے۔ ایف۔ آر ہوئرن کے اس نظریہ کے برعکس اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آریا اگرچہ کہ دو گروہوں میں آئے مگر پہلے آنے والے آریائی گروہ نے بعد آنے والوں کو ملک کے اندرونی علاقوں میں گھسنے نہ دیا بل کہ ان کا مقابلہ کرکے انھیں شکست دیدی جس کے نتیجہ میں انھیں مجبوراً مشرق شمال اور مغربی حصوں میں وسطی یا مدھیہ دیش میں بسنے والے آریائی قبائل کے اطراف پھیل جانا پڑا۔ گریرسن نے اسی مفروضہ کے زیر اثر ان پرانے اور نئے آریاؤں کو دو حلقوں میں بانٹا ہے اس نے پہلے آنے والوں کو مدھیہ دیش پر قابض تھے اور آریائی زبانیں بولتے تھے انھیں اندرونی اور بعد والوں کو جو شکست کھاکر اندرونی آریاؤں کے اطراف بس گئے تھے وہ بھی آریائی زبانیں بولتے تھے بیرونی آریہ سے موسوم کرکے ان کی زبانوں

کو اندرونی و بیرونی زبانوں سے یاد کیا ہے۔ گریرسن (SIR GEORGE ABRAHAM) نے اپنے نظریہ کی تائید میں ان کی زبانوں کے صوتیاتی، مصوتی اور مارفیمیاتی فرق کو بھی نمایاں کیا ہے[1]۔

گریرسن نے اندرونی حلقہ کی زبانوں میں "س" کا تلفظ اور یہی بیرونی زبانوں میں "ش" سے بدل جانے کی مثال دی ہے۔ اندرونی زبانوں میں حالت تفصیلی میں اور بیرونی زبانوں میں ترقی یافتہ شکل میں حالت ترکیبی میں پائے جاتے ہیں اندرونی زبانوں میں فاعل کے ساتھ فعل کی ایک ہی شکل رہتی ہے جیسے "میں گیا، تو گیا، وہ گیا" میں فعل گیا یکساں ہے جب کہ بیرونی زبانوں میں فعل ماضی سے اس کے فاعل کی تجنیس اور تعداد کا پتہ بھی چل جاتا ہے

گریرسن کے اس نظریہ سے بعد میں تقریباً سب ہی ماہرین نے سخت اختلاف کیا ہے۔ بنگالی زبان کی ابتداء اور ارتقاء و نیز ہند آریائی اور ہندی میں سنیتی کمار چٹرجی نے اس کا خوب رد کیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے مقدمہ تاریخ زبان اردو میں گریرسن کے لسانی دلائل کا بطلان خوب زوردار ڈھنگ سے مختلف حوالوں اور لسانیاتی تجزیات کے ذریعہ فرمایا ہے۔ قبل ازیں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بھی اپنی کتاب ہندوستانی لسانیات میں گریرسن کے نظریہ

ہند آریائی زبانیں

سر جارج ابراہم گریرسن کی تقسیم

اندرونی گروہ	بیرونی گروہ	درمیانی گروہ
مغربی ہندی	مغربی پنجابی	مشرقی ہندی
یا	یا	یا
برج بھاشا	لہندا	اودھی
کھڑی بولی	اور	
بانگرو	سندھی	بگھیلی
قنوجی	مرہٹی	چھتیس گڑھی
بندیلی	اڑیا	
اور		
مشرقی پنجابی	بنگالی	
راجستھانی	آسامی	
گجراتی	بہاری	
بھیلی		
خاندیشی		
اود		
پہاڑی بولیاں		

---

[1] لسانیاتی جائزہ ہند۔ جلد اول، حصہ اول۔ گریرسن۔ بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۶۱، ۶۲۔

پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو زیادہ وقیع قرار نہیں دیا ہے انہوں نے چٹرجی کے موقف کی تائید کی ہے۔
گریرسن کا نظریہ کس حد تک قابل قبول ہے یہ ایک الگ بحث ہے یہاں ہم صرف گریرسن کی آریائی زبانوں کی تقسیم کے بارے میں اندرونی و بیرونی گروہوں کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

اندرونی گروہ کی زبانیں (INTERNAL GROUP) اس گروہ میں مغربی ہندی کی بولیاں شامل ہیں۔ ان میں برج بھاشا کھڑی بولی (موجودہ ہندی' اردو) بانگارو۔ قنوجی۔ بندیلی' مشرقی پنجابی' راجستھانی' گجراتی' بھیلی' خاندیشی' اور پہاڑی بولیاں۔

بیرونی گروہ کی زبانیں (EXTERNAL GROUP) اس گروہ میں مغربی پنجابی یا لہندا' سندھی' اڑیا' بنگالی' آسامی' بہاری بولیاں جیسے متھیلی' مگہی' بھوج پوری۔

ان دو گروھوں کے علاوہ ایک اور گروہ درمیانی گروہ کی زبانوں کے طور پر مانا جاتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے۔

درمیانی گروہ کی زبانیں (MIDDLE GROUP) اس کا زیادہ تر تعلق بیرونی گروہ سے ہے تاہم یہ اندرونی زبانوں سے بھی بے حد متاثر ہے اس گروہ میں مشرقی ہندی کا خاندان بے حد اہم ہے۔ جس میں مشرقی ہندی یعنی کوسال یا اودھی' بگھیلی' چھتیس گڑھی وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے پہاڑی بولیوں کو اندرونی گروہ میں رکھا ہے پہاڑی بولیوں میں مشرقی جنھ نیپالی' درمیانی اور مغربی جتھے شامل ہیں۔

گریرسن کی اس تقسیم کو کئی لسانی حقائق کی بناء پر مسترد کیا جاتا ہے اس ضمن میں صوتیاتی مصوتی' اور ہیئتی اختلافات کا ماہرین نے گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد گریرسن کے نظریہ کا البطال کیا ہے اس سلسلہ میں سنیتی کمار چٹرجی پیش پیش ہیں بعد کے علماء لسانیات نے خود چٹرجی کی تقسیم کو تھوڑی بہت رد و قدح کے بعد قبول کیا ہے۔

ڈاکٹر زور' پروفیسر مسعود حسین خاں' پروفیسر احتشام حسین' پروفیسر سروری' پروفیسر گیان چند جین اور دیگر ماہرین قریب قریب یکساں نظریات پیش کرتے ہیں۔ جن کی روشنی میں ہند آریائی زبانوں کی مکانی تقسیم کچھ اس طرح منضبط ہوتی ہے۔

(۱) شمالی (۲) جنوبی (۳) مشرقی (۴) مغربی (۵) وسطی اور پہاڑی زبانیں۔ اس طرح ہند آریائی زبانوں کی پانچ بڑی جماعتیں اور پہاڑی بولیوں کے گروہ مل کر جدید ہند آریائی زبانوں کے لئے ایک اہم تاریخی اساس فراہم کرتی ہیں۔ ہند آریائی زبانوں کی گروہ واری تقسیم کا اجمالی خاکہ یوں ہے یہ تقسیم مختلف آریائی زبانوں کی لسانی اور ترکیبی خصوصیات پر مبنی ہے جو لسانیات کے طلباء کے لئے بے حد اہمیت کی حامل ہیں ان کے مطالعہ سے نہ صرف زبانوں کے بارے میں بل کہ تہذیبی مذہبی اور فکری نہج کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں جو تاریخ، بشریات اور عمرانیات کے نقطہ نگاہ سے بے حد مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔ لسانیات کے مطالعہ کا یہ ایک اہم مقصد بھی ہے کہ کسی بھی زبان کے مطالعہ کے ذریعہ اس کے بولنے والوں کی تاریخی سرگزشت اور تہذیبی اثرات کا پتہ لگایا جائے بہر حال ہند آریائی زبانوں کی مکانی تقسیم جیسی اس طرح کی جاتی ہے۔

(۱) شمالی جتھہ یا شمال

مغربی گروہ :- اس گروہ میں مغربی پنجابی یا لہندا یا ہند کی زبان اور پنجابی سندھی زبان کے علاوہ ہندوستان سے باہر یورپ، ایشیائے کوچک، ارمینا اور شام وغیرہ میں بسنے والے جپسیوں کی زبانیں شامل کی جاتی ہیں[1] ان سب میں لہندا کی بہت اہمیت ہے

لہندا (LAHINDA) شمال مغربی گروہ کی سب سے اہم شاخ ہے جس میں کئی بولیاں شامل ہیں۔ یہ کروڑوں لوگوں کی زبان ہے یہ بہت پھیلی ہوئی زبان ہے زمانہ قدیم میں یہ "لہندا" رسم الخط

---

[1] ۔ ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر زور ص ۶۵

چٹرجی کی تقسیم

ہند آریائی زبانوں کی مکانی تقسیم

شمالی جتھہ	جنوبی جتھہ	مشرقی جتھہ	مغربی جتھہ	وسطی جتھہ	پہاڑی جتھہ
لہندا	مرہٹی	اودھی	گجراتی	برج بھاشا	مشرقی
پنجابی	سنہالی	بگھیلی	راجستھانی	قنوجی	درمیانی
سندھی		چھتیس گڑھی			تبدیلی
			میواڑی		مغربی
اڑیا		بے پوری	کھڑی بولی		
بنگالی		اودی	ہریانی		
آسامی			میواتی		
			بہاری		
			میتھلی		
			مگہی		
			بھوج پوری		

میں لکھی جاتی تھی آج کل اس کا رسم الخط فارسی ہے اس زبان میں بہت کم ادبی سرمایہ ہے اس کے بولنے والے ادبی اغراض کے لئے دوسری زبانوں کا استعمال کرتے ہیں جن میں اُردو بھی شامل ہے۔ اس کے کئی نام ہیں جن میں ہندکی جاٹکی، ملتانی، اُچی اور بھوٹواری وغیرہ ہیں۔

پنجابی (PUNJABI) یہ دراصل مشرقی پنجابی ہے۔ مغربی پنجابی جو لہندا سے مشہور ہے، کے اور مشرقی پنجابی کے حدود ایک دوسرے سے ایسے خلط ملط ہیں کہ ان کو الگ کرنا مشکل ہے۔ پنجابی کے بولنے پشتو زبان کی سرحدوں تک بستے ہیں۔ یہ زبان اپنے پھیلاؤ اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے بہت وقعت رکھتی ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں شمار کی جاتی ہے رسم الخط لنڈا سے ملتا جلتا اور بعض دفعہ اردو سے متاثر نظر آتا ہے بالعموم فارسی رسم الخط بھی مستعمل ہوتا ہے سکھ مت کی تعلیمات اور چند ادبی تخلیقات نے اس کے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے۔ اس کی کئی شاخیں ہیں جن میں ڈوگری کی بہت شہرت ہے جو جموں اور کانگڑہ میں ہوتی ہے پنجابی زبان کی رونق افزوں ترقی میں سکھوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ پنجابی میں بعض قدیم تحریری نمونے بھی دستیاب ہیں جو اس کی قدامت اور ادبی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سندھی (SINDHI) یہ زبان ہندوستان کے صوبہ سندھ میں بولی جاتی ہے اس زبان پر فارسی اور عربی کا بہت غلبہ ہے اس کا علاقہ دریائے سندھ کے نشیبی وادیوں اور کچ تک پھیلا ہوا ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد آج کروڑوں میں ہے۔ یہ ایک قدیم زبان ہے جس کا تعلق براچڈاپ بھرنش سے مانا جاتا ہے اس کا رسم الخط فارسی و عربی سے ماخوذ ہے تاہم لنڈا میں بھی سندھی لکھی جاتی ہے۔ سندھی ایک ایسی منفرد زبان ہے جس کی صوتیات کسی دوسری ہندستانی زبان سے ملتی نہیں ہیں اس زبان پر دیگر ہند۔ آریائی زبانوں سے بڑھ کر عربی کا اثر نمایاں ہے البتہ فارسی سے نزدیکی نے اس کی ہند آریائی حیثیت کا تحفظ کیا ہے۔ یہ اپنے قواعد کے لحاظ سے بعض خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کی مشہور پانچ شاخیں ہیں۔ (۱) سریکی (۲) کچھی (۳) لاڑی (۴) وچولی یا بچول (۵) تھرلی ان میں بچول بہت مشہور اور ادبی سرمائے سے مزین بولی ہے۔ ادبی سرمایہ نثری نظموں اور چند ایک شعری تخلیقات پر مشتمل ہے "نثر بالعموم فارسی طرز ملتی ہے۔

جپسی: (JIPSE) جس طرح وسطی ایشیاء سے آریائی قبائل ہندوستان آئے تھے زیادہ تر یہاں رہ گئے چند قبائل واپس بھی ہوئے جب وہ واپس ہوئے تو اپنے ساتھ اپنی زبانیں بھی لے گئے یہ زبانیں زیادہ تر شمالی مغربی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور انھیں جپسی بولیوں سے موسوم کیا جاتا ہے یہ گویا شمال مغربی کی دور افتادہ شاخ کہی جاسکتی ہیں۔ جپسی بھی ایک وقت میں ہندوستان سے نہیں نکلے ہیں کہ ان کے قافلے

وقفے وقفے سے نکلتے رہے واپسی کے سفر میں کچھ یورپ تک گئے کچھ ایشیا ہی کے دیگر ملکوں میں رک گئے اور جہاں پر وہ ٹھہرے اپنی تہذیب ثقافت اور زبان کی ترقی کے لئے مستعد رہے۔ یہ اور بات ہے کہ مقامی بولیوں کا اثر ان کی زبان پر اور ان کی زبانوں کے اثرات مقامی زبانوں پر پڑتے رہے۔ ایشیا کے علاوہ یورپ میں جپسی پرشیا، آرمینیا، شام، یونان، ملتان، رومانیہ، ہنگری، جرمنی، فرانس، اسپین، انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلس وغیرہ میں اپنی زبان کے ساتھ پہنچے۔ ہندستان کی ہند آریائی زبانوں اور جپسی بولیوں کی لسانی خصوصیات صوتیاتی مزاج اور مصوتی کیفیت اس قدر ملتی جلتی اور قریب تر ہے کہ انھیں جدا نہیں کیا جا سکتا مگر چونکہ بہت پہلے ہی یہ یہاں کی زبانوں سے کٹ سی گئی تھیں اس وجہ سے ان میں ایک طرح کی دوری فطری بات ہے۔ ان کے ماخذ اور اشتقاق کے لحاظ سے انھیں ایک ہی سرچشمہ کے فیض یافتہ تو کہا جا سکتا ہے مگر ان کی نشو ونما پر ورش اور ارتقا الگ الگ ڈھنگ سے ہوا اس وجہ سے ان میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ تاہم جپسیوں کی زبانوں کو ہند آریائی سے الگ تصور نہیں کیا جا سکتا یہ اور بات ہے کہ ان کا تقابل و تجزیہ بے حد صبر آزما اور پیچیدہ کام ہے اس وجہ سے ماہرین ہند آریائی انھیں نظر انداز کرتے ہیں، اور اس موضوع پر ہندوستان میں بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ البتہ ڈاکٹر جان کمپسن نے اس ضمن میں تحقیقاتی مطالعہ کیا ہے۔

جنوبی جتھہ۔ مرہٹی (MARATHI) اس جتھہ کی سب سے اہم زبان مرہٹی ہے۔ مرہٹی بولنے والوں کی تعداد بھی کروڑوں میں ہے یہ زبان آج کل مہاراشٹرا کے صوبے میں جو سالقہ دیسی ریاستوں کے علاقوں پر مشتمل ہے بولی جاتی ہے۔ ساحل بمبئی اور برار، حیدرآباد اور اطراف واکناف کے حصوں میں رائج تھی۔ مرہٹی زبان میں علم وادب کا اچھا خاصا ذخیرہ ملتا ہے۔ جو اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ معیار کے لحاظ سے بھی یہ ادب بلند پایہ حیثیت رکھتا ہے بھگوت گیتا کا ترجمہ گیانیشوری اور مختلف شعراء کے گیت اور شعری کارنامے اس کے ادب عالیہ کا حصہ ہیں۔ تیرھویں صدی سے مرہٹی کے ادب کا پتہ چلتا ہے۔ مرہٹی زبان کے پھیلاؤ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تین اہم شاخیں تھوڑی بہت لفظی تبدیلی کے ساتھ مہاراشٹرا اور اطراف کے علاقوں میں رائج ہیں ان میں برادی، دیشی اور کونکنی شامل ہیں۔ براری ناگپور کے اطراف رائج ہے اس کی خصوصیت اس کا تلفظ ہے جو کسی قدر واضح اور بگڑی شکل کا حامل ہے اس کو ناگپوری بھی کہتے ہیں۔ ساحلی بولی کا نام کونکنی ہے جو گوا اور اس کے نواح میں بولی جاتی ہے بنیادی طور پر یہ مرہٹی کی ہم نسل ہے مگر چند

لسانی خصوصیتیں اسے ممتاز کرتی ہیں۔ دلیتی دراصل مرہٹی کی دسطی اور مرکزی حیثیت کی حامل زبان ہے یہ پونا کے علاقہ میں دور دور تک بولی جاتی ہے۔ اس کو پونہ مرہٹی بھی کہا جاتا ہے۔

سنہالی: (SINHALI) بعض علماء لسانیات نے بالخصوص چیٹرجی اور پروفیسر سہروری نے سنہالی زبان کو بھی جنوبی جتھہ میں شمار کیا ہے۔ سنہالی ایک قدیم ہند آریائی زبان ہے جو گجرات سے لنکا پہنچی تھی۔ اس زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر دور میں ہر نئی تبدیلی کا جلد اثر قبول کرتی رہی اس لحاظ سے اس کا نشو ونما اور ارتقاء آزاد اور کھلے ماحول میں نہ ہو سکا۔ لنکا میں ہندوستان اور دیگر علاقوں سے آآکر بس جانے والوں کی زبانیں سنہالی پر اثر انداز ہوتی گئیں۔ سنہالی زبان کی ہند آریائی زبانوں سے مشابہتیں اور بنیادی لسانی خصوصیات اس کو مشرقی سے قریب کرتی ہیں۔ بنگالی اور ماگدھی اپ بھرنشوں کا سنہالی پہ گہرا اثر نمایاں ہے سنہالی میں زیادہ تر بدھ مت کا مذہبی مواد ملتا ہے۔ جو اس کی ادبی اہمیت میں اضافہ کا باعث ہے۔ سنہالی کا قدیم ادب اپنے اعلیٰ معیار اور بلند پایہ مواد کی بنا پر ہند آریائی زبانوں کے ترقی یافتہ گروہ میں اپنا الگ اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ لیکن آج کل سنہالی میں غیر مذہبی ادب اور مختلف اصناف کی ترویج و اشاعت اس کے قدیم مزاج سے اس کو ہٹا رہی ہیں۔

مغربی جتھہ یا جنوب مغربی گروہ: اس جتھہ کی زبانوں کا مدھیہ دیش کی بولیوں سے گہرا تعلق نظر آتا ہے اس گروہ میں ہندوستان کے مغربی علاقوں جو شمال کے مقابل جنوب سے قریب ہیں کی زبانیں شامل ہیں۔ یہ زبانیں پہاڑی علاقوں کے علاوہ صحرائی مقامات اور مغربی سواحل و نیز اطراف دکناف بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں مشہور و معروف شاخیں حسب ذیل ہیں۔ (۱) راجستھانی (۲) گجراتی۔

راجستھانی (RAJ HAS TANI) اس گروہ کی زبانوں میں راجستھانی بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس کا ایک طرح سے تعلق مدھیہ دیش کی زبان سے بھی قائم ہے اور اس کے پھیلاؤ کے دوسرے سرے پر گجراتی سے اس کے روابط ہیں۔ راجستھانی بولنے والوں کی تعداد (۲ تا ۳) کروڑ ہے۔ ہند آریائی کی قدیم مالوہ کی شاخ کے ساتھ اس کا نسلی تعلق بتایا جاتا ہے۔ راجستھانی کی چار مشہور شاخیں ہیں جن کا ایک دوسرے سے ہم نسلی کا گہرا تعلق بھی نمایاں ہے۔ (۱) میواڑی (۲) جے پوری (۳) مالوی (۴) میواتی۔

میواڑی (MEWARI) اس کو مارواڑی بھی کہا جاتا ہے۔ جودھپور

بیکانیر، جیسلمیر اور اودے پور وغیرہ میں بول جاتی ہے۔ مارواڑی میں بہترین ادبی مواد ملتا ہے۔ اس ادب کا زیادہ تر حصہ شعری اور نثری قصّوں پر مشتمل ہے۔ اٹلی کے ایک محقق نے مارواڑی ادب پر نہایت مفید کام کیا ہے۔

جے پوری (JAIPURI) یہ جے پور، کوٹہ اور پوندی وغیرہ کے علاقوں میں رائج ہے جے پوری ادبی اغراض کے لئے بہت کم استعمال ہوتی ہے تاہم تھوڑا بہت کام تو ضرور ملتا ہے۔ یہ راجستھانی کے مشرقی علاقوں میں بولی جاتی ہے اس پر مغربی ہندی کا گہرا اثر ملتا ہے۔

مالوی (MALVI) اندور اور اطراف واکناف میں بولی جانے والی راجستھانی شاخ مالوی کے نام سے موسوم ہے اس پر بھی مغربی ہندی کا غلبہ نمایاں ہے یہ تبدیل کھنڈی سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔

میواتی (MEWAT) راجستھانی گروہ میں میواتی کی اہمیت نمایاں ہے یہ راجستھان کے شمال مشرقی علاقوں جیسے الور، گوڑگاؤں وغیرہ میں بولی جاتی ہے میواتی برج بھاشا سے قریبی تعلق رکھتی نظر آتی ہے۔ میواتی میں ادبی سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے تاہم کچھ نہ کچھ ذخیرہ تو مل ہی جاتا ہے۔

گجراتی (GUJRATI) گجراتی کا رشتہ راجستھانی سے اس قدر گہرا رہا ہے کہ علمائے لسانیات قدیم عہد میں گجراتی کا علیحدہ وجود تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو راجستھانی ہی کی ایک مغربی شاخ کے طور پر شمار کرتے تھے مگر اس کے باوجود گجراتی ایک منفرد وجود کی حامل ہے گجراتی بڑودھ اور کاٹھیاواڑ میں اور ان کے قرب وجوار کے علاقوں میں بولی جاتی ہے اس کی کئی بولیاں ہیں جو قریب قریب ایک طرح ہی کی خصوصیات رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر زور نے گجراتی کی علیحدہ حیثیت سولھویں صدی عیسوی سے بتائی ہے۔ اس کے جنوب میں مرہٹی اور مشرق میں خاندیشی بولیوں کے علاقے ہیں اس کے مغرب میں کچھی آباد ہیں۔ گجراتی بولنے والوں کی تعداد (۲) کروڑ کے لگ بھگ مانی جاتی ہے۔ گجراتی کو یوں تو اندرونی زبانوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے لیکن اس پر بیرونی زبانوں کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ گجراتی کے قواعد برج بھاشا سے متاثر نظر آتے ہیں اس کا سبب گجرات پر متھراوالوں کا سیاسی تسلط مانا جاتا ہے۔ اسما اور افعال میں گجراتی مغربی ہندی کی مقلد نظر آتی ہے۔ گجراتی میں ادب کا ایک لازوال ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ادبی خزانہ زیادہ تر شعری صورت ہی میں پایا جاتا ہے۔ گجراتی شاعر نرسنگھ مہتا کا کلام اگرچہ گجراتی ادب کا

قیمتی حصّہ ہے مگر اس کا کلام مرور ایام کے ساتھ بدلتا رہا ہے۔ گجراتی کا زیادہ اثر راجستھانی بولیوں جے پوری اور مارواڑی پر پڑا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ سخت مغالطہ ہو جایا کرتا ہے۔

پہاڑی جتھ۔ مشرقی پہاڑی: مشرقی پہاڑی بولیوں میں سب سے اہم نیپالی (NEPALI) ہے جو نیپال میں بولی جاتی ہے اس کو پرتبیا، کورکھالی اور سکھ کرا بھی کہتے ہیں نیپالی دن بدن ترقی کرتی جارہی ہے اس کی مقبولیت اور پھیلاؤ کے سامنے دوسری ساری بولیاں دم توڑتی جارہی ہیں کھمنڈ و کی وادی میں بولی جانے والی زبان سب سے زیادہ نکھری ستھری کہلاتی ہے۔ یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

درمیانی پہاڑی: یہ پہاڑی زبان لسانی نقطۂ نظر سے نہایت دلچسپ ہے مگر چوں کہ اس میں ادب کا کوئی وجود نہیں اور ناقابل عبور پہاڑی علاقوں میں قبائلی زبانوں کے روپ میں ملتی ہے اس وجہ سے زیادہ اہم نہیں ہے درمیانی پہاڑی زبان کی دو شاخیں ہیں۔ الموڑہ اور نینی تال کے اضلاع میں، رائج زبان کماؤنی اور گڑھوال و نیز مسوری کے پہاڑی سلسلوں میں مروج زبان گڑھوالی کے نام سے موسوم ہے۔

مغربی پہاڑی: پہاڑی زبانوں کے سلسلہ میں مغربی پہاڑی زبان کی اہمیت فقط اس حد تک ہے کہ اس کی نمائندہ بیس بولیاں مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں مگر ان کی تحریری شکل میں ادب کی عدم موجودگی کی بناء پر کوئی اہمیت نہیں۔ مغربی پہاڑی زبان کا پھیلاؤ شملہ اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں تک ہے۔

ساری پہاڑی بولیوں کا راجستھانی سے زیادہ قرب نظر آتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کے خیال میں مسلمانوں کے غلبہ کے نتیجہ میں راجپوتانہ کے اکثر خاندان راجستھان چھوڑ کر ان پہاڑوں پر جا آباد ہوئے تھے اس وجہ سے ان زبانوں پر میواڑی اثرات نمایاں ہیں [1]۔

مشرقی جتھ = ہند آریائی زبانوں کی مکانی تقسیم میں دوسرا اہم اور بڑا گروہ مشرقی زبانوں کا ہے کئی حیثیتوں سے اس گروہ کی اہمیت مانی جاتی ہے اپنے پھیلاؤ اور وسیع تر اثر و نفوذ کی بناء پر اس گروپ کو دو بڑے حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک کو پوربی ہندی، شاخ دوسرے کو مانگدھی شاخ کا

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو پروفیسر مسعود حسین خاں

نام دیا جاسکتا ہے۔ ویسے مجموعی اعتبار سے مشرقی جتھ میں، حسب ذیل زبانیں شمار کی جاتی ہیں۔
(۱) کوسالی یا اودھی (۲) بگھیلی (۳) چھتیس گڑھی (۴) اڑیا (۵) بنگالی (۶) آسامی متھیلی، مگھی اور بھوج پوری وغیرہ کا تعلق ماگدھی کی شاخ بہاری سے مانا جاتا ہے جو مگدھی اپ بھرنش کی جانشین ہے اور خاص مگدھ کے علاقہ میں رائج ہے۔ مشرقی ہندی جس کو پوربی ہندی کہا جاتا ہے مغربی ہندی کے مشرقی حصوں میں بولی جانے والی زبان کا نام ہے۔ اس پر مغربی ہندی کے اثرات بھی ملتے ہیں ویسے بہاری سے اس کا گہرا تعلق نظر آتا ہے اس کی مشہور شاخیں حسب ذیل ہیں۔

اردھی یا کوسالی (KOSALI) کوسالی زبان پوربی ہندی کی اہم شاخ ہے اس میں اعلیٰ ادب پایا جاتا ہے۔ یہ مغربی ہندی کے مشرقی حصہ میں زیادہ وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ اس زبان میں زمانہ قدیم ہی سے ادبی سرمائے کا پتہ چلتا ہے اس کا قدیم ترین ادبی کارنامہ "پدماوت" ہے جو علاؤالدین خلجی کی پدمنی کے حصول کے لئے کی گئی کوششوں کی داستان ہے یہ ہندی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف ملک محمد جائسی ہیں۔ انہوں نے فارسی کے بجائے ہندوستانی عناصر سے کام لیا ہے۔ جائسی ایک مذہبی آدمی تھے۔ امیٹھی کے راجہ کی قدر دانی نے جائسی کے فن کو خوب اہمیت دی۔ ان کے علاوہ تلسی داس نے بھی اودھی ہی کو اپنے اظہار کے لئے چنا۔ اس کا رسم الخط دیوناگری ہے فعل کی معمولی شکلیں برج بھاشا کے مشابہ ہیں جیسے آون، جاون کرن وغیرہ مشرقی اودھی کی خصوصیت جداگانہ ہے اس میں فعل کے آخر میں ب آتی ہے جیسے اب۔ جاب کرب وغیرہ

بگھیلی (BAGHELI) مشرقی ہندی کی بولیوں میں بگھیلی زمانہ قدیم میں اپنا بے حد اثر رکھتی تھی اس کے باوجود اس میں ادبی مواد کم کم ہی پایا جاتا ہے لیکن جتنا کچھ ادبی سرمایہ ہے وہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

چھتیس گڑھی اس میں بھی ادب کا بہت تھوڑا ذخیرہ ہے مگر شائع شدہ صورت میں موجود ہے مشرقی ہندی کی اس شاخ کا دائرہ محدود ہے چھتیس گڑھی اور بگھیلی بولنے والوں نے عہد جدید میں ہندی اور اردو زبان کو اپنے ادبی وسیلۂ اظہار کے طور پر قبول کر لیا ہے۔

ہند آریائی زبانوں کے مشرقی جتھ کی اولین شاخ جو پوربی ہندی سے موسوم ہے مندرجہ یا تین ذیلی شاخوں پر مشتمل ہے ان میں جیسا کہ کہا گیا ہے ادبی حیثیت اور اثر و نفوذ کے لحاظ سے کوسالی یا اودھی ہی اہم ترین زبان مانی جاسکتی ہے مشرقی گروہ کی دوسری اہم شاخ ماگدھی زبانوں پر

مشتمل ہے جس کی چار اہم ذیلی شاخیں ہیں، بہاری، اڑیا، بنگالی اور آسامی۔ ان ساری زبانوں کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ انھیں بھی مشرقی اور مغربی گروپوں میں بانٹا جا سکتا ہے بہاری کا تعلق مغربی سے اور مابقی تینوں شاخوں کا مشرقی گروپ سے ہے۔

بہاری (BIHARI) مشرقی جتھ کی سب سے اہم شاخ بہاری ہے جو ماگدھی سے تعلق رکھتی ہے یہ صوبہ بہار کی سب سے اہم زبان ہے بہار کا اگرچہ تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے شمالی ہندوستان سے گہرا تعلق ہے مگر یہاں کی زبانیں اپنے مزاج کے لحاظ سے خالصتاً مشرقی انداز کی ہیں یہی وجہ ہے کہ مغربی ہندی سے کہیں زیادہ بنگالی اور آسامی وغیرہ سے بہاری قریب ہے ایک ہی سرچشمہ کی نسبت کی وجہ سے بھی ان میں ہم رنگی تعجب خیز نہیں۔ بہاری شاخ کی تین زبانیں بہت اہم ہیں۔

متھیلی (MATHELI) یہ صوبہ بہار میں گنگا کے اُتری بھاگوں بالخصوص دربھنگہ کے آس پاس بولی جانے والی زبان ہے علاوہ ازیں اس کا پھیلاؤ مونگیر کے قرب و جوار تک بھاگلپور میں اور منتال پرگنوں تک قائم ہے متھلی کا ایک سرا بنگال تک چلا جاتا ہے اس لحاظ سے بہاری شاخ کی یہ بہت اہم بولی قرار پاتی ہے۔ اس کی وسعت ہی سے اس کی وقعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بولنے والے (۲) کروڑ سے متجاوز ہیں۔

مگہی (MAGHI) بہاری کی دوسری اہم ذیلی شاخ مگہی ہے جو بہار کے صدر مقام پٹنہ کے علاوہ مونگیر اور ہزاری باغ میں مروج ہے اس زبان کو بولنے والوں کی تعداد بھی ایک کروڑ سے زاید بتائی جاتی ہے۔ مگہی اور متھلی ایک دوسرے سے قربت رکھتی ہیں۔ ان زبانوں کا رسم الخط دیوناگری اور کبھی کبھی مخصوص برہمنی لیپی متھلی بھی استعمال ہوتا ہے۔ متھلی رسم الخط بنگالی سے ملتا جلتا ہے۔ ڈاکٹر چیٹرجی نے ان زبانوں پر خصوصیت کے ساتھ نوٹ لکھے ہیں۔ بنگالی زبان سے ان کی قریبی مناسبت لسانی اعتبار سے بے حد دلچسپ ہے۔

بھوج پوری (BHOJPURI) بہاری کی وہ منفرد خصوصیات والی زبان ہے جسے اس سلسلہ میں ایک الگ اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بولنے والے بھی تین کروڑ سے زاید ملنے جاتے ہیں یہ بہار کے علاوہ یوپی کے ضلع گورکھپور، بنارس کے علاقوں اور صوبہ بہار کے شاہ آباد اور چمپارن کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ بھوج پوری، متھلی اور مگہی سے لسانی اعتبار سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چیٹرجی اس کو بہاری بولیوں سے الگ خیال کرتے ہیں۔ بھوج پوری کا اثر و نفوذ بہت وسیع ہے

مرزا پور جون پور اور فیض آباد سے لے کر سون گنڈھک ندیوں تک ہے۔

آسامی (ASHAMIESE) مشرقی جتھ کی مشرقی گروپ کی وہ شاخ ہے جو ہندوستان کے انتہائی مشرقی سرے پر واقع صوبہ آسام کی وادی میں بولی جاتی ہے۔ آسامی گویا ہند آریائی زبانوں کے ہندوستانی سلسلہ کی آخری مشرقی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بولنے والے (۵۰) لاکھ سے نا یدا ور ایک کروڑ سے کم ہیں۔ آسامی عام طور سے بنگالی سے بہت قریب ہے لیکن ادبی لحاظ سے جداگانہ شناخت رکھتی ہے۔ آسامی کی دو شاخیں مشرقی و مغربی آسامی سے موسوم ہیں مشرقی شاخ سیوساگر میں رائج ہے آسامی میں زمانہ قدیم میں بھی ادبی سرمائے کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں آسامی ادب میں روز افزوں اضافہ کا رجحان ملتا ہے۔

اڑیا (ORIYA) مشرقی جتھ کی شاخوں میں اڑیا کی بنیادی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اڑیا بولنے والوں کی تعداد (۲) کروڑ سے زیادہ کہی جاتی ہے۔ یہ ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ میں بولی جاتی ہے اس کا قدیم نام اتکل دیس تھا اس وجہ سے اڑیا کو اتکلی بھاشا سے بھی موسوم کیا جاتا ہے چوں کہ اڑیا قواعد اور لسانی خصوصیات میں بنگالی سے بہت مشابہ ہے اس وجہ سے عام طور پر اسے بنگالی ہی کا ایک روپ مانا جاتا رہا ہے جب کہ اڑیا ایک الگ اور منفرد زبان ہے۔ اس کا ماخذ ماگدھی اپ بھرنش ہے اس لحاظ سے یہ بنگالی کی ہم جنس ہوئی اڑیا بولنے والے ملک کے اکثر صوبوں میں آباد ہیں بڑھوں کے اڑیسہ پر اقتدار کی وجہ سے اڑیا زبان میں مرہٹی الفاظ بھی ملتے ہیں اڑیا کا رسم الخط بے حد مشکل ہے اڑیا میں ادبی سرمایہ بھی ملتا ہے۔

بنگالی (BENGALI) مشرقی جتھ کی زبانوں میں سب سے زیادہ اہم زبان بنگالی قرار پاتی ہے صوبہ بنگال، وادی آسام کے کچھ حصوں، سلہٹ اور بہار کے مشرقی علاقوں میں بولی جانے والی اس زبان کی دو حیثیتیں ہیں ایک شہری اور ایک دیہی دونوں میں بہت نمایاں فرق و امتیاز ہے اس کے بولنے والے کئی کروڑ افراد ہیں۔ موجودہ دور میں بنگلہ دیش میں اس کی سرکاری حیثیت ہے۔ بنگالی کو دو اہم حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ مغربی اور مشرقی۔ مغربی بنگالی کا مرکز کلکتہ اور مشرقی کا ڈھاکہ ہے۔ ادبی سرمائے کے لحاظ سے بنگالی اعلیٰ پایہ کی زبان مانی جاتی ہے۔ بنگالی میں سنسکرت کا غالب اور نمایاں اثر ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے بنگالی برابر ارتقائی منزلیں طے کر رہی ہے۔ بنگلی کے آس پاس کی زبان دراصل ادبی بنگالی کی بنیاد ہے۔ بنگالی زبان کی صوتیاتی خصوصیت (آ) کا (او) سے (س) کا (ش)

سے بدل جاتا ہے۔ بنگالی میں بہت قابل قدر اعلیٰ پایہ کا معیاری ادب ملتا ہے۔ ادبی شان اور سرمائے کے لحاظ سے بنگالی سارے ہندوستان کی زبان میں ایک منفرد حیثیت کی حامل زبان ہے عصر حاضر میں بنگالی زبان کی ترقی قابل رشک ہے۔

وسطی جتھہ یا مدھیہ دیش کی زبانیں: ہند آریائی خاندان کی ہندوستانی زبانوں کی گروہ بندی کے لحاظ سے انھیں چھ جتھوں میں منقسم کیا جاتا ہے ان کے منجملہ پانچ کی تفصیلات اجمالاً گزر چکی ہیں اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی وسطی گروہ ہے جسے مدھیہ دیش کی زبانوں سے موسوم کیا جاتا ہے وسطی گروہ کو مغربی ہندی سے پہچانا جاتا ہے۔ مغربی ہندی کا حلقہ اثر کسی بھی دوسری زبان کے مقابل بے حد وسیع و عریض ہے ہر مند سے لے کر الہ آباد تک اور ہمالیہ کے دامن سے وندھیاچل اور بندیل کھنڈ تک لگ بھگ (۱۲) کروڑ لوگ مغربی ہندی کی مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ مغربی ہندی کو ہم آریائی زبانوں کی سب سے شائستہ، معیاری اور بہترین نمائندہ شاخ کہہ سکتے ہیں۔ گریرسن کی تقسیم کے لحاظ سے یہ اندرونی گروہ سے تعلق رکھتی ہے مختلف گروہوں کی زبانیں مغربی ہندی سے بے حد متاثر نظر آتی ہیں جن میں قابل ذکر پنجابی، راجستھانی گجراتی وغیرہ ہیں مغربی ہندی کے علاقے میں زمانہ قدیم ہی سے تہذیبی، مذہبی اور لسانی ارتقاء کا سلسلہ جاری رہا۔ یہیں پر ویدک، سنسکرت شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش نشو ونما پائیں اور پروان چڑھیں۔ مغربی ہندی کا تعلق شورسینی اپ بھرنش سے ہے مغربی ہندی کا مرکز ہمیشہ ہی متھرا رہا ہے۔ مغربی ہندی ادبی حیثیت سے پورے مدھیہ دیش میں نافذ رہی۔ اس کے گہرے اثرات پنجابی سے لے کر بنگالی تک کی دور دراز کی زبانوں پر ملتے ہیں جب کہ راجستھانی اور گجراتی پر بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔ مغربی ہندی کی صوتیات صرفی و نحوی قواعد اور دیگر لسانی خصوصیات اس کو سب سے جداگانہ شناخت عطا کرتے ہیں۔ مغربی ہندی میں ترکیبی خصوصیات کی جگہ تفصیلی رجحان ملتا ہے مغربی ہندی کی پانچ شاخیں ہیں جو شورسینی اپ بھرنش کی جانشین زبانوں کی حیثیت سے جدید ہند آریائی زبانوں میں اپنا ممتاز مقام رکھتی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) برج بھاشا (۲) کھڑی بولی یا ہندوستانی (۳) بندیلی (۴) قنوجی (۵) ہریانی ماہرین نے ان پانچ بولیوں کو چند لسانی خصوصیات کی بناء پر دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے جن میں نمایاں، متباز (۱) اور (او) کا بتایا ہے وہ یہ ہیں۔

(او) کو ترجیح دینے والی بولیاں برج بھاشا۔ بندیلی اور قنوجی ہیں۔

(۱) کی شکل رکھنے والی بولیاں ہریانی اور کھڑی بولی ہیں [1]

برج بھاشا (BRIJ) جنوبی ہندی کی بولیوں میں سب سے اہم اور کئی خصوصیات کی بناء پر سب سے منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس کا مرکز متھرا ہے اپنے مرکز میں یہ سب سے زیادہ اپنے معیار کو برقرار رکھی ہوئی ہے۔ متھرا ہندو تہذیب و تمدن کا ابتداء ہی سے مرکز اول رہا ہے۔ برج بھاشا پر سنسکرت کا غالب اثر ملتا ہے اپنے مرکز سے جس قدر دور ہوتی گئی اس پر مقامی اثرات پڑتے گئے برج کا حلقہ اثر و نفوذ بیحد وسیع و عریض ہے شمالاً جنوباً شرقاً غرباً یہ دور، دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے شمال میں ضلع گوڑگاؤں کے مشرقی علاقوں تک، جنوب میں آگرہ، متھرا پور، دھول پور، کرول، گوالیار اور جے پور کے مشرقی علاقوں تک، شمال مشرق میں بلند شہر، علی گڈھ، ایٹہ میں پوری بدایوں اور بریلی کے اضلاع ٹینی تال کے ترائی پرگنوں تک مغرب میں متھرا اور بلند شہر تک یہ بولی جاتی ہے۔

ہندستانی یا کھڑی بولی (HINDUSTANI) مغربی ہندی کی سب سے زیادہ وقیع بولی جسے گریرسن نے ہندستانی کا نام دیا ہے دراصل وہ کھڑی بولی ہے جو مغربی روہیل کھنڈ، دوآبہ گنگ و جمن کے شمال اور پنجاب کے ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہے۔ رامپور، مراد آباد، بجنور، مغربی روہیلکھنڈ، مظفر نگر، سہارن پور، دہرہ دون کے میدانوں، پنجاب میں کالیا، پٹیالہ وغیرہ میں بھی اس کا چلن ہے۔ کھڑی بولی پر عربی فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ مختلف علاقوں میں کھڑی بولی مقامی اثرات بھی قبول کرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ مظفر نگر کے دیہاتوں میں عربی سے اس کے اختلاط کا ثبوت یہ الفاظ ہیں۔ ماں کے عربی مترادف "والدہ" کی "مالدہ" شکل ملتی ہے اسی طرح محافظت کو مہوجت انتقال کو وفات کال اور مطلب کو مطبل کہا جاتا ہے [2]

ہندستانی یا کھڑی بولی مغربی ہندی کے شمال مغربی علاقوں کی بولی ہونے کی وجہ سے اس کے روابط مغرب میں پنجابی سے اور راجستھانی آمیز یا نگرلو کے علاوہ شمالی پہاڑی بولیوں کے ساتھ اور جنوب میں برج بھاشا سے قائم ہیں کیونکہ ان تمام زبانوں کے گھیرے میں ہے۔ اس ضمن میں گریرسن کا یہ ادعا کہ ہندستانی کا ڈول دیگر بولیوں کے مقابل برج سے زیادہ قریب ہے گریرسن کے اس خیال کی تائید لال نے بھی کی ہے [3]

اس خیال کی تردید مسعود حسین خاں صاحب نے مدلل انداز سے کی ہے [4]۔

---

[1] تاریخ زبان اردو پروفیسر مسعود حسین خاں ص ۸۲

[2] [3] لسانیاتی جائزہ ہند، جلد نہم حصہ اول۔ ہندستانی بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۹ لچھا ایڈیشن

[4] تاریخ زبان اردو ص ۹۳۔

"انہوں نے لکھا ہے کہ بعض نجی خصوصیات کی بناء پر ہم اسے برج میں ضم نہیں کر سکتے"[1]

بندیلی (BUNDELI) مغربی ہندی کی اس شاخ کو تبدیل کھنڈی بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ بندیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے اور اس کی مغربی ہندی کی بولیوں میں مرکزی حیثیت ہے اس لئے کہ یہ وسط ہند میں بولی جاتی ہے۔ اس کے حدود اربعہ یا نداہمیر پور جالون جھانسی کے علاوہ وسطی ہند کی اکثر ریاستوں پر مشتمل ہیں اس کی مقبولیت شمال میں آگرہ میں پوری اودھ ایٹہ مین پوری اور مشرق میں بگھیلی کے حدود تک قائم ہے اس کے شمال میں قنوجی اور برج مہاشا اور جنوب میں راجستھانی رائج ہے۔ جنوب میں مرہٹی کو چھوڑ کر وہ اپنے ہمسایہ زبانوں سے ان علاقوں میں گھل مل سی جاتی ہے جہاں جہاں دوسری بولیوں کا واضح اثر ہے۔ بندیلی اس لحاظ سے بے حد پھیلی ہوئی زبان ہے اس میں ایک ٹھہراؤ اور یکسانگی نمایاں ہے۔ اس میں ادب کا قابل قدر سرمایہ موجود ہے مشہور شاعر اور نقاد کیشو داس اور پدماکر گزشتہ بندیلی سے ہی ہے۔ لسانی اعتبار سے بندیلی کی صوتیاتی خصوصیات اس کو دوسری بولیوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس میں اے (ڑا) سے اُو (اُ) سے اور ڈ (ر) سے بدل جاتے ہیں اس میں (ہ) گرا دی جاتی ہے کہی کی جگہ کئی آہو کی جگہ اوکا استعمال اس کی انفرادیت ہے۔ بہت کی جگہ بہوت کا رواج ہر جگہ نما ہے۔

بعض ماہرین لسانیات اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ کھڑی بولی شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہے۔ شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ شورسینی سے برج پیدا ہوئی نہ کہ کھڑی بولی برج کھڑی کی نہ ماں ہے نہ بہن۔ ڈاکٹر جیسوال بھی یہ نہیں مانتے کہ کھڑی شورسینی سے ماخوذ ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ کھڑی "آ" لہجے کی زبان ہے جو "او" والی شورسینی سے جنم نہیں لے سکتی لیکن انہوں نے کوئی ایسی قابل قبول دلیل پیش نہیں کی جس کی بناء پر مان لیا جائے کہ کھڑی بولی ان کے اپ بھرنش سے ماخوذ ہے۔

قدیم مستند تحریری دستاویزوں کی عدم موجودگی میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کھڑی حقیقت میں اپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہے۔

---

[1] تاریخ زبان اردو ص ۹۳

قنوجی (QUANOJI) ضلع فرخ آباد کے شہر قنوج کی نسبت سے مغربی ہندی کی یہ بولی قنوجی کا نام قنوجی پڑ گیا۔ قنوجی ایٹہ فرخ آباد اور شاہ جہاں پور کے حصوں میں رائج ہے بلکہ اس کی سرحدیں کانپور اور ہردوئی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ البتہ مرکز یعنی قنوج سے دور یہ مقامی بولیوں کے اثرات قبول کرتی نظر آتی ہے پیلی بھیت میں یہ برج سے، جنوب میں بندیلی سے مشرق میں پوربی ہندی سے گھل مل جاتی ہے۔ کانپور اور ہردوی میں حروف صحیح کے ختم پر (ی) کے اضافہ کی خصوصیت کے ساتھ بولی جاتی ہے جیسے بعد کو لوری اور دور کو دوری کہا جاتا ہے مغربی فارسی الفاظ میں بھی اس طرح کے اضافے قنوجی کی خصوصیت ہے اس میں کم ادبی سرمایہ ملتا ہے۔ چوں کہ ترقی یافتہ برج بھاشا کے سامنے اس کو پیچھے کر دیا تاہم قواعدی اعتبار سے یہ برج سے بہت قریب نظر آتی ہے۔ اس کی لسانی خصوصیات اور برج کے ساتھ قربت نے گریرسن جیسے محقق کو اسے علیحدہ زبان ماننے کے ضمن میں پس و پیش میں مبتلا کر دیا۔

ہریانی (HARYANI) مغربی ہندی کی اس شاخ کو بانگرو اور جاٹو کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ چوں کہ نواح دہلی میں جاٹ قبائل اسی زبان کو بولتے ہیں اس وجہ سے دہلی میں خصوصیت سے جاٹو بولی جاتی ہے۔ یہ دہلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال، رہتک اور حصار وغیرہ میں مروج ہے۔ موجودہ صوبہ ہریانہ کے تمام علاقوں کی زبان یہی ہے۔ ہریانی ایک قدیم بولی ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی رائج تھی۔ ہریانی نومسلم لوگوں اور نواح دہلی میں بسنے والوں کی قدیم زبان ہے۔ دارالسلطنت دہلی سے قربت کی بنا پر ہر سیاسی انقلاب، تبدل اور انقلاب کا اثر براہ راست قبول کرتی رہی۔ پنجابی اور راجستھانی بولیوں کے نمایاں اثرات نے ہریانی کو ہمیشہ ماہرین کے لئے ایک معمہ بنا رکھا ہے چنانچہ کئی مماثلتوں اور لسانی خصوصیات کی یکسانی کی بنا پر گریرسن نے موجودہ ہریانی کو کھڑی بولی کی ہی ایک شکل بتایا ہے

ہریانی زبان کئی وجوہات کی بنا پر بے حد اہمیت حاصل کر گئی ہے چوں کہ مسلمانوں کے عہد میں ہریانہ ہی یا یہ تخت سے قریب تھا لحاظ فوجی بھرتی اسی علاقہ سے زیادہ تر ہوتی تھی اور دہلی میں فوجی چھاؤنیوں میں سب سے زیادہ ہریانی یا جاٹو یا بانگرو ہی کا بول بالا تھا۔ اس میں ایک حد تک قابل قدر ادبی مواد بھی ملتا ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ اہم بولیوں کی تفصیلات اور ان کے پھیلاؤ حلقہ اثر و نفوذ و نیز ان کی لسانی اہمیت کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہند آریائی زبانوں کے اندرونی حلقہ کی بولیوں [illegible]

مغربی ہندی لی خصوصیتوں کی بنا پر بے حد وقیع وسیع اور عظیم الشان علمی ادبی سرمائے سے مالا مال زبان ہے اس کے ادبی خزانوں میں علوم وفنون، مذہب، تاریخ، ثقافت اور شعر وسخن کا گراں قدر مواد موجود ہے۔ یہ شورسینی اپ بھرنش کی سچی اور حقیقی جانشین بھی ہے اور جدید ہندآریائی زبانوں کا سرچشمہ نیسان بھی۔ ہندوستان کی قومی زبان ہندی اور ہندوستان کی ادبی نمایندہ زبان اُردو کا تعلق بھی اسی مغربی ہندی کے سرچشمہ سے ہی ہے اس لحاظ سے بھی اس کی اہمیت اور وقعت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

مغربی ہندی ایک تاریخی تسلسل کی حامل ادبی زبان ہے جس کی قدامت مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم ادبی نمونے اس کا ثبوت ہیں۔ جن میں سے بعض شایع ہوچکے ہیں۔ اس سلسلہ کا قدیم ترین نمونہ چند بردائی کی نظم پرتھی راج راسو ہے اس نظم میں (۶۹) بند ہیں اس کا موضوع پرتھوی راج اور محمد غوری کے معرکے ہیں اس نظم میں فارسی الفاظ کی موجودگی مسلمانوں کے ہندوستان میں داخلہ کی قدیمی شہادت ہے چند بردائی لاہور کا باشندہ تھا جہاں بہت پہلے مسلمانوں کے قدم مضبوط ہوچکے تھے۔ یہ نظم بعد میں ام سنگھ میواڑی نے مرتب کی ممکن ہے اس میں کچھ کمی وبیشی ہوئی ہو تاہم چند بردائی کی اصل زبان کے نمونے ضرور موجود ہیں۔

قدیم مغربی ہندی میں غیر برہمن مصنفین اور شعراء کی تصانیف جو بالعموم مذہبی نوعیت کی حامل ہیں ادبی اعتبار سے بے حد اہم اور مغربی ہندی کی ادبی شان اور قدامت کا ثبوت ہیں۔ مغلیہ عہد میں شہنشاہ اکبر کے زمانے میں مغربی ہندی کے علمی وادبی ذخیرے میں قابل قدر اضافے ہوئے فیضی بیربل، تان سین اور خانخاناں کی ہندی شاعری اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اسی عہد میں سورداس اور بہاری لعل کے کارنامے بالخصوص سورساگر تو برج شاعری کا اعلیٰ ترین مرقع ہیں [1]

مغربی ہندی۔ ہند آریائی زبانوں کی ایک نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ساری زبانوں میں ایک علامت اور معیار کی حیثیت رکھتی ہے بل کہ قدیم ویدک، سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش کا سب سے اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔ اس کے اثرات ہندوستان کی تمام زبانوں پر نظر آتے ہیں بالخصوص مشرق میں بنگالی اور مغرب میں راجستھانی شمال مغرب میں پنجابی پیاس کی گہری چھاپ نمایاں ہے قواعد کے اعتبار سے بھی یہ انفرادیت کی حامل ہے اس میں ایک زمانہ فعل کے لئے ایک حالت اسماء کے لئے پائی جاتی ہے اسماء اور افعال کی دیگر تمام حالتیں حروف فعل امدادی اور سابقوں لاحقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہے[2]

---

[1] ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر زور ص ۷۲

[2] مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ مسعود حسین خاں ص ۸۱

ہند آریائی اور اُردو

حصّہ (ب)

حصّہ (ب)

باب اوّل

اُردو زبان کی ابتدا کے بارے میں نظریات

THEORIES ABOUT THE ORIGIN OF URDU.

برصغیر ہندو پاکستان کی موجودہ اکثر زبانوں کا ہند آریائی (شاخ ہند یورپی) لسانی کنبہ سے براہ راست تعلق ہے اور زمانے کے لحاظ سے یہ عہد جدید کی زبانیں ہیں مروّجہ زبانوں کا مطالعہ موضوع کا تقاضہ اور معلوماتی نقطہ نظر سے مفید ہے۔ ویسے مروجہ زبانوں سے واقفیت لسانیات کے طالب علم کی نصابی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستان و پاکستان میں رائج بے شمار زبانوں میں بعض کا حلقہ بے حد وسیع اور عریض ہے اور بعض محدود علاقوں میں محصور ہیں تاہم ان سب کی اپنی اپنی جگہ جو ضرورت اور اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چوں کہ برصغیر میں ہند آریائی خاندان کے علاوہ دیگر خاندان السنہ کی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں اور جن کی تفصیلات پچھلے صفحات پر گذر چکیں ہیں یہاں ان کے اعادہ کی حاجت نہیں صرف ہند آریائی لسانی کنبہ کی وہ زبانیں جو آج بھی زندہ اور باقی ہیں کا ذکر ہوگا ان زبانوں میں سے چند مشہور زبانیں یہ ہیں (۱) ہندی (۲) اُردو (۳) بنگالی (۴) بہاری (۵) پنجابی (۶) سندھی (۷) راجستھانی (۸) اڑیا (۹) مرہٹی (۱۰) گجراتی (۱۱) کشمیری (۱۲) ہریانوی (۱۳) سنسکرت (۱۴) گرمکھی (۱۵) پہاڑی (۱۶) نیپالی (۱۷) گڑھوالی (۱۸) کمایونی (۱۹) آسامی وغیرہ ان میں ہر زبان کی کئی کئی شاخیں ہیں ان کے علاوہ اور بے شمار زبانیں اور بولیاں ہیں جنھیں طوالت کے اندیشے سے پیش نہیں کیا جا رہا ہے ان

سب کے منجملہ ہندی اور اردو کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے سب ہی بخوبی واقف ہیں۔ ہندی، ہندستان اور اردو پاکستان کی سرکاری زبانوں کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ یہ اپنا اپنا وسیع تر حلقۂ اثر رکھتی ہیں کروڑوں لوگ ان زبانوں کو بولتے ہیں ان کے پھیلاؤ اور اثر و نفوذ کے حدود کا تعین مشکل ہے ہندو پاکستان کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جہاں یہ بولی اور سمجھی نہ جاتی ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ چند بنیادی خصوصیات کی بناء پر ہندی اور اردو اپنی جداگانہ شناخت رکھتی ہیں لسانی اعتبار سے ان کا الگ الگ مقام متعین ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اردو لطافت، چاشنی اور دلآویزی کی وجہ سے ایک منفرد کشش رکھتی ہے یہاں ہمارا موضوع بھی اردو زبان ہے اس لحاظ سے اُردو کے بارے میں کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

برصغیر ہند و پاک کی کسی بھی زبان کے مقابل اُردو کی ادبی شان سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس زبان میں علوم و فنون کے خزانے، حکمت (سائنس) مذہب، سماجیات، سیاسیات، طب، منطق، فلسفہ، کلام، تنقید کے علاوہ نثری ادب اور شاعری کا جو گراں قدر ذخیرہ ملتا ہے شاید ہی کسی اور زبان میں دستیاب ہو سکے۔ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق معلوماتی مواد کی اردو میں موجودگی اس کی ہمہ گیر مقبولیت کی علامت ہے یہ بھی سچ ہے کہ اردو اپنی ابتداء سے لے کر آج تک اپنے ارتقاء کے سفر میں مشغول ہر لمحہ ترقی کے زینے طے کرتی آج وہ اس مقام تک پہنچ چکی ہے جہاں سے اس کا تقابل دنیا کی کسی بھی شائستہ اور ترقی یافتہ زبان کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اُردو زبان کے اس عالی شان موقف کی مختصر سی وضاحت کے بعد ہم اپنے موضوع پر آتے ہیں۔

اردو زبان کی ابتداء کس سے کب اور کہاں ہوئی؟ یہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے جو علماء لسانیات کی تحقیقات، تلاش و جستجو اور دلچسپیوں کا محور ہے ہندوستانی زبانوں کا شاید ہی کوئی ماہر ہوگا جس نے اس اہم عنوان پر کچھ نہ کچھ کام نہ کیا ہو لیکن آج تک اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکی جو حرف آخر کہلائی جا سکے۔ جب بھی کسی نے کوئی رائے قائم کی اس کی مدلل تردید کر دی گئی۔ ہمارے ماہرین کے تحقیقی کارنامے اس کا ثبوت ہیں۔ تاہم بعض بنیادی باتوں پر عام اتفاق رائے بھی پایا جاتا ہے جس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

اُردو زبان کی پیدائش کے ضمن میں بالعموم محققین اور ماہرین ایک رائے قائم کر کے آگے بڑھتے ہیں اور اپنے، اپنے قائم کردہ خطوط پر کام کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں جداگانہ خیالات سامنے آتے ہیں جو ایک

دوسرے سے میل نہیں کھاتے ۔ بعد والے ان خیالات کی نفی اپنی تحقیق کی روشنی میں کرتے ہیں اور کوئی نیا نظریہ پیش کرتے ہیں یہ سلسلہ کچھ اس حد تک دراز ہو گیا ہے کہ طلباء کے لئے سوائے الجھنوں میں اضافے کے کوئی کارآمد رہنمائی نہیں ہو پا رہی ہے ۔

اُردو کی ابتداء، اردو کا سرچشمہ اور زمانۂ آغاز کے بارے میں اس نظریاتی کشاکش کے بنیادی اسباب کی کھوج، موضوع پر اظہار سے پہلے ناگزیر اور مفید ہوگی۔

(۱) اس نظریاتی تصادم کا پہلا سبب اس موضوع پر قدیمی مواد کی کمی ہے ۔

(۲) جس قدر مواد دستیاب ہے وہ تحریف و الحاق کے غالب شبہات کی بناء پر ناقابل اعتماد ہے۔

(۳) اُردو زبان کے آغاز کے دور کی کوئی قابل بھروسہ تصانیف مخطوطات یا تحریروں کی عدم موجودگی اس کا تیسرا سبب ہے ۔

(۴) چوتھی وجہ اس بارے میں محض مفروضات پر انحصار ہے۔

(۵) اُردو زبان کے آغاز کے بعد یعنی نشو ونما اور پھیلاؤ کے ابتدائی عہد کی مستند تحریروں اور حوالوں کا فقدان ہے جس سے کم از کم حقیقت حال تک پہنچنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ایسی صورت حال میں کس طرح کوئی حتمی فیصلہ ممکن ہے یا قطعی بات کہی جا سکتی ہے مندرجہ بالا اسباب کی روشنی میں اگر کوئی نظریہ قائم کر لیا بھی جائے تو اس کی تردید اور تعریف کی گنجائش رہے گی۔

تاہم لامحالہ ان ذریعوں پر انحصار کرنا ہی پڑے گا جو اس سلسلہ میں تھوڑی بہت معلومات بہم پہنچاتے ہیں اگرچہ کہ ایسے ذرائع بہت محدود ہیں اور ناکافی بھی مگر ان کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ۔

اُردو کی ابتداء کے بارے میں جتنا کچھ مواد ملتا ہے وہ قدیم تذکروں، بیرونی سیاحوں کے سفرنامے غیر ملکی محققین کی تصانیف بعض مخطوطات، چند تحریریں اور عصر حاضر کی اس عنوان پر تحقیقات پر مشتمل ہے فرانسیسی، انگریزی، ہندی اور اردو کی چند موضوعاتی کتابوں میں اس ضمن میں جو باتیں ملتی ہیں ان سے کسی نہ کسی حد تک ضرور نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ تو ابتدا کے ضمن میں بات ہوئی جہاں تک سرچشمہ کا سوال ہے یہ خالصتاً ماہرین لسانیات کی کاوشوں سے متعلق ہے زبان کی ساخت، بناوٹ، قواعدی اصول، صرفی و نحوی نوعیت اور زبان کی خصوصیات پر غور و خوض، اس کے تجزیے تاریخی و تہذیبی پس منظر میں تقابلی مطالعہ کے ذریعہ وہ جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ قریب قریب صحیح اور قطعی ہوا کرتے ہیں اُردو کے سرچشمہ کی تلاش میں ہمارے قابل احترام علماء کرام نے جو کوشش کی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں انگریز، فرانسیسی اور

ہندستانی ماہرین کی خدمات قابل ستایش ہیں بیرونی علما میں پروفیسر جوس بلوک، ہورن لے وغیرہ اور مقامی حضرات میں محمد حسین آزاد پروفیسر محمود شیرانی چٹرجی ڈاکٹر عبداللطیف، مولانا سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر شوکت سبزواری، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر سید عبداللہ، رام بابو سکسینہ اور نصیر الدین ہاشمی اور جمیل جالبی وغیرہ کی خدمات قابل قدر اور ان کے ماخذات اس موضوع کو نئی روشنی عطا کرتے ہیں۔

تہذیبی اختلاط کا نظریہ

اُردو کے آغاز کے ضمن میں مختلف ماہرین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا جائزہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول "ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط" کا نظریہ ہے اس نظریے کے پس منظر میں چند تاریخی حقائق کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان میں ہزاروں سال پیشتر سے بیرونی عناصر کی آمد کا لامتناہی اور مربوط سلسلہ ایک تاریخی سچائی ہے پچھلے ابواب میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا یہ خیال بڑا دلچسپ اور معقول ہے "ہندوستان کی سرزمین پر حیوان نے ارتقاء کی منزلیں طے کر کے انسان کی شکل کبھی بھی اختیار نہیں کیا۔" بلکہ زمانہ قدیم ہی سے انسانی گروہ یہاں آتے اور بود و باش اختیار کرتے رہے۔ نیگرائڈ قبائل، پروٹو آسٹرالائڈ خاندان، آسٹرک قوم اور دراوڑیوں کی یکے بعد دیگرے آمد کے نتیجہ میں یہاں قدیم تمدنی زندگی کے آثار ملتے۔ ان کے بعد آریہ قوم کی بڑے پیمانہ پر آمد نے گویا ہندوستان کو تہذیبی اعتبار سے ایک نئی زندگی عطا کر دی۔ آریاؤں نے سرزمین ہند کے قدیم باشندگان پر سیاسی غلبہ تو حاصل کر لیا لیکن ان کے تہذیبی و معاشرتی عناصر کے ساتھ تعرض نہ کیا اور اپنے اقدار کی پاسداری میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی جس کے نتیجہ میں ایک ملے جلے تمدن اور مشترک تہذیب کی داغ بیل پڑی جو رفتار زمانہ کے ساتھ ترقی کرتی گئی یہ کثرت میں وحدت کی ایک دلآویز مثال تھی۔ اس مشترکہ تہذیب کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑا بالخصوص زبانوں کے بارے میں مفاہمانہ فضا نے علوم و فنون سے مالا مال آریائی زبانوں کی ترویج اشاعت توسیع اور ترقی میں اہم رول ادا کیا پرانی ہندوستانی زبانیں سکڑ[1] کر رہ گئیں اور محدود حلقوں میں محصور سی ہو گئیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کئی حیثیتوں سے ایک عظیم واقعہ تھی چوں کہ مسلمان ایک جداگانہ نوعیت

---

[1] ہند آریائی اور ہندی

کی تہذیب اور معاشرت رکھتے تھے۔ مذہبی اعتبار سے ان میں اور مقامی باشندوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان کے اعتقادات کسی طرح ہندوستانیوں کے عقائد سے میل نہیں کھاتے تھے زیادہ تر براعظم ایشیا اور آفریقہ کے صحرائی ملکوں کے باشندگان ترک اور عرب ہونے کے لحاظ سے ان کا طرز زندگی الگ ڈھنگ کا تھا سب سے بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں ایک فاتح قوم کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے آزاد منش حریت پسند اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر کاربند ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیف وحکومت ہونے کا خیال انھیں مقامی لوگوں سے ذہنی طور پر اپنے آپ کو برتر سمجھنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنا فکری اثاثہ اور معاشرتی آئین دینز لسانی خزانہ بھی لائے تھے مگر یہاں کے جداگانہ ماحول میں انھیں ایک فیصلہ کن منزل سے بھی گذرنا پڑا انھیں دو راستوں میں ایک راستہ اختیار کرنا تھا۔

(۱) ہندوستان پر اپنا سیاسی غلبہ برقرار رکھنا اور اقتدار قائم رکھنا تھا یا

(۲) ہندوستان میں رہتے ہوئے اقتدار کی پروا کئے بغیر اپنے مذہب معاشرت تہذیب اور زبان کی حفاظت کرنی تھی۔

انہوں نے اوّل الذکر بات کو ترجیح دی جب کہ مؤخر الذکر کا ذمہ صوفیا اور بزرگان دین نے لیا۔ عام مسلمانوں اور رائج و حکمران طبقہ کو زیادہ تر حکومت و اقتدار سے ہی دلچسپی رہی۔ ظاہر ہے انھیں سیاسی غلبہ کی بقا اور اقتدار و حکومت کی سلامتی کے لئے طاقت و قوت کے مظاہرہ کے ساتھ ساتھ مقامی باشندگان کے ساتھ زمانہ امن میں مفاہمانہ رویہ اپنانا ناگزیر تھا۔ جو انہوں نے بخوشی اپنایا۔

اور مقامی باشندگان کے لئے بھی ضروری تھا کہ نو وارد فاتحین "جن میں عرب اور ترک شامل تھے اور جن کی زبانیں عربی، فارسی اور ترکی تھی" کے ساتھ روادارانہ سلوک کریں تاکہ پرامن فضا قائم رہ سکے۔ ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں یہ ایک انقلاب آفرین موڑ تھا۔ حالات کبھی بھی نازک صورت اختیار کر سکتے تھے جس کا اثر دیرپا رہ سکتا تھا تہذیبی اقدار کا خاتمہ بھی ممکن تھا مگر دونوں فریقوں نے آپسی مفاہمانہ رویے سے حالات کو بگڑنے نہ دیا بلکہ بہت جلد ان پر قابو پا لیا۔ اگرچہ کہ دونوں طرف کے انتہا پسند عناصر کے لئے یہ مفاہمانہ روش ناقابل برداشت تھی مگر حالات نے انھیں بہت جلد آگاہ کر دیا کہ نظام سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہ دیگا لہذا انہوں نے آپسی بھائی چارگی اور دوستی کو فروغ دینے میں ہی بھلائی سمجھی۔ اس بات سے دونوں فریقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع ملا اور ایک خوشگوار فضا قائم ہو سکی۔

ہندوستان کے باشندگان ہند آریائی لسانی کنبہ کی مختلف زبانیں بولا کرتے تھے شمالی ہند میں جہاں پنجابی، سندھی اور مغربی ہندی کی مختلف بولیوں کا رواج تھا اور یہ زبانیں مسلسل ترقی پذیر تھیں، تھیں جب کہ مسلمانوں کی زبانیں عربی، فارسی اور ترکی تھیں جو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار کی جاتی تھیں ہندستانیوں اور مسلمانوں کی زبانوں میں کئی لحاظ سے بڑا فرق تھا جو بعد المشرقین تھا زبانوں کا یہ فرق بھی ان کے ارتباط میں بڑی حد تک مانع تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی میل جول اور ربط وضبط کے نتیجہ میں جو سب سے پہلی بڑی اہم اور شدید ضرورت محسوس کی گئی وہ کسی ایسی مشترک زبان کے وجود کی تھی جو ان دونوں فرقوں کے لئے قابل فہم ہو تاکہ کاروبار حیات میں آسانی اور مشترک معاشرت کی ضرورت کی تکمیل کر سکے۔ ماہرین کا عام طور پر اس بات پر اتفاق ہے کہ اسی ضرورت نے ہندوستانی زبانوں اور عربی فارسی اور ترکی کے اختلاط سے ایک نئی زبان کو جنم دیا جو اردو زبان کا اولین سرچشمہ ہے۔ مختلف علماء لسانیات نے اس نئی مشترک زبان کو مختلف نام دیئے ہیں تاہم معمولی سے ردوبدل کے ساتھ یہ نظریہ تقریباً ہر محقق کے پاس ملتا ہے۔

سندھی نظریہ

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی سندھ پر عرب حکمرانوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی ایک مستحکم حکومت قائم ہو چکی تھی جس کا سلسلہ کئی سو سال تک باقی رہا۔ سندھ کے فاتح مسلمانوں کی زبان خالص عربی تھی مقامی لوگوں کی آریائی زبان سے عربی کا ربط وضبط ایک نئی زبان کے وجود کا سبب بنا یہ نظریہ اگرچہ کہ پوری طرح رد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نئی زبان کیا اردو ہے اس بارے میں بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ نئی زبان اردو نہیں ہو سکتی کیوں کہ اردو پر عربی سے کہیں زیادہ فارسی کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔

ملاباری نظریہ

شمالی کے علاقہ سندھ میں جب مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہو رہی تھی جنوب میں ساحل ملابار پر عرب تاجروں کی آمد ورفت عروج پر تھی۔ انہوں نے جنوبی ہندستان کے ساحلی شہروں میں سکونت بھی اختیار کر لی تھی اور مقامی باشندوں سے مصاہرانہ رشتے بھی قائم کر لئے تھے جن کی نسلیں آج بھی ٹامل ناڈو اور کیرالا میں موجود ہیں اس بین قومی میل جول سے ایک نئی زبان نے جنم لیا بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہی اردو زبان کی ابتدا اور اس کا سرچشمہ ہے ڈاکٹر زور صاحب نے بہت معقول اور مدلل انداز سے اس کا رد کیا ہے وہ کہتے ہیں "اردو ایک آریائی زبان ہے"[1]۔

---

[1] ہندوستانی لسانیات صـ۹۲ ڈاکٹر زور

قدیم غرب مہاجروں نے دراوڑی زبانوں کے علاقہ میں قیام کیا اور ان میں سے بعضوں نے مہاراشٹرا میں اگر اس میل جول سے کوئی زبان پیدا ہوتی تو اس پر دراوڑی زبان یا مرہٹی یا عربی کا نمایاں اثر ہوتا جب کہ اُردو پر زیادہ اثر فارسی کا ہے۔ لہٰذا اُردو کا سرچشمہ جنوبی ہند ہے۔ یہ بات خود بخود رد ہو گئی۔

پنجابی نظریہ

"اُردو کی ابتداء پنجاب سے ہوئی" یہ ایک اہم اور مشہور نظریہ ہے جس پر گذشتہ کئی دہوں سے سنجیدہ مباحث کا سلسلہ جاری ہے جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں ان کے دلائل سے قطع نظر اس نظریہ میں کسی حد تک معقولیت بھی جھلکتی ہے کیوں کہ سندھی اور مالاباری نظریات کے ماننے میں جو استدلالی سوالغت تھی یہاں وہ موجود نہیں۔ کیوں کہ سندھی کا عربی سے اختلاط ہوا تھا جبکہ اُردو پر زیادہ اثر فارسی کا ہے اسی طرح مالابار کی سواحلی زبانیں دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جن پر عربوں کی زبان کا اثر پڑا جبکہ اُردو قطعاً آریائی زبان ہے اور پنجابی کا تعلق بھی اسی کنبہ سے ہے۔ پنجابی پر فارسی بولنے والے مسلمانوں کا اثر مرتب ہوا اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

پنجاب ہندوستان کا ایک اہم صوبہ ہے جہاں ہندآریائی زبانوں کی گریرسن تقسیم کے لحاظ سے اندرونی اور بیرونی دونوں گروہوں کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اندرونی گروہ کی مشرقی پنجابی یا پنجابی صوبہ کے شمال مشرقی علاقے میں اور مغربی حصّہ میں بیرونی گروہ سے تعلق رکھنے والی مغربی پنجابی یا لہندا رائج ہے جس کی ہزادہ زبانیں سندھی اور کشمیری ہیں۔ مشرقی پنجابی یا پنجابی کا لسانی مرکز لاہور رہا ہے جو اتفاق سے غزنوی حکمرانوں کا پایہ تخت بھی تھا۔

پنجاب اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بیرونی عناصر کے ہندوستان میں داخلہ کا اہم دروازہ رہا ہے زمانہ قدیم سے جتنے قبائل، اقوام، مہاجر اور فاتح آئے ان کا راستہ شمال مغربی صوبہ پنجاب ہی رہا۔ سندھ پر غزنویوں کے تسلط کے بعد مسلمانوں کا داخلہ سب سے پہلے پنجاب ہی میں ہوا۔ پہلے پہل سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کر کے یہاں اپنی حکومت کو مستحکم کیا۔ فاتح مسلمان فارسی بولا کرتے تھے۔ صوبہ پنجاب میں بہت دنوں تک اپ بھرنش بولنے والے آریائی نسل کے ہندوؤں سے ان کا سابقہ پڑا۔ لاہور ان کا پایہ تخت تھا۔ جب حالات معمول پر آئے تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول ربط و ضبط بڑھا۔ سماجی و معاشی تعلقات استوار ہونے لگے حالات نے خوشگوار رخ اختیار کیا۔ اس باہمی ربط و تعلق کے نتیجہ میں ایک نئی زبان کا آغاز ہوا جس کی حیثیت بین قومی نوعیت کی تھی۔ غزنیوں کے پونے دو سو سالہ عہد میں اس کو بڑی حد تک فروغ

نصیب ہوا۔ اپنی نشوونما کی ابتدائی منزلیں طے کرکے یہ باقاعدہ زبان کے روپ میں ابھرنے لگی۔ غزنی عہد کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے لاہور سے ہندوستان کے اندرونی علاقوں کی طرف کامیاب پیش قدمی کی راجپوتوں کے متحدہ محاذ کو جو پرتھوی راج کی زیر کمان تھا شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا۔ یا یہ تخت لاہور سے دہلی منتقل کرکے اپنی حکومت کو استحکام بخشا اور ملک کی سرحدوں کو وسیع کرنے کی سعی جاری رکھی اس دوران مسلمانوں نے بڑی تعداد میں لاہور سے دہلی نقل مقام کیا اپنے ساتھ تہذیبی و ثقافتی اثاثے اور نوزائیدہ زبان بھی لے گئے جس کی پیدائش پنجاب میں ہوئی تھی، مسلمانوں کے ستارہ اقبال کے چمکنے کے ساتھ ساتھ یہ زبان بھی ہندآریائی بولنے والوں کے علاقوں میں دور، دور تک رسائی حاصل کرتی رہی اور دن بدن پھلتی پھولتی ترقی کرتی رہی۔

پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا اس بات پر اصرار ہے کہ یہی زبان ہے جو آگے چل کر اردو کے نام سے موسوم ہوئی جس کا جنم پنجاب میں پنجابی زبان کی گود میں ہوا جیسا جیسا اس کا حلقہ اثر بڑھنے لگا اور اس کی باضابطہ صورت گری ہونے لگی اس کو مختلف اوقات میں مختلف علاقوں میں الگ الگ نام ملنے لگے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے نظریہ کی تائید میں جو دلائل پیش کئے ہیں ان کی وقعت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لسانی تحقیقات کے جو اصول انہوں نے اپنائے ہیں بلاشبہ ان کا عظیم کارنامہ ہیں۔ ان کی کتاب "پنجاب میں اردو" علمی تحقیق کی ایک ایسی گرانقدر تصنیف ہے جو اردو میں تحقیقاتی موضوع پر سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ڈاکٹر زور کے بقول۔ "پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے نہایت ہی مفید اور اردو کی تخلیق و آغاز سے متعلق مفید نتیجوں پر پہونچنے کے لئے ممد و معاون ہو سکتا ہے۔"[1]

تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ جس زمانے میں اردو اپنی تشکیل نشوونما اور صورت گری کی منزلوں سے گزر رہی تھی خود شورسینی اپ بھرنش کی مشرقی شاخ پنجابی زبان کے روپ میں ڈھل رہی تھی گویا اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی بھی لسانی صورت گری پا رہی تھی اور دونوں کا ارتقاء ایک ہی اصول کے تحت ہندآریائی چوکھٹے میں ہو رہا تھا۔ لہٰذا پنجابی کو اردو کا ماخذ بتانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔ البتہ اس کی ہمزاد بہن کہا جا سکتا ہے۔

دکنی نظریہ

سلطان علاءالدین خلجی اور ملک کافور کی دکن پر فتوحات سے قبل گیارھویں صدی عیسوی

---

[1] ہندوستانی لسانیات ص ۹۳ ڈاکٹر زور

ہی میں مسلم صوفیا اور بزرگانِ دین کے قدوم سرزمین دکن پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر فارسی بولنے والے تھے دکن میں ان کا مقصد دنیا طلبی نہ تھا بلکہ دین کی تبلیغ و اشاعت تھا وہاں انہوں نے حکومت دہلی کے تسلط سے پہلے ہی اپنی خانقاہیں بنالیں تھیں جہاں رات دن ان کا واسطہ مقامی باشندگان سے تھا عام ضرورت، بول چال رشد و ہدایت کے لئے وہ خالص عربی یا فارسی استعمال نہیں کر سکتے تھے لازماً انھیں مقامی زبانیں سیکھنا پڑا ہوگا ایک دو بزرگوں کی حد تک یہ مانا بھی جا سکتا ہے کہ انہوں نے دیسی زبان سیکھی ہوگی مگر سارے صوفیا کے متعلق نہیں کہا جا سکتا لہٰذا کوئی واسطہ کی زبان تخلیق کی گئی ہوگی جو دونوں کے لئے تبادلہ خیال کا ذریعہ ہوتی۔ اُردو کی دکن میں پیدائش کے متعلق یہ استدلال تو قابل قبول ہو سکتا ہے مگر جو باتیں سندھی اور مالاباری نظریات کی تردید کے لئے کہی گئیں ان کا دکنی نظریہ کو مسترد کرنے کے لئے دہرایا جانا واجبی نہیں کیوں کہ دکن کی اکثر زبانیں غیر آریائی ہے

پالی نظریہ: پروفیسر شوکت سبزواری نے اردو کی ابتداء کا سراغ پالی میں ڈھونڈنے کی بات کہی ہے انہوں نے اپنی کتاب اُردو زبان کا ارتقاء میں اپنے نظریہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اُردو زبان قواعدی ساخت کے لحاظ سے پالی سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہے[1] پروفیسر احتشام حسین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ بہت بحث طلب مسئلہ ہے اور ابھی اس کے تسلیم کئے جانے کے لئے کافی مواد فراہم نہیں ہوا ہے[2]"

---

[1] ۵۔ اُردو زبان کا ارتقاء شوکت سبزواری

[2] ۵۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ پروفیسر احتشام حسین۔ مقدمہ ص ۵۷

نظریات

اُردو کی ابتداء کے بارے میں

- تہذیبی اختلاط کا نظریہ
- سندھی نظریہ
- پنجابی نظریہ
- دکنی نظریہ
- پالی نظریہ
- برج نظریہ
- جیولوجیکل نظریہ
- نواح دہلی نظریہ
- ڈاکٹر زور کا نظریہ

برج نظریہ : شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں اُردو کی ابتدا کا سرچشمہ برج بھاشا کو بتاتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں " اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی دیہات ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے"[1] علاوہ ازیں حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری رسالہ زبان اُردوے قدیم میں یوں گویا ہیں " مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اُردو زبان کی صورت اختیار کر لی"[2]

- سر جارج گریرسن کا نظریہ
- ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ
- میرامن نظریہ
- جان گلگرسٹ نظریہ
- سرسید نظریہ
- صہبائی نظریہ
- سلیمان ندوی نظریہ
- ہورن لے نظریہ
- گرائم ہیلی نظریہ
- بخاری نظریہ
- امداد امام اثر نظریہ

جیوکز بلاک نظریہ : مشہور فرانسیسی ماہر لسانیات موسیو ژول بلوک (جولز بلک) نے اس ضمن میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس کو اکثر علماء لسانیات نے تسلیم کیا ہے اس طرح ہے " ابتداء میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی دوسری کھڑی بولی۔ اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں دونوں کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن چوں کہ دہلی ، توں صدر مقام رہا اس لئے اُردو کا تعلق کھڑی بولی سے زیادہ ہے"[2]

نواح دہلی نظریہ

" اردو کی تہہ میں جو بنیادی بولی ہے اس کا تعلق نواح دہلی ہی سے ہے" اُردو زبان کے مشہور ماہر

---

[1] پنجاب میں اردو حافظ محمود شیرانی ص ۲۶، ۲۷ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو۔

[2] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ پروفیسر احتشام حسین مقدمہ ص ۵۷

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو میں نہایت عالمانہ و محققانہ بحث کرتے ہوئے اور اُردو کی ابتدا اور نشوونما کو کھڑی بولی، ہریانی کے زیر اثر بتلاتے ہوئے اس کی جنم بھومی اطراف دہلی کو قرار دیا ہے انہوں نے مولانا آزاد، حافظ شیرانی اور دیگر ماہرین کے نظریات کا مدلل ابطال کر کے بہت تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ سلاطین دہلی کے عہد میں اُردو پر پنجاب کی: ان کے گہرے اثر کو بھی تسلیم کرتے ہیں اسی کو اردو کے غیر متعین کینڈے کا سبب بھی بتلاتے ہیں۔ و نیز دکن میں اُردو کے معیار کے تعین کو بھی تسلیم کرتے ہیں [1]

ڈاکٹر زور کا نظریہ: اُردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنا لیا۔ اُردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم "نئے ہند آریائی دور" میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے اُردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی کیوں کہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ ڈاکٹر زور نے آگے لکھا ہے کہ اُردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے [2]

---

[1] ۔ مقدمہ تاریخ زبان اُردو صـ ۱۳۳ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب

[2] ۔ ہندوستانی لسانیات صـ ۹۴، ۹۵ ڈاکٹر زور

سر جارج ابراہم گریرسن کا نظریہ: ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی لسانیاتی جائزے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبہ اور مغربی روہیلی کھنڈ کی (بول چال) کی زبان ہے [1]۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ: "سنہ ۱۰۰۰ء اردو کے ابھار کا زمانہ ہے سنہ ۱۱۹۳ء نکھار کا سنہ ۱۰۰۰ء میں اردو نے آنکھ کھولی اور سنہ ۱۱۹۳ھ کے بعد نشو و نما پاکر اس قابل ہوئی کہ اپنی باتوں سے لوگوں کا دل بہلائے۔" "زبان کا آغاز اس کا ارتقاء ہے اس کا جنم اس کے خط و خال یعنی امتیازی خصوصیات کا ابھار یا نکھار ہے" اس ابھار یا نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ "اردو کی ابتداء کا سوال اس کے ارتقا سے وابستہ ہے [2]۔

میر امن نظریہ: امیر تیمور کے گھرانے کی فتح ہند کے بعد شہر کا بازار اردو کہلایا اور جب اکبر تخت پر بیٹھا تو ہندو مسلمان سب اکٹھا ہوئے ان کے لین دین اور آپس میں سودا سلف لینے سے ایک زبان اردو مقرر ہوئی جب شاہجہاں نے شاہجہاں آباد بسایا تو اس نئے شہر کے بازار کو اردو سے معلیٰ کا خطاب دیا [3]۔

جان گلکرسٹ نظریہ: جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت سے اردو بنیاد پڑی [4]

سر سید نظریہ: شاہجہاں نے ۱۰۵۸ ہجری م سنہ ۱۶۲۸ء میں دلی آباد کی اس وقت سے اردو زبان بنی۔ قریب سنہ ۱۱۰۰ ہجری م سنہ ۱۶۸۸ء سے اس میں شعر گوئی شروع ہوئی [5]

صہبائی نظریہ:۔ فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرت استعمال کے سبب دتغیر و تبدل واقع ہوا اور اس خلا ملا سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ہوا [6]

---

[1] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ جلد ۹ حصہ ۱ حاشیہ صفحہ ۴۲ [2] اردو لسانیات ڈاکٹر سبزواری صفحہ ۱۳، ۱۴

[3] باغ و بہار، میر امن ناشر برکت علی لاہور صفحہ ۴، ۵ [4] ہندوستانی فلالوجی بحوالہ ہندی ادب کا اثر اردو ادب پر [5] آثار الصنادید، سر سید احمد خاں بار چہارم مرتبہ خالد لفیر ہاشمی ۱۹۶۵ء ص ۳۶۰، ۳۶۱ [6] رسالہ اردو قواعد، امام بخش صہبائی بحوالہ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ ڈاکٹر پرکاش مولش صفحہ ۲۶

سلیمان ندوی نظریہ: مسلمان ہندوستان کے جس صوبے میں گئے وہاں کی صوبائی بولی میں عربی فارسی الفاظ ملاکر بولنے لگے چناں چہ بنگالی مرہٹی ملیالم وغیرہ میں ہر ایک کا مسلمانی روپ علیحدہ ہے سب سے پہلے یہ میل جول ملتان سے لے کر سکھر تک سندھ میں اور پھر یہاں سے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک ہوا ہوگا۔

ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کے میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام اردو رکھدیا گیا حالاں کہ ان کا نام پنجابی دکھنی گجراتی یا گوجری رکھنا چاہیے جب دہلی میں قلعہ اردوے معلیٰ بنا تو زبان دہلی کا نام اردوے معلیٰ پڑ گیا[1]

ہورن نے نظریہ: اُردو بارھویں صدی عیسوی میں دہلی کے نواح میں پیدا ہوئی[2]

گراہم بیلی نظریہ: اُردو ۱۰۲۷ء تک جھنگ لاہور میں پیدا ہوئی قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی سوتیلی ماں برج سے براہ راست اس کا کوئی تعلق نہیں[3]

بخاری نظریہ: اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں جو کھڑی بولی کے دو روپ ہیں[4]

اُردو زبان کی عمر کچھ نہیں تو کم از کم چند ہزار سال تو ضرور ہی مانی جا سکتی ہے کیوں کہ اس کے الفاظ برصغیر کی قدیم ترین کتاب "رگ وید" میں آج بھی ملتے ہیں[5]۔

امداد امام اثر نظریہ:۔ اہل عرب شروع شروع سندھ میں پہنچے تو سندھیوں کی زبان جو پراکرت کی ایک قسم تھی عربی لفظوں سے مزاج پکڑنے لگی پھر مختلف اقوام کے شاہان اسلام ہندوستان پر حملہ آور ہوتے گئے حتیٰ کہ اسلامی سلطنت ہندوستان میں قائم ہوگئی اِس وقت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول زیادہ ہونے لگا زبان محاورات جو ہندوؤں میں جاری تھی۔ اس میں فارسی عربی کے الفاظ کثرت سے داخل ہوگئے خاص کر لشکروں میں ایک خاص زبان بولی جانے لگی اس مرکب زبان کا نام اُردو ہوگیا[6]

---

[1] نقوش سلیمانی، سید سلیمان ندوی ص ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳ [2] داستان زبان اردو شوکت سبزواری مشمولہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۸ء ص ۳۵ [3] جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء ص ۳۹۱ بحوالہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۸ء ص ۳۷ [4] اردو کا قدیم ترین ادب مضمون از سہیل بخاری نقوش مئی ۱۹۶۵ء [5] کوڑی از سہیل بخاری۔ نقوش اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۳۸ [6] کاشف الحقائق سید امداد اثر ص ۴۰۰

بابائے اُردو مولوی عبدالحق اپنے ایک صدارتی خطبہ میں فرماتے ہیں۔ "یہ (اُردو) خاص ہندستان کی پیداوار ہے اور دونوں قوموں یعنی ہندو مسلمانوں کے لسانی تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بنانے والے زیادہ تر ہندو ہیں" [1]

پروفیسر گیان چند جین اپنے ایک مضمون "اردو کے آغاز کے نظریے" میں رقمطراز ہیں کہ "اُردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی دہلی اور مغربی یو پی کی بولی ہے۔ کسی کی مجال نہیں جو یہ کہہ سکے کہ یہ پنجاب کی زبان پنجابی کی اولاد ہے اگر کھڑی بولی پنجابی سے نہیں نکلی تو اردو بھی پنجابی سے نہیں نکلی [2]

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ استاد لسانیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی کتاب "اردو کی لسانی تشکیل" میں اُردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی یہاں سکونت پذیری سے اردو کے آغاز اور ارتقاء کے سلسلے کو جوڑنا صحیح نہیں ہے انہوں نے اردو کے آغاز و ارتقاء کے متعلق مروجہ کئی نظریات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ

> "یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کا آغاز اور ارتقاء کا سہرا صحیح معنوں میں ہندوؤں ہی کے سر ہے وہی اس کی پیدائش کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں کو اردو کی پیدائش کا ذمہ دار قرار دینا یا اردو کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ منسوب کرنا تاریخی و لسانی حقائق کو جھٹلانا ہے" [3]

ڈاکٹر عبدالغفار شکیل صدر شعبہ لسانیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے ایک مضمون میں اُردو کے آغاز کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ۔ "اردو کا آغاز اس وقت ہوا جب مسلمان ہندوستان میں آئے مسلمانوں نے عربی اور فارسی کے لفظوں کی آمیزش

---

[1] خطبات عبدالحق حصہ دوم صـ۱۸ انجمن ترقی اردو ہند
[2] بحوالہ اردو کی لسانی تشکیل۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ صـ۲۷
[3] بحوالہ اردو کی لسانی تشکیل۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ صـ۴۱

سے اردو کا ڈھانچہ بنایا بالکل غلط بات ہے[1]

اُردو کے آغاز اور ارتقاء کے متعلق اتنے سارے نظریات کی موجودگی میں کسی ایک پر پوری طرح انحصار کرنا بڑا مشکل ہے ان نظریات میں سے چند ایسے ہیں جنھیں سنجیدگی کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے تاہم دیگر خیالات کو بھی پوری طرح نظر انداز نہ کرتے ہوئے ان کی تہہ تک پہنچنا ایک لسانیات کے طالب علم کا مقصد ہونا چاہیئے۔ چند دقیع نظریات اس بارے میں ہماری تسکین کرتے ہیں۔ ماہرین لسانیات کی تحقیقات کے نتائج سامنے رکھ کر میں نے اُردو کے نسلی تسلسل کا تاریخی جائزہ لیا ہے جو اگلے صفحات پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے جہاں تک اس بارے میں میری اپنی رائے کا تعلق ہے آپ کو اس میں مل جائے گی۔ ممکن ہے میرا خیال کسی نظریے کے موافق یا دیگر خیالات سے الگ ہو تاہم میں نے جو کچھ نتائج اخذ کئے ہیں تشفی بخش طریقے سے پیش کر دیئے ہیں۔

اردو زبان کے آغاز کا نظریہ پچھلے (۵۸) برسوں سے علماء لسانیات بالخصوص اردو زبان کے ماہرین کے نزدیک موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ پنجاب میں اردو کے آغاز کا نظریہ جو مولانا شیرانی سے منسوب ہے دراصل یہ ان کا ذاتی خیال نہیں جیسا کہ خود انہوں نے اپنی کتاب میں اس کا اظہار کیا ہے۔ "اُردو زبان کا آغاز کا سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا" کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدۂ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی صاحب سرخوش اپنے پر لطف تذکرہ "اعجاز سخن" میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں[1]

ڈاکٹر عبدالغفار شکیل صدر شعبہ لسانیات۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی کتاب لسانی و تحقیقی مطالعے کے ایک مضمون میں مولانا شیرانی کے اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "تذکرہ اعجاز سخن" مولانا شیرانی کی کتاب کی اشاعت یعنی ۱۹۲۸ء سے پہلے شائع ہوا اور اس میں اُردو کی ابتدا سے متعلق جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ مولانا شیرانی سے منسوب نظریہ کا ماخذ بھی ہے[2]

ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے مضمون کے ابتداء میں اس تعلق سے ڈاکٹر زور مرحوم کے خیال کو ذرا مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھ کر جو کچھ لکھا ہے وہ صرف کھٹکتا ہے تحقیق و تنقید میں ہر بات روا ہے

---

[1] زبان و مسائل زبان۔ عبدالغفار شکیل ص ۶۸

منکر قلم کا متجاوز نہ ہونے دینا ہی ادبی عظمت کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جانے کیوں یہ باور کر لیا کہ ڈاکٹر زور پنجاب سے اردو کے آغاز کے نظریہ کو محمود شیرانی کے بجائے اپنے آپ سے منسوب کرنے کے آرزومند تھے ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے لکھا ہے کہ "اس نظریے کے علمی حلقوں میں مقبول ہو جانے کی وجہ سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کو پیش کرنے کا سہرا اپنے سر لینے کی کوشش کی ہے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں (لیکن مکمل کر نہیں)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے ڈاکٹر زور جس تحریر کا حوالہ دیا ہے اس سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ ڈاکٹر زور مخفی یا علانیہ اس نظریہ کی پیش کشی کا سہرا اپنے سر لینا چاہتے ہوں۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے مضمون کا یہ حصہ انہوں نے نقل کیا ہے "یہ عجیب بات ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصل تعلق کی نسبت کسی یوروپی ماہر لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا اس کی طرف سب سے پہلے ہندستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی۔ ہندوستانی اہل قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے اس بنیادی تعلق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا چناں چہ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا (اردو کی ابتداء۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ لسانیات نمبر ص ۵۹) اس کے بعد ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔ "اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقاء کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعے اور تلاش و جستجو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبۂ گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں چناں چہ میں نے اپنے مقالے میں اس نظریے کو شرح و بسیط کے ساتھ بیان کیا اس مقالے کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے میں جو علمی تحقیقات کی تھیں ان کو کتابی صورت میں "ہندوستانی فونیٹکس" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی زبان میں شایع کیا۔ بعد میں اس نظریے کی مزید وضاحت اور اہل اردو میں اشاعت کے لئے ایک اور کتاب "ہندوستانی لسانیات" لکھی جو ۱۹۳۲ء میں شایع ہوئی۔ (اردو کی ابتداء۔ مطبوعہ اردوئے معلیٰ، لسانیات نمبر ص ۵۹) ڈاکٹر شکیل نے ڈاکٹر زور کے اس حوالے

کو نقل کرنے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔ "ڈاکٹر زور کی سعی ناکام ہوئی چناں چہ اردو کو پنجابی سے ماخوذ بتلانے کا سہرا مولانا شیرانی ہی کے سر رہا اور پچھلی نصف صدی سے ان ہی کے سر ہے"[1]

ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آخر کہاں ڈاکٹر زور نے مولانا شیرانی کے بجائے اس نظریہ کی پیش کشی کا سہرا خود اپنے سر باندھنے کی کوشش کی ہے جب کہ خود زور صاحب مولانا شیرانی کے نہ صرف معترف ہیں بل کہ اپنی مختلف تحریروں میں بار بار اس کا اظہار بھی کیا ہے، چناں چہ ہندوستانی لسانیات میں رمسٹرز ہیں۔ "پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے نہایت ہی مفید اور اردو کی تحقیق و آغاز سے متعلق مفید نتیجوں پر پہونچنے کے لئے کافی ممد و معاون ہو سکتا ہے"[2]

ڈاکٹر شکیل صاحب کا اس ضمن میں یہ کارنامہ ہے کہ پچھلے (۵۸) برسوں سے عوام میں جو یہ مشہور تھا کہ پنجاب میں اردو کے آغاز کا نظریہ مولانا شیرانی کا پیش کردہ ہے خود شیرانی صاحب کی تحریر کے حوالے سے اس کو غلط ثابت کر دکھایا اور پچھلی نصف صدی سے جو سہرا مولانا شیرانی کے سر بندھا ہوا تھا اسے اتار کر شیر علی سرخوش مرحوم کے سر باندھا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب شیر علی سرخوش کی کتاب تذکرۂ اعجاز سخن سے متعدد اقتباسات سپرد قلم کر اپنے دعویٰ کے لئے عمدہ دلائل فراہم کئے ہیں۔

---

[1] لسانی و تحقیقی مطالعے ص ۲۱، ۲۲ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، علیگڑھ ۱۹۷۵ء

[2] ہندوستانی لسانیات ص ۹۳ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اردو زبان کے نسلی تسلسل کا جائزہ

اُردو زبان بنیادی طور پر ہند یوروپی خاندان سے نسلی تعلق رکھتی ہے اس زبان کے تاریخی اور نسلی پس منظر کا جائزہ موضوع کی ضرورت کے اعتبار سے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ہند یوروپی خاندان السنہ: زبانوں کے عالمی خاندانوں میں ہند یوروپی خاندان السنہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بے حد اہم اور ممتاز مانا جاتا ہے یہ ایک نہایت وسیع اور قدیم خاندان السنہ ہے جس کی سینکڑوں شاخیں اور بے شمار ذیلی کنبے دنیا کے بہت بڑے خطہ میں پھیلے ہوئے ہیں اگرچہ کہ ان میں بہت سے مفقود ہو چکے ہیں پھر بھی جتنے لسانی کنبے اس وقت موجود ہیں وہ اپنی وسعت، پھیلاؤ اثر و نفوذ کے اعتبار سے اس خاندان السنہ کی وقعت کا ثبوت ہیں۔ دنیا کے تین براعظموں کے اکثر ممالک میں ہند یوروپی زبانیں مروج ہیں۔ مسیحیت کی تعلیمات کا اسی خاندان کی مشہور زبانوں میں کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں علوم و فنون کا ایک منتخب سرمایہ ہند یوروپی میں محفوظ ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ جدید زبانوں میں سے اکثر کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کی جتنی شاخیں ہیں ہر شاخ ایک وسیع حلقہ اثر رکھتی ہے۔ دنیا کی مشہور زبانیں جیسے رومن، انگریزی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی، روسی اور فارسی کے علاوہ ہندستان کی بیشتر زبانیں بھی اس سرچشمہ سے متعلق ہیں عصر حاضر کی جدید تحقیقات کا سارا ذخیرہ مختلف جدید علوم و فنون سائنس اور ٹکنالوجی کے تمام تر خزانے ہند یوروپی خاندان کی زبانوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس خاندان کی بے حد اہمیت ہے کیوں کہ قدیم و جدید ادب کا اعلیٰ اور قیمتی مواد اس کی مختلف زبانوں میں ملتا ہے ہماری اُردو زبان کا اولین سرچشمہ یہی خاندان السنہ ہے اس اعتبار سے اس خاندان سے اہل اُردو کی دلچسپی فطری بات ہے۔ ہند یوروپی کی شاخوں میں ہند ایرانی لسانی کنبہ کی اہمیت کئی لحاظ سے واضح ہے کیوں کہ دنیا کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ہند ایرانی کنبہ کی مختلف شاخوں کی زبانیں بولتا ہے اور جنوب مشرقی ایشیا میں ہر طرف اسی کا بول بالا ہے۔

ہند ایرانی لسانی کنبہ: ہند ایرانی لسانی کنبہ کا تعلق ہند یوروپی خاندان السنہ سے ہے بل کہ اس خاندان کی بنیادی خصوصیات اسی کنبہ کے حصہ میں آئی ہیں لہذا اس کو ہند یوروپی خاندان کا حقیقی وارث اور سچا جانشین کہا جا سکتا ہے ہند ایرانی کنبہ بحر وسیع اور براعظم ایشیا کے بہت سارے ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہند آریائی گھرانے کا تعلق اسی لسانی کنبہ سے ہے۔ ہند ایرانی زبانیں زمانہ

قدیم میں بھی نہایت باقاعدہ اور ترقی یافتہ شکل میں پائی جاتی تھیں جس کا ثبوت حالیہ کھدائیوں کے دوران مل چکا ہے۔ اس کنبہ میں مذہب، فلسفہ، حکمت اور طب کا معتدبہ ذخیرہ ملتا ہے۔ اس کی مختلف زبانوں میں ادب کا بہترین سرمایہ موجود ہے۔ بالخصوص فارسی اور سنسکرت میں اعلیٰ ادب پایا جاتا ہے ہند ایرانی لسانی کنبہ کئی شاخوں میں منقسم ہے جن میں ایرانی شاخ، پشاچہ شاخ اور ہند آریائی شاخ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان کا شجرہ ہند ایرانی سے ہوکر ہند یورپی سے جا کر ملتا ہے اردو چوں کہ ہند آریائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے اور اس پر غالب اثر فارسی کا ہے اس لحاظ سے اردو زبان کا ہندی ایرانی لسانی کنبہ سے دوہرا رشتہ ہوتا ہے۔

ہند آریائی شاخ: ہند آریائی دراصل ہند یورپی کی ہندوستانی شاخ اور ہند ایرانی کی جانشین کہلائی جاتی ہے اس کی ہمزاد ایرانی اور پشاچہ شاخیں ہیں ہند آریائی وسطی ایشیا کے مہاجر آریہ قبائل کی زبانوں پر مشتمل لسانی کنبہ ہے۔ آریہ جو ہزاروں سال پیشتر تلاش معاش میں ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان آکر بس گئے تھے اپنے ساتھ اپنے مذہبی معتقدات، تہذیب اور زبانیں بھی لے آئے تھے۔ ہندوستان میں انھیں ایک بہتر، آسودہ اور متمدن ماحول پہلے سے تیار ملا جہاں انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی اور ان کے مذہب، تہذیبی اقدار اور زبانوں کو فروغ نصیب ہوا ان کی زبانوں میں علوم و فنون کا وافر ذخیرہ پہلے سے موجود تھا یہاں اس میں قابل لحاظ اضافہ ہونے لگا۔ مقامی زبانوں پر آریائی اثرات روز بہ روز گہرے ہوتے گئے۔ ہند آریائی زبانوں کا حلقہ اثر بڑھنے لگا۔ چند صدیوں میں ہندوستان کی مغربی سرحدوں سے دور دراز مشرقی علاقوں تک ہند آریائی زبانوں کا چلن عام ہو گیا۔ جیسا جیسا آن کا پھیلاؤ بڑھنے لگا ان میں تغیرات کا رونما ہونا فطری امر تھا چوں کہ ہر جگہ پر ایک ہی ڈھنگ سے زبانوں کا ارتقائی عمل ممکن نہیں اس وجہ سے وسیع و عریض ہندوستان میں ہند آریائی زبانیں مختلف رفتار سے پروان چڑھنے لگیں ان کی شکل و صورت رنگ و آہنگ میں جداگانہ انداز کا فرق ابھرنے لگا جس کے نتیجہ میں مغربی صوبوں میں بولی جانے والی اور مشرقی خطوں میں بولی جانے والی زبانوں میں بنیادی یکسانیت کے باوصف قابل لحاظ تغیر نمایاں تھا۔ یہ تبدیلیاں زبان و مکان کے ساتھ وابستہ تھیں اس وجہ سے مختلف ادوار اور مختلف مقامات پر ان کی الگ الگ کیفیت نظر آتی ہے چوں کہ اردو کا تعلق ہند آریائی کے ساتھ ہے اس وجہ سے بلحاظ ادوار سلسلہ وار جائزہ مفید ہوگا۔

اردو زبان کا نسلی پس منظر

زبانوں کے عالمی خاندان کی: ہم شاخ

↓

ہند یورو پی خاندان السنہ

ہند ایرانی لسانی کنبہ

ہند آریائی شاخ

ویدک زبان

سنسکرت - قدیم پراکرت

جدید پراکرت

شورسینی

اپ بھرنش

شورسینی اپ بھرنش

مغربی ہندی

کھڑی بولی

اُردو

ویدک زبان: (۱۵۰۰ ق م سے ۶۰۰ ق م تک جملہ (۹۰۰) برس کا زمانہ ہند آریائی زبانوں کا عہد قدیم ہے۔ یہی (۹۰۰) سال کا عہد ویدک دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ ویدک زبان ہند آریائی کی قدیم نمایندہ اور معیاری حیثیت کی حامل ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ عوام و خواص دونوں طبقوں میں یکساں مقبول تھی۔ اس میں ادب کا اعلیٰ بلند پایہ سرمایہ ملتا ہے۔ ساتھ ہی عام بول چال میں بھی اس کا استعمال رہا عہد قدیم میں، ویدک زبان تمام آریائی قبائل میں تھوڑے بہت صوتی اختلاف کے ساتھ ہر جگہ رائج تھی آریاؤں کے ہندوستان میں پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تغیرات جگہ پانے لگے تھے۔ اگرچہ کہ دانشور اور مذہبی طبقہ کے پیش نظر زبان کا اعلیٰ ادبی معیار برقرار رکھنا اور اس کا تحفظ کرنا تھا اسی وجہ سے انہوں نے اس کے لئے بے پناہ کوششیں کیں لیکن ہندوستان کے وسیع ترین علاقوں میں ایک انداز سے ویدک زبان کی نگرانی ممکن نہ تھی مختلف حصّوں میں اس کی شکل و صورت میں بدلاؤ آنے لگا تاہم مذہب اور سماجی علوم کے ذخائر کو خالص ویدک زبان میں محفوظ کرنے کی کامیاب سعی کی گئی جس کا زندہ ثبوت رگ وید اور دیگر تین ویدوں کی صورت میں موجود ملتا ہے۔ اُردو زبان کی اوپر کی کڑیاں ویدک زبان ہی سے مربوط ہیں۔

سنسکرت: قدیم ہند آریائی دور کی آخری صدیوں میں آریاؤں کو ہندوستان میں بے پناہ عروج نصیب ہوا ان کے مقبوضات میں دن دونی اضافہ ہونے لگا۔ ان کا اقتدار سندھ سے بنگال تک قائم ہو چکا تھا۔ ہر طرف آرام و چین کا دور دورہ تھا ایسے میں تہذیبی طور پر ان کی تیز رفتار ترقی ناقابل فہم نہیں۔ ویدک زبان کی ادبی حیثیت اور معیار کی برقراری کے لئے لگاتار کوشش اور عملی اقدامات نے آہستہ آہستہ اس زبان کو خواص کے طبقہ کی حد تک محصور کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف عوامی بول چال کی زبانیں الگ اعتبار پانے لگیں۔ اسی زمانے میں جب کہ لسانی انتشار نمایاں ہو رہا تھا آریائی زبانوں کی تنظیم جدید کی تحریک شروع

ہوئی تاکہ کسی ایک زبان کو مرکزی حیثیت مل سکے، یہ اُس صوتی فکر کا نتیجہ تھی جو مختلف صوبوں اور قبائل میں آپسی اتحاد و ارتباط کی خواہاں بھی تھی اور تہذیبی مرکزیت کی مذہبی بھی چناں چہ ایک ایسی زبان کا وجود ہوا جس میں ہر علاقہ میں رائج الفاظ کو ادلی اور ثکسانی کی حیثیت دی گئی یہ ویدک زبان کا نیا روپ تھا جسے سنسکرت کا نام ملا۔ اُردو زبان کا کسی نہ کسی طرح سنسکرت سے تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے۔

قدیم پراکرت : سنسکرت کی ابتداً اور صورت گری جس ڈھنگ سے ہوئی اس سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آتی ہے کہ خاص اغراض و مقاصد اس کی تشکیل کے ضمن میں کارفرما تھے چناں چہ بہت جلد وہ ظاہر بھی ہو گئے۔ سنسکرت خالصتاً ادبی علمی اور مذہبی مقاصد کے لئے استعمال کی جانے لگی۔ اعلیٰ طبقہ کے برہمنوں نے اس کی مذہبی شکل کو محفوظ کرنے میں ساری توانائی لگا دی بہت جلد سنسکرت پاک و پوتر زبان کی حیثیت پا کر عام لوگوں سے بہت دور تقدس کی چہار دیواری میں محصور سی ہو گئی۔ ویدک عہد کی دوسری شاخ نے پراکرت کا روپ دھار کر سارے ملک میں عوامی بول چال والی زبان کی حیثیت سے مقبولیت پانے لگی سنسکرت چوں کہ عام حلقوں سے ناطہ توڑ کر برہمنوں کی گرفت میں جکڑ گئی تھی عوام الناس نے پراکرت کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اسی دوران بدھ مت کا آغاز ہوا اس نئے مذہب نے اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے عوامی زبان یعنی پراکرت کو ترجیح دی جس نے پراکرت کی کایا پلٹ دی دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور لمحہ لمحہ بہ ترقی کے زینے طے کرنے لگی۔ پورے آریائی علاقوں میں مختلف پراکرتوں کو فروغ ہوا جن میں پالی کی ترقی قابل رشک تھی کیوں کہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کا اسی پراکرت کے علاقہ سے تعلق اور پالی ہی ان کی مذہبی تعلیمات کا ذریعہ تھی اور زبان کا تعلق ویدک زبان سے مشتق اہنی پراکرتوں سے ہے

جدید پراکرت :۔ ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء کے درمیانی عہد میں یعنی (۶۰۱ ق م تا ۱۰۰۰ عیسوی) ابتدائی چند صدیاں تیز رفتار تغیرات کی تاریخ رکھتی ہیں۔ قدیم ویدک زبان کی جو دو شاخیں عہد قدیم کے اواخر میں الگ الگ دھاروں میں منقسم ہو چکیں تھیں ان میں سنسکرت زبان نے اپنے رشتہ کو قدیمی زبان کے ساتھ مضبوط تر بنیادوں پر باقی رکھا۔ بل کہ اس نے اس قدر ادبی شان پیدا کر لی کہ اس کا عام لوگوں سے کوئی علاقہ ہی باقی نہ رہ سکا تقدس اور علمی وقار نے اس کو برہمنوں اور لسانی علماء کے حلقوں میں ہی مقید کر دیا جب کہ قدیم پراکرتیں عوامی مقبولیت حاصل کرتی گئیں نئے مذہبی نظریات کی حمایت سے یہ پراکرتیں الگ الگ انداز سے ترقی پاتی گئیں اور ان کا دامن وسیع تر ہوتا چلا گیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے اصل ماخذ و مرکز سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگ گئیں۔ سنسکرت کے مقابل ان پراکرتوں کا ارتقاء بالکلیہ

دوسرے : ڈھنگ کا تھا یعنی سنسکرت ارتقائی عمل کے باوجود دن بدن سخت ادبی شکل اختیار کرنے لگی اور ویدک زبان سے زیادہ مضبوط بکندھ باندھنے لگی جب کہ پراکرت روز بہ روز اپنے سرچشمہ سے دور ہوتی گئی۔ حالات وضروریات نے اس کو آسان پھیلا دیا کہ یہ پراکرتیں خود اپنے سانچے تبدیل کرنے لگیں اور ان کی کوکھ سے جدید پراکرتوں کا جنم ہونے لگا۔ گو ہند آریائی زبانوں کے عہد وسطیٰ کا یہ ایک عظیم لسانی واقعہ تھا۔ قدیم پراکرت سے جدید پراکرت کی ابتدا نے لسانیاتی تاریخ میں ایک نئے موڑ کا سامان کیا۔ اردو زبان کا سلسلہ بہ سلسلہ تعلق عہد وسطیٰ کی ان جدید پراکرتوں سے قائم ہوتا ہے

شورسینی : پراکرتوں کے جدید ارتقائی سلسلہ نے پورے شمالی ہندوستان میں کئی شاخوں کی بناء ڈالی۔ عام طور پر ان کی پانچ قسمیں بہت واضح اور نمایاں ہیں۔

مہاراشٹری، شورسینی، پیشاچی، ماگدھی، اودھ ماگدھی ان سب میں سورسینی پراکرت کی نوعیت جداگانہ تھی کیوں کہ دیگر پراکرتیں چاہے کتنی اہم اور وسیع ہوں لیکن شورسینی ملک کے اہم ترین تہذیبی علاقوں یعنی مدھیہ پردیش کے مغربی اور شمالی حصوں میں رائج تھی اس کو اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ دوآبہ گنگ وجمن کے وسطی علاقوں میں پھلتی پھولتی رہی اس کا مرکز متھرا تھا جو قدیم آریائی تہذیب وتمدن کا اہم ترین مقام ہے یہاں شورسینی کے تعلقات سنسکرت سے بڑے گہرے اور مضبوط تھے۔ دونوں اس علاقہ میں پہلو بہ پہلو ترقی کرتے رہے اردو کے شجرہ نسب میں شورسینی کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اپ بھرنش : تغیر و تبدل قانون فطرت ہے پراکرتوں کی مقبولیت اور وسیع تر پھیلاؤ نے آہستہ آہستہ ان کو ادبی حلقوں میں سمونا شروع کر دیا۔ عوامی زبان ادبی قالب کا ساتھ نہیں دے سکتی جب ساری پراکرتیں ادبی لبادہ اوڑھنے لگیں تو بول چال کی زبان نے نیا روپ اختیار کرنا شروع کیا جس کو اہل علم وزبان نے بگڑی زبان کا نام دیا جس کو اصطلاح میں اپ بھرنش کہا جاتا ہے یہ اپ بھرنشیں دراصل عوامی حلقوں میں پراکرتوں کی جانشین تھیں۔ جنھیں بہت جلد وہ مقام حاصل ہو گیا جو ان کی پیش رو پراکرتوں کو صدیوں حاصل ہو سکا تھا ان کی اہمیت میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا ایک وقت ایسا کہ شعر وسخن اور تصنیف و تالیف کے لئے ادبی پراکرتوں کی موجودگی کے باوجود اپ بھرنشوں کو بہت وسیع پیمانے پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کیفیت نے تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

شورسینی اپ بھرنش : شورسینی اپ بھرنش کا علاقہ وہی ہے جو شورسینی پراکرت کا ہے شورسینی

اب بھرنش البتہ اپنی ادبی ولسانی خصوصیات کی بناء پر اپنی تمام ہمزاد اپ بھرنشاؤں میں بے حد اہم اور وقیع مانی جاتی ہے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ نہ صرف پورے شمال میں اپنا اثر رکھتی تھی بل کہ ماگدھی اور ماگدھی علاقوں میں بھی اس کا ادبی زبان کی حیثیت سے چلن تھا شورسینی اپ بھرنش کے اثرات راجستھانی اور سندھی پر بھی اس قدر واضح ہیں کہ ماہرین ان کو اسی کی ذیلی شاخیں کہتے ہیں۔

مغربی ہندی: ہندآریائی زبانوں کی عہد بہ عہد تقسیم کے لحاظ سے اُردو کا نسبی تعلق ترتیب وار دیدک زبان سے شورسینی اپ بھرنش سے مسلمہ طور پر مانا جاتا ہے اور مکانی تقسیم کا لحاظ کیا جائے تو اُردو کا تعلق مغربی ہندی سے جو یقیناً شورسینی اپ بھرنش کے عہد جدید میں تشکیل پانے والا وہ لسانی گھرانہ ہے جس کا اثر ونفوذ مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد اور شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں بندیل کھنڈ تک قائم ہے جوں کہ مغربی ہندی، شورسینی اپ بھرنش جیسی خالص ادبی اور باوقار زبان سے اپنا رشتہ رکھتی ہے اس وجہ سے مغربی ہندی کا ادبی معیار اور لسانی وقار بے حد متاثر کن ہے ہندوستان کے اہم مرکزی علاقوں کی نمائندہ ہونے کے ناطے اس کا اثر اپنے چاروں طرف رائج زبانوں پر بڑی گہرائی کے ساتھ مرتب ہوتا رہا۔ مغربی ہندی کا مرکز بھی چوں کہ متھرا ہے جہاں قدیم مذہبی علمی و ادبی سنسکرت کا پرانے زمانے ہی سے قبضہ رہا ہے اسی بناء پر مغربی ہندی میں ہم ادب کا وہ سنسکرتی مزاج پاتے ہیں جو شورسینی اپ بھرنش کی بنیادی خصوصیت تھی۔ گریرسن نے مغربی ہندی کی تین پانچ شاخوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں کھڑی بولی وہ اہم زبان ہے جسے تمام متاخر ماہرین نے ہندوستانی کا نام دیا ہے جو جدید ہندی اور اردو کی مال ہے اس اعتبار سے اردو کا براہ راست تعلق مغربی ہندی سے قائم ہے۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی: تحریری شکل میں کھڑی بولی نام کا استعمال سب سے پہلے جان گلگرسٹ کے یہاں نظر آتا ہے ۱۸۰۳ء میں گلگرسٹ للولال وغیرہ نے یہ نام استعمال کیا سنسکرت کے لگ بھگ شورسینی اپ بھرنش سے جنم پانے والی مغربی ہندی ایک ادبی شان کے ساتھ نمایاں ہو رہی تھی گویا جدید ہندآریائی زبانوں میں مغربی ہندی ایک نمائندہ حیثیت کی حامل تھی۔ ارتقاء کے اصول اور پھیلاؤ کے تقاضوں نے اس کو پانچ ذیلی شاخوں میں بانٹ دیا ان ہی پانچ زبانوں میں جو زبان مغربی ہندی کی حقیقی جانشین کی حیثیت رکھتی ہے اگرچہ کہ اس بارے میں بعض علماء کو اختلاف بھی ہے وہ کھڑی بولی یا جدید ہندوستانی ہے جس کا اثر ونفوذ دوآبۂ گنگ وجمن کے شمالی حصہ روہیلکھنڈ کے مغرب اور پنجاب کے علاقہ انبالہ تک قائم ہے کھڑی بولی بنیادی طور پر ہندآریائی زبان ہے جس کا خمیر شورسینی اپ بھرنش کے علاقہ میں تیار ہوا جو مغربی ہندی کی وراثت بھی ہے اس لحاظ سے اس میں اپنی ہمزاد پنجابی یا ہریانی کے واضح اثرات غیر معمولی بات نہیں البتہ اس کی خصوصیت

دہ یہ غیبت بجذاب ہے جو بیرونی زبانوں کے الفاظ کو بھی بہ خوشی اپنا لیتی ہے چنانچہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ اس انداز سے باہم دیگر مل گئے ہیں کہ جب تک کے تحقیقی جستجو سے کام نہ لیا جائے ان میں امتیاز مشکل ہے کھڑی بولی اپنے قواعدی اور صوتیاتی مزاج کے اعتبار سے ہریانی سے بے حد قریب رکھتی ہے۔ اس دور کے سیاسی حالات' انقلابات' اور تہذیبی اختلاط کے نتیجہ میں مغربی ہندی کی جن شاخوں نے دوسری زبانوں کو گلے سے لگایا ان میں کھڑی بولی سب سے پیش' پیش اور نمایاں تھی۔ پھر ان میں روز افزوں اضافوں نے کھڑی بولی کو وہ اہم ترین مقام و مرتبہ عطا کر دیا جو کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔ کھڑی بولی کا نام جدید ہندوستان کی تاریخ لسانیات میں ہمیشہ تابناک رہے گا کیوں کہ یہ زبان ہے موجودہ قومی زبان یعنی ہندی اور بین الاقوامی سطح پر آج اردو زبان کی منبع و سرچشمہ ہے۔ اردو سینی کما چیرلیجی ڈاکٹر مسعود حسین خاں' ڈاکٹر گیان چند جین جیسے ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ

اردو زبان بنیادی طور پر ہند آریائی لسانی کنبہ کی شورسینی شاخ سے تعلق رکھتی ہے اس کا سرچشمہ مغربی ہندی ہے جو شورسینی اپ بھرنش کی جانشین اور جدید ہند آریائی زبانوں کی نمائندہ ہے۔ ہند آریائی سے اس کا رشتہ اس زبان کو ہند یورپی خاندان السنہ میں شامل کر دیتا ہے۔ اردو کی ابتدا و کس سے ہوئی یہ معرکتہ آلارا مسئلہ زمانہ قدیم سے ہی ہندوستانی زبانوں کے محققین کے لئے اہمیت کا حامل بنا رہا۔ جدید تحقیقات نے اس مسئلہ کو بڑی حد تک حل کر دیا ہے یا اردو کے متعلق یہ تنازعات دراصل ان اسباب کی دین ہیں جو پچھلے ابواب میں تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ محض قدیم مواد' تاریخی شواہد اور تحریری ثبوت کے نہ ملنے کی وجہ سے ایک مدت تک محض مفروضات ہی پر انحصار کرنا پڑا تھا۔

اردو چوں کہ ایک عظیم الشان تہذیبی اختلاط کے نتیجہ میں عالم وجود میں آئی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی میل جول کا سبب تھا اگرچہ بعض ماہرین اس سے صاف انکار بھی کرتے ہیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ اگر ہندوستان میں فارسی بولنے والے مسلمانوں کی آمد نہ ہوتی یا اگر وہ آتے بھی ہوتے مگر فاتح قوم کی حیثیت سے نہیں تو بھی اردو کے جنم کے متعلق صورت حال مشکوک رہتی۔ یہاں فارسی کا اس واسطے بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ اردو پر غالب اثر جدید فارسی زبان کا ملتا ہے ورنہ صرف عربی اثرات کی وجہ سے مقامی زبانیں کسی نئی زبان کو پیدا کر سکتیں تو آٹھویں صدی عیسوی میں ہی یہ کام ہو جاتا کیوں کہ عربوں نے سندھ پر حکومت قائم کر لی تھی اس کے باوجود

کوئی نئی زبان تخلیق نہ پاسکی البتہ سندھی پر عربی زبان کے گہرے اثرات پڑے سندھی اپنی بنیادی آریائی خصوصیات سے دستبردار ہوئی۔ جب کہ فارسی بولنے والے ترک نژاد افغان اور مغلوں نے ہندستان کی شمال مغربی علاقے کی زبانوں پہ بہت گہرائی اور گیرائی سے اثر ڈالا۔ مغربی ہندی کی زرخیز مٹی والی زبانوں میں کھڑی بولی نے سب سے زیادہ فارسی اور عربی کے دباؤ کو سہارا اور ایک ایسی دلکش لطیف اور پیاری زبان کو جنم دیا جسے آج ساری دنیا اردو کے نام سے جانتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ کوئی زبان ابتدا ہی سے مکمل نہیں ہوتی بل کہ اسے مختلف ارتقائی مراحل سے نہایت کامیابی سے گذرنا پڑتا ہے چناں چہ اردو نے بھی اس راہ میں ہر امتحان کامیاب کیا اور آج ایک باضابطہ زبان کے روپ میں پردہ دنیا پہ نمودار ہے۔

باب دوم

جدید ہند آریائی زبانوں کا جائزہ

اُردو کا تعلق مغربی ہندی سے ہے جو گریرسن کی تقسیم کے لحاظ سے اندرونی گروہ کا لسانی جتھہ ہے ہندوستان کے دو تہائی سے زیادہ علاقے میں ہند آریائی زبانیں بولی جاتی ہیں جب کہ مابقی حصوں میں دیگر خاندان السنہ جیسے دراوڑی اور منڈا کی زبانیں رائج ہیں۔ ان کے بولنے والوں کا تناسب بھی اسی اعتبار سے ہے۔ ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء مختلف ادوار میں الگ الگ ڈھنگ سے ہوتا رہا عہد حاضر میں ہند آریائی زبانیں نئے رنگ و آہنگ اور روپ سروپ میں رائج ہیں جنھیں ماہرین لسانیات نے مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے ان کی شناخت کو سہل بنا دیا ہے۔

جدید ہند آریائی زبانوں کے ضمن میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے گریرسن کی "اندرونی و بیرونی گروہ بندی" سے اختلاف کرتے ہوئے جو علاقائی گروہ بندی کی ہے ان کے معاصرین اور بعد والوں نے تھوڑے بہت اختلاف اور معمولی سے ردّ و بدل کے ساتھ اس کو قبول کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی تالیفات میں قریب قریب ویسی ہی تنظیم کی ہے جیسی چٹرجی نے کی تھی۔

چٹرجی کی گروہ بندیاں زیادہ تر فنی تکنیکی نوعیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ہند آریائی اور ہندی میں ان کا تفصیلی تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ جس کا دلچسپی اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ ہندوستانی لسانیات کی تفہیم میں بے حد مددگار ہے۔

ہند آریائی زبانوں کے مطالعہ کا اعلیٰ اور موضوعاتی بلند معیار ہمیں ہورن لے گریرسن، جیولز بلاک، لائل ٹینیز، مولانا محمد حسین آزاد، پروفیسر حافظ شیرانی، ڈاکٹر سنیتی چٹرجی،

پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خاں پروفیسر شوکت سبزواری، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر محمد حسن، دھریندر ورما، پرکاش گوتم، رام چندر شکل، ڈاکٹر ڈھولا ناتھ تواری، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر اودے نارائن تیواری، سوریہ پرکاش اگروال، سہیل بخاری، شہید اللہ، رشید حسن خاں وغیرہ کی گراں قدر تحقیقات میں ملتا ہے۔ ان میں سے بعض تحقیقتوں نے لسانیاتی مطالعہ کے اصول وضع کئے ہیں اور لسانی تحقیق کی راہیں متعین کی ہیں بعض علماء نے بلاشبہ اس میدان میں عظیم الشان اضافے بھی کئے ہیں۔

"ہند آریائی اور اردو" کے اس دلچسپ موضوع کا یہ تقاضہ ہے کہ عصری ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایک ایسا تحقیقی مواد اکٹھا کیا جائے جو عملی اور نصابی دونوں حیثیتوں سے کارآمد ثابت ہو۔

اگرچہ کہ ہندآریائی زبانوں کی جدید گروہ بندیوں کی تفصیلات پچھلے صفحات میں دی گئیں ہیں تاہم یہاں موضوع کی ضرورت کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا اجمالی طور پر تقابلی جائزہ بے سود نہ ہوگا۔ اس ضمن میں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس جائزہ کا آغاز کہاں سے کیا جائے اس کے لئے ہم جدید عہد کا انتخاب کریں گے جو ۱۰۰۰ء کے بعد سے آج تک کا مانا جاتا ہے۔ اس عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ ہند آریائی زبانیں اپنے ڈھائی ہزار سالہ ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی ایک ایسے دور میں قدم رکھتی ہیں جب کہ ہندوستان کا ماحول ایک طویل مدت کے لئے بیرونی عناصر کو قبول کر رہا تھا و نیز سیاسی اعتبار سے ایک نازک موڑ سے گزر رہا تھا۔ مسلم فاتحین کی سلسلہ وار آمد نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دو اجنبی تہذیبیں ایک دوسرے مل رہی تھیں زندگی کے ہر شعبہ میں تغیرات رونما ہو رہے تھے ان ساری باتوں نے حالات کو بڑی حد تک غیر یقینی بنا رکھا تھا مگر جلد ہی ان میں اعتدال آگیا سیاسی انتشار دور ہو گیا جنگ کے بادل چھٹے اور امن کی چاندنی نکھر آئی۔ مقامی لوگوں نے بیرونی حاکموں کو قبول کر نیا تہذیبوں کو شریفانہ سمجھوتے ہوئے جس کے نتیجہ میں، ایک نئی رنگا رنگ کیفیت پیدا ہوئی اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے نے قبول کیا ایسے ماحول میں "ہند آریائی زبانیں" اپنی خصوصیات بناوٹ اور ساخت، قواعدی سانچوں اور صوتیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کس قدر قریب اور کتنی دور تھیں یہ معلوم کرنا اور زبان کی نوعیت سمجھنے میں آسانیاں پیدا کرے گا۔

جدید ہندآریائی بولیوں کو ہورن لے گریرسن نے معکوس انداز سے اندرونی اور بیرونی گروہوں میں بانٹا ہے یعنی ہورن لے نے جس گروہ کو اندرونی کہا ہے گریرسن نے بیرونی اور اوں الذکر نے جس کو بیرونی

گروہ بتایا ہے موخرالذکر نے اسے اندرونی قرار دیا جس کی تفصیل آپ پچھلے ابواب میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں اندرونی اور بیرونی گروہوں کی بنیادی شناخت کس طرح کی جائے اس کا اجمالی جائزہ لیں گے۔

دونوں گروہوں میں تلفظ میں اختلاف ملتا ہے۔ گریرسن کی تقسیم کے لحاظ سے جو زبانیں اندرونی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں ان میں "س" کا تلفظ صحیح ہوتا ہے جب کہ بیرونی گروہ سے تعلق کی زبان میں "س" کا تلفظ "ش" میں بدل جاتا ہے یہی نہیں بلکہ بیرونی گروہ کی بعض زبانوں میں قدیم ایرانی کے زیر اثر یہی "س" کا تلفظ "ہ" میں ڈھلتا ہے مثلاً سنسکرت کا "سپت" "ہفت" کہلاتا ہے سنسکرت کا "سندھ" "ہند" کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ لہٰذا اوستھی میں "کوس" "کوہ" کہا جاتا ہے۔ اندرونی گروہ کا "س" بیرونی گروہ کی مشرقی شاخ بنگالی میں "ش" میں بدلتا ہے یہی کیفیت مرہٹی میں بھی ملتی ہے یہی نہیں بلکہ مشرقی بنگالی اور آسامی وغیرہ میں "س" کا تلفظ چ اور "س" کی درمیانی آواز اختیار کرلیتا ہے۔

ان گروہوں میں دوسرا اختلاف اسماء کی شکلوں کا فرق ہے لگ بھگ سب ہی اندرونی گروہ کی شاخوں میں الفاظ کے ساتھ حروف کو جوڑا جاتا ہے جیسے سے، نے، کا، کی، کے کو وغیرہ اس کے برخلاف بیرونی گروہ کی زبانوں میں ترکیبی صورت پائی جاتی ہے جو لسانی اعتبار سے ترقی کی علامت ہے چوں کہ اندرونی گروہ کی زبانیں تفصیلی حالت میں ہیں ان میں حالت فاعلی کا، کی، کے سے بنتی ہے ان زبانوں میں "کا" خود علیحدہ بھی ایک معنی رکھتا ہے۔ مگر بیرونی زبانوں میں صورت ترکیبی ہونے کی وجہ سے معاملہ جداگانہ ہے جیسے بنگالی میں (اِر) لگاتے ہیں اور یہ علامت اس وقت اسم کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

بیرونی زبانوں میں فعل ماضی سے فاعل کی تجنیس اور تعداد کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کے برعکس اندرونی گروہ میں ہر قسم کے فاعل کے ساتھ ایک ہی شکل رہتی ہے جیسے اندرونی گروہ سے تعلق رکھنے والی زبان اردو میں "میں اٹھا" "تو اٹھا" اور "وہ اٹھا" فعل اٹھا ہر جگہ یکساں رہتا ہے جب کہ بنگالی لفظ "ماری لام" سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ مارنے والا (میں) ہے اردو میں معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے مارا 'میں نے مارا' تو نے مارا یا اس نے مارا۔

اندرونی اور بیرونی گروہوں کے درمیان فرق و امتیاز کی مندرجہ بالا مثالوں سے ان زبانوں کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندرونی و بیرونی کی گروہ واری تقسیم اور ان کی شناخت اور علامات اور ان سے متعلق دلائل گریرسن کی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو میں ان تفصیلات کو پیش کرنے کے بعد سنیتی کمار چٹرجی اور بی بی مدار[1]

---

[1] بنگالی زبان کی تاریخ، بی مدار ص۔ بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص۶۱ چھٹا ایڈیشن

کے حوالوں سے ان کا بطلان بھی پیش کیا ہے (دیکھئے کتاب مذکورہ صفحہ ۶۲) اس کے آخر میں موصوف نے چٹرجی کے استدلال کی تائید کرتے ہوئے ان کی جدید ہند آریائی زبانوں کی "گروہ بندی" سے اتفاق کیا ہے جو مختلف علاقوں میں ان کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے کی گئی ہے۔

ہند آریائی لسانی جتھا اور مغربی ہندی: مغربی ہندی اگرچہ کہ چٹرجی کی تقسیم کے لحاظ سے وسطی ہند کی سب سے اہم لسانی جتھہ پر مشتمل ہند آریائی شاخ ہے چوں کہ اردو زبان کا راست تعلق اسی لسانی جتھہ سے ہے بنا، برایں مغربی ہندی اور دیگر لسانی گروہوں کا لسانی خصوصیات کے پیش نظر جائزہ پیش ہے پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے چٹرجی کے لسانی نقشہ میں ترمیم کرکے جو گروہ بندی کی ہے وہ پانچ گروہوں پر مشتمل ہے ان کا سرسری جائزہ حسب ذیل ہے۔

شمال مغربی گروہ اور مغربی ہندی: شمال مغربی گروہ کی زبانوں میں سے لہندا (مغربی پنجابی) پر پیشاچ زبانوں کا زیادہ اثر ہے لہندا کے قواعد اور فرہنگ مشرقی پنجابی (پنجابی) سے مختلف ہیں۔ اس کا رسم الخط پہلے منڈا تھا اور اب فارسی ہے۔

دوسری زبان سندھی کا رسم الخط عربی ہے اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہے یہ دونوں زبانیں کئی لحاظ سے مغربی ہندی سے بالکلیہ جداگانہ نوعیت کی ہیں۔

جنوبی گروہ اور مغربی ہندی: اس کا رسم الخط دیوناگری ہے یہ زبان ادب سے مالا مال ہے اس میں صیغہ تثنیہ پایا جاتا ہے جو گجراتی کو چھوڑ کر کسی اور زبان میں موجود نہیں۔ اس میں مغربی ہندی کی طرح اسما کا اختتام (و) ہوتا ہے اور جمع (اے) جوڑ کر بنائی جاتی ہے اس کے بعض حرف اسما اور افعال دکنی میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً نکو (نہیں) اور چ تاکیدی (آپ ہی) حذائچ (حذا ہی) وغیرہ

مشرقی گروہ اور مغربی ہندی: مشرقی گروہ کی زبانوں آسامی اور بنگالی کے قواعد میں یکسانیت پائی جاتی ہے جبکہ دونوں میں ادبی رجحانات میں اختلاف ملتا ہے بنگالی میں مغربی ہندی کا (آ) بدل کر (او) ہو جاتا ہے اور (س) بدل کر (ش) ہو جاتا ہے اس کا رسم الخط براہمی کی ایک قسم ہے مغربی ہند سے یہ مختلف صورت رکھتی ہے۔

اڈیا کو اتکلی بھی کہا جاتا ہے۔ قدیم ات کل دیس موجودہ اڑیسہ کی زبان کا رسم الخط بہت مشکل اور الجھا ہوا ہے یہ مغربی ہندی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔

بہاری کا تعلق ماگدھی اپ بھرنش سے ہے اس کا رسم الخط دیوناگری ہے اس کے علاقہ میں مغربی ہندی کی جدید بولیاں ادبی حیثیت سے رائج ہیں۔

مشرقی ہندی، مغربی ہندی کے پورب میں رائج ہے اس کی خاص بولیاں اردھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی ہیں یہ بعض خصوصیات میں مغربی ہندی سے مشابہ ہیں۔

درمیانی گروہ اور مغربی ہندی: درمیانی گروہ میں پہاڑی بولیاں بھی شمار کی گئی ہیں یہ بولیاں راجستھانی سے بہت قریب ہیں اور مغربی ہندی سے ان کا کم واسطہ ہے

گجراتی کی ساری بولیاں ایک دوسرے سے بہت نزدیک اور مشابہ ہیں ان میں "س" اور "ہ" کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا۔ جب کہ مغربی ہندی میں انکا تلفظ آسان ہے۔ اسما کی غیر فاعلی حالت میں "ا" برقرار رہتا ہے۔ ماضی مطلق میں "ل" علامت کا استعمال جو مغربی ہندی میں نہیں یا اردو (مغربی ہندی کی شاخ) میں ڑ۔ ڑھ۔ اور گجراتی میں اس کے مقابل ڈ اور ڈھ کا استعمال ہوتا ہے۔

راجستھانی میں مغربی ہندی کے برعکس (اَ) (اِ) (اے) اور (او) کا تلفظ ذرا الگ سا ہے جیسے کا تلفظ "س" سے قریب اور س بالعموم ھ سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ راجستھانی کی ایک شاخ میواتی کا قدیم اردو کی تشکیل میں تعاون رہا ہے راجستھانی کے علاقوں میں اردو اور ہندی (مغربی ہندی کی جدید شاخیں) کا ادبی زبانوں کے طور پر رواج ہے اُس کی دوسری شاخوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کئی امور میں مغربی ہندی سے نزدیک نظر آتی ہیں۔ ان کے زیادہ افعال مغربی ہندی کے نہج پر ہوتے ہیں برج (مغربی ہندی کی شاخ) کی طرح مستقبل کے لئے دو علامتیں استعمال کی جاتی ہیں (ہوں اور گو) [1]

مشرقی پنجابی یا پنجابی کو ہم نے علیحدہ عنوان کے تحت بحث کی غرض سے اس باب میں شامل نہیں کیا ہے مغربی ہندی میں شامل مختلف زبانوں کے ایسی تعلقات کے جائزہ کے ساتھ پنجابی اور اردو کا بھی مطالعہ کیا جائے گا۔

مغربی ہندی اور اردو

یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ اردو ایک ہندوستانی اور خالص آریائی زبان ہے جس کا

---

[1] اس باب میں "مقدمہ تاریخ زبان اردو" سے ہی زیادہ تر استفادہ کیا گیا ہے۔

سلسلہ نسبہ زنجیر مغربی ہندی، شورسینی اپ بھرنش، پراکرتوں سے ہوتا ہوا ویدک زبان کے ذریعہ ہند آریائی خاندان السنہ تک جا ملتا ہے اوپری کڑیوں کی تا بہ حد ضرورت تفصیلات گزر چکیں ہیں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اردو کا اپنی ہمزاد بولیوں سے کس حد تک تعلق اور ربط و ضبط ہے مغربی ہندی سے کن بنیادوں پر کن خصوصیات کی وجہ سے رشتہ قائم ہے اس موضوع پر اگرچہ کہ بہت سارا مواد ملتا ہے ماہرین لسانیات نے اس ضمن میں نہایت بسیط نظریئے قائم کئے ہیں جو بہ ہر پہلو نہایت قابل وقعت ہیں لیکن وہ اس قدر طول طویل بحوث، دلائل اور تقابلی مطالعوں کے وسیع تر فنی پہلوؤں پر مشتمل ہیں کہ نفس مضمون بہ آسانی واضح نہیں ہوتا بل کہ متدی تو ان میں الجھ سا جاتا ہے۔

چوں کہ اردو کا تعلق ہند آریائی جیسے قدیم، وسیع اور تار عنکبوت کی طرح مربوط اور پیچیدہ خاندان السنہ سے ہے اور مزید برآں ایسے خطہ سے ہے جہاں زیادہ تر سیاسی اور تہذیبی انقلابات آئے دن رونما ہوتے رہے ہیں جن کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر براہ راست یا بواسطہ پڑتا رہا یہاں تک کہ بعض دفعہ تو حالات یکسر بدل بھی جایا کرتے رہے اس لئے اردو زبان کے مطالعہ کے وقت ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھ کر بہت احتیاط سے جائزہ لینا ناگزیر ہے۔

اردو کے آغاز اور اس کے منبع کے متعلق جتنے نظریے موجود ہیں ان میں بنیادی عنصر یہ ملتا ہے کہ یہ زبان ہرگز غیر ملکی نہیں بل کہ خالص ہندوستانی ہے جو مغربی ہندی کے بطن سے پیدا ہوئی اور جس کا آریائی خاندان سے اٹوٹ رشتہ ہے بعض خاص انداز فکر رکھنے والے جذبات کی رو میں بہہ کر اس کو غیر ہندوستانی بیرونی اور غیر ملکی زبان ثابت کرنے پر اصرار کرتے ہیں جو ان کے کوتاہ فکر متعصب اور تنگ نظر ہونے پر دلالت کرتا ہے جب کہ حقیقت اس کے بالکلیہ برعکس ہے اردو کے قواعد بنیادی خصوصیات، لسانی ڈھانچہ اور روپ سروپ اس کو ہندوستانی اور خالص آریائی زبان کی جدید شاخ ثابت کرتے ہیں۔ البتہ اس کے ذخیرہ الفاظ اور فرہنگ میں عربی فارسی ترکی یوروپی زبان کے علاوہ بہت ساری زبان کے الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں جو اس زبان کی بے پناہ وسعت، پسندیدگی، رواج اور اہمیت کی علامات ہیں۔ اردو زبان کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ یہ اپنے ابتداء ارتقاء اور تکمیل کے مختلف ادوار میں مختلف حلقوں میں اور مختلف علاقوں میں جداگانہ ناموں سے موسوم ہوتی رہی اس کے باوصف اپنے ڈھانچہ اور لسانی اصلیت کے اعتبار سے ہر وقت ہر جگہ ٹھیٹ ہندوستانی مزاج کی حامل رہی یہ اور بات ہے کہ اردو کے ہندوستانی جسم پر بیرونی زبانوں کے الفاظ کا لباس خوب جچنے لگا۔ اردو کی ابتداء، نشوونما کا اولین

علاقہ وہی تھا جو آج کل پنجاب، ہریانہ، دہلی اور مدھیہ پردیش کا شمالی حصہ کہلاتا ہے جہاں زیادہ تر مغربی ہندی کی مختلف بولیاں بولی جاتی تھیں۔ اگرچہ آہستہ آہستہ اس کا حلقہ اثر بڑھنے لگا اور وسطی ہند کے مشرق جنوب اور جنوب مغربی علاقوں میں بھی دور، دور تک اس کی توسیع ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں اس کا دامن پڑوسی زبانوں کے لئے بھی دراز ہونے لگا۔ چوں کہ ایک خاص علاقہ میں ہی منظم طریقہ پر اس کی ترویج و نشو و نما کا سامان مہیا ہوا تھا اس وجہ سے الگ الگ جگہوں پر یہ زبان غیر منظم ڈھنگ سے پروان چڑھتی رہی لہذا ابتداء میں اس کا نام وہ نہ تھا جو آج ہے بل کہ یہ مختلف نام پاتی رہی بایں ہمہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ یہ زبان صرف اور صرف مغربی ہندی ہی کی شاخ ہے جسے سہولت کی خاطر کبھی دہلوی، ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور جنوبی علاقوں میں کبھی دکنی کبھی گجری اور بعد میں ریختہ، زبان اردو اور اردوے معلیٰ کا نام دیا جاتا رہا۔

مغربی ہندی سرہند سے الہ آباد، دامن کوہ ہمالیہ سے بندیل کھنڈ تک اپنا لسانی دائرہ پھیلائے ہوئے نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں جو زبان مروج تھی مشہور محقق گریرسن نے اس کی مشرقی ہندی کی حیثیت سے شناخت کی ہے اس کا دائرہ کار جیسا کہ کہا جا چکا ہے مغربی ہندی کے مشرق میں دور تک انا جاتا ہے۔ مغربی ہندی کے نخوذ والے علاقوں کا اگر لحاظ کیا جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی ہندی، سنسکرت، پراکرت، شورسینی اپ بھرنش کی جانشین کی حیثیت سے ہند آریائی زبانوں کی حقیقی وارث ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب فرماتے ہیں "لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ شورسینی اپ بھرنش کی ادبی حیثیت کا حال آپ پڑھ چکے ہیں جو ماضی میں پنجاب سے کلکتہ تک علمی و ادبی اغراض کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ مغربی ہندی کے اثرات مغرب میں پنجاب کے علاقوں میں بھی نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں مشرقی پنجابی خوب نکھر آئی بلاوازیں شورسینی اپ بھرنش کی جانشین مغربی ہندی نے گجراتی راجستھانی جیسی بیرونی زمرہ کی زبانوں کو بھی اپنی لسانی خصوصیات اور ادبی شان سے ایسا فیض پہنچایا کہ وہ اس کے رنگ میں رنگ سی گئیں اسی بنا پر ان کو اندرونی گروہ کی زبانوں میں بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔ مغربی ہندی میں صوتی، صرفی

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو، مسعود حسین خاں صاحب ص ۸۰، ص ۸۱

اور نحوی خصوصیات منفرد ہیں۔ قواعدی اعتبار سے عام طور سے تفصیلی میلان نمایاں ہے اس کی بعض بولیوں میں یہ بات انتہا کو پہنچ گئی ہے "ایک زمانہ فعل کے لئے، ایک حالت اسماء کے لئے پائی جاتی ہے اسما اور افعال کی دیگر حالتیں حروف، فعل امدادی اور سابقوں لاحقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہے"[1]

برج بھاشا اور اردو

اُردو کی ابتداء کہاں ہوئی و نیز اردو کا سرچشمہ مغربی ہندی کی کونسی بولی ہے یہ اہم سوال ہیں جن کے جوابات ہمیں ان تاریخی شواہد اور لسانی دلائل میں ہی تلاش کرنا ہے جنھیں ماہرین لسانیات نے اپنی عمر عزیز کے گراں مایہ لمحات صرف کرکے پیش کئے ہیں اس ضمن میں اس قدر تحقیق ہو چکی ہے کہ مزید کوئی نیا خیال ان دھاروں پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتا جو علمائے لسانیات نے اپنے فکر انگیز نظریات کے ذریعہ جاری کئے ہیں۔ یہ امر تو طے شدہ ہے کہ اُردو کی پیدائش دلی کے اطراف واکناف میں ہوئی جہاں مغربی ہندی کی مختلف شاخیں تھیں اس لحاظ سے اُردو کو کسی ایک بولی سے مخصوص و منسوب کر دینا خلاف واقعہ ہوگا کیوں کہ بنیادی طور پر اس کا ڈھانچہ مختلف بولیوں کے اجزاء سے ترکیب و تشکیل پاتا ہے جو اتفاق سے سب کی سب مغربی ہندی سے تعلق رکھتی ہیں ان بولیوں میں برج بھاشا ہریانی بندیلی قنوجی اور کھڑی بولی شامل ہیں۔ اس تفصیل سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔
(۱) دلی کے قرب وجوار میں اُردو کی ابتدا ہوئی۔ (۲) اُردو کی جنم بھومی یا مقام پیدائش کے طے ہو جانے کے بعد دوسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُردو کا رشتہ مغربی ہندی یا مغربی ہندی کی مختلف بولیوں سے ہے۔ یہاں ان بولیوں کی خصوصیات پر نظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ اُردو کے مزاج کو پرکھنا سود مند ہوگا تاکہ صحیح صورت نمایاں ہو سکے۔

اُردو اور برج بھاشا کے آپسی تعلق یا برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ بتانا بڑے دلچسپ عنوان ہیں بالخصوص برج بھاشا سے اُردو کے نکلنے کی بات صاحب آب حیات مولانا محمد حسین آزاد نے بڑے روز دار انداز سے کہی ہے ان کی کتاب آب حیات میں زبان اردو کی تاریخ کے زیر عنوان۔ پہلا جملہ ہی وہ تہلکہ خیز ثابت ہوا کہ آج تک کے لگ بھگ سب ہی ماہرین نے اس کو نہ صرف نقل

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اُردو مسعود حسین خاں صاحب صفحہ ۸۰، و صفحہ ۸۱

کیا ہے بل کہ اس پر نہایت گرما گرم تبصرے بھی کئے ہیں۔ مولانا آزاد مرحوم فرماتے ہیں۔ "اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے [1] اپنے اس دعویٰ کے بعد انہوں نے برج بھاشا کے ماخذ، اس کے وطن، اس کی ابتداء نشو ونما اور ارتقاء پر مفصل روشنی ڈالی ہے انہوں نے سنسکرت کو خالص اعلیٰ برہمن طبقہ کی علمی و ادبی زبان قرار دیتے ہوئے اس کے مذہبی پس منظر کو پیش کیا ہے جب کہ عوامی بول چال سے جو زبانیں عالم وجود میں آئیں انھیں پراکرت بھاشاؤں کا نام دیا ہے۔ انھیں ان گنت بولیوں میں برج بھاشا بھی شامل ہے جس کا ہمیشہ ہی سے مرکز ہندوؤں کا یاتر تھ استھان، مقدس شہر متھرا رہا۔ متھرا کی مذہبی حیثیت کے لحاظ سے سنسکرت زبان کا یہاں پرورش پانا اور روز افزوں ترقی پانا اور مذہبی ورثہ کی حیثیت سے اس کا تحفظ کیا جانا ایک تاریخی حقیقت ہے جب ایک ہی مرکز میں دو زبانیں موجود ہوں۔ اور پہلو بہ پہلو ترقی پاتے رہیں تو ان کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا فطری امر ہے لیکن سنسکرت کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کیوں کہ اس کی حفاظت خاص ڈھنگ سے کی جاتی رہی جس کی وجہ سے سنسکرت پر کسی اور کا اثر نہ پڑ سکا وہ اپنے مخصوص دائرہ ہی میں مقید رہی جب کہ برج پر ایسی کوئی پابندی نہ تھی لہٰذا برج بھاشا میں سنسکرت کے گہرے اثرات ملتے ہیں مولانا آزاد نے اسلام کے داخلۂ ہند کے نتیجہ میں فارسی زبان کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے فارسی کے تاریخی تسلسل کی نشان دہی فرمائی ہے اور کہا ہے کہ "سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژندواستا کی زبان! یورپین کے رشتے سے ایک دادا کی اولاد ہیں [2] مگر جب وہ آپس میں ملتی ہیں تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف شکل وصورت میں ہوتی ہیں۔ تاہم انہوں نے فارسی اور سنسکرت کے چند ملتے جلتے الفاظ تمثیلاً پیش کئے ہیں۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پتر	زانو	جانو	اسپ	اشو	بیم	بھے
پور	پتر	بار	بھار	برادر	بھراتر	خاشاک	کشپا
مادر	ماتر	بوم	بھوم	انگشت	انگشٹ	خر	کھر [3]

---

[1] [2] [3] مقدمہ آب حیات۔ مولانا محمد حسین آزاد ص ۱۵، ۱۸

اسلام کی ایران میں آمد کے نتیجہ میں عربی زبان نے فارسی زبان کو متاثر کیا جس کی وجہ سے اس میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں عربی اور ترکی الفاظ کی آمیزش اور تراکیب کے بدلاؤ نے اس کی شکل و صورت بدل دی مسلمان یہی ملی جلی فارسی لے کر ہندوستان آئے جہاں برج بھاشا نے اس کو راہ دی اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی ہے کہ اسلام نے یہاں قدم رکھتے ہی اختلاط الفاظ کی بنیاد ڈال دی تھی غوری کی رائے پتھورا پر فتح کا حال ایک مشہور شاعر چند رکوی نے پرتھی راج راسو نامی طویل تصنیف میں لکھا ہے۔ راسو کی زبان پر فارسی عربی کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ امیر خسرو کی بعض غزلوں و نیز خالق باری ہندو شعراء کے منظوم کارنامے بالخصوص کبیر کے کلام میں، گرو نانک جی کی تصنیفات اودھی کی پدماوت، تلسی داس کی رامائن سورداس کے کلام کی بنیاد اگرچہ برج بھاشا تھی مگر ان سب میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت اس نظریے کی تائید میں بہترین مثالیں ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے قریبی سماجی تعلقات روز بروز مضبوط ہو رہے تھے لہٰذا ان کا یہاں کی مروجہ زبان کو اختیار کرنا لازمی تھا برج بھاشا میں عربی و فارسی ملا کر بولتے رہنے سے ایک نئی زبان نے جنم لیا اور اس نئی زبان کا نام بعد میں اردو ہو گیا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے اس خیال کی روشنی میں برج بھاشا اور اردو کا تقابلی مطالعہ صحیح صورت حال کو واضح کرے گا۔ پروفیسر حافظ شیرانی نے اپنی مشہور تصنیف "پنجاب میں اردو" میں برج بھاشا کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا ہے جن کی روشنی میں اردو سے برج کے نمایاں اختلافات ظاہر ہوتے ہیں۔ برج بھاشا کا مغربی ہندی سے ماں بیٹی کا رشتہ تو مانا جا سکتا ہے لیکن اردو زبان کا برج سے نکلنا ماہرین کے لئے قابل قبول نہیں قدیم و جدید علماء لسانیات نے اس ضمن میں بعض خصوصی نکات جو قابل غور ہیں پیش کئے ہیں۔ اس طرح سے ہیں۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو صوتی اعتبار سے دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے یعنی اَو یا اُو والی بولیاں اور (اَ) والی بولیاں۔ برج بھاشا کا تعلق اول الذکر سے ہے جب کہ اردو کا تعلق (اَ) والی بولیوں سے ہے۔

برج بھاشا میں (اَے) اور (اَو) کا استعمال ہے جب کہ اردو میں (اِے) اور (او) البتہ جدید اردو کا رجحان برج کی طرف ہے قدیم اردو میں پیسہ اور برج بھاشا میں پَیسہ اسی طرح میں اور مَیں، ہے اور ہَے وغیرہ۔

برج میں ضمیر واحد متکلم کے لئے "مَیں" اور "ہوں" دونوں رائج ہیں اردو میں

"ہوں" معدوم ہے تاہم دکنی میں اس کے استعمال کی چند مثالیں مل جاتی ہیں۔
برج بھاشا میں "مو" اور "موہیں" کا استعمال ہے اُردو میں "مجھے"
برج بھاشا میں مخاطب واحد و جمع کے لئے "تو" "توں" کے ساتھ ساتھ "تئیں" اور "تیں" کا استعمال ہوتا ہے اور مذکر و مونث کا لحاظ بھی کیا جاتا ہے۔ اُردو میں یہ نہیں ملتے۔ برج کے "تیرا" اور "تمہارا" میں بدل جاتے ہیں۔ برج پر راجستھانی اثر کا نمونہ "تہارو" بھی ہے جو دہلوی زبان کے محاورات کے سوائے اُردو میں موجود نہیں۔ برج کی صوتی خصوصیات کا اثر ضمائر بھی قبول کرتے ہیں جیسے تمہو، ہمارو، میرو اُردو میں ان کی شکل یوں ملتی ہے تمہیں، ہمارا اور میرا۔
اسماء کی جمع کے لئے برج بھاشا میں "ن" کا اضافہ کیا جاتا ہے اردو میں "وں" جیسے برج میں گھوڑن اُردو میں گھوڑوں و نیز باتن، گھاٹن، گوالن، گاین وغیرہ
برج بھاشا میں فعل مضارع کے لئے ات کا اضافہ ہوتا ہے اور اردو میں "تا" گا جیسے کرت، پرت جاتا اردو میں کرتا پرتا اور جاتا ہو جاتے ہیں۔ برج میں مذکر کے لئے تو اور مونث کے لئے تی کی شکلیں بھی لائی جاتی ہیں مثلاً جاتو، نہارتی وغیرہ [1]
"برج میں مصدر (لبو) یا (دو) یا (نو) آخر میں لگانے سے بنتا ہے مثلاً برج میں ہوبو = ہونا اُردو
بوجھبو = بوجھنا چلبو = چلنا
برج میں مستقبل کے لئے گو آتا ہے اور اردو میں گا جیسے مارونگو = ماروں گا اکثر یہ مستقبل کا (گ) (ہ) سے بدل جاتا ہے جیسے مارہوں یا مارے ہوں بمعنی ماروں گا۔ مارے ہیں = ماریں گے یا مارے ہے = مارے گا۔
برج بھاشا میں تھا کی تعریف اُردو سے مختلف ہے یعنی واحد مذکر "ہو" واحد مونث "ہی" جمع مذکر "ہے" اور جمع مونث "ہیں"۔
ماضی ناتمام میں "ہو" بجائے "تھا" لاتے ہیں مثلاً "میں" مارتا تھا کو "میں" مارے ہو مضارع میں بہت کم فرق ہے "ہوں" ماروں "ہوں" = "میں مارتا ہوں" وغیرہ
اردو کی لام برج میں رے سے بدل جاتی ہے جیسے جلنا، برج میں "جرنا" ہو جائے گا۔ برج میں

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۲۱۳ تا ۲۲۰ بحوالہ برج بھاشا دیاکرن = دھریندر ورما۔

لڑے کا استعمال بہت کم ہوتا ہے جبکہ اردو میں بہ کثرت لڑ بالعموم رائے مہلہ سے بدل جاتی ہے لڑائی = لرائی، جوڑی = جوری بعض دفعہ ڈال سے بدل جاتی ہے جیسے بڑا = بڈا، گاڑی = گاڈی، گاڑنا = گاڈنا وغیرہ [1]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب لکھتے ہیں کہ برج اور اردو میں اختلافات کے باوجود سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہجہاں کے تبدیلی دارالسلطنت (۱۶۴۸ء) تک اردو کے ارتقاء میں اس کا بڑا ہاتھ رہا ہے [2] یہ بات تو بہرحال ثابت ہے کہ اردو زبان برج بھاشا سے نہیں نکلی البتہ ایک خاص دور میں جب کہ اردو بولنے والوں کا برج کے مرکز متھرا آگرہ میں صدیوں رہنا ہوا تو اس کے نتیجہ میں برج کے اثرات اردو پر اور اردو کے اثرات برج پر ضرور مرتب ہوئے اور یہ دور تھا دارالسلطنت کا آگرہ کو قرار دیئے جانے کا زمانہ جو کم و بیش دو صدیوں پر محیط تھا۔ برج بھاشا چوں کہ شعر و شاعری، موسیقی و سنگیت کی زبان مانی جاتی تھی۔ مسلمان فن کاروں، شاعروں، صوفیوں کا برج بھاشا کی طرف التفات اسی کا نتیجہ تھا۔ چناں چہ برج بھاشا میں شعر کہنے والے سینکڑوں شعرا پیدا ہو گئے۔ اس دور میں برج بھاشا کو گوالیاری کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ فارسی داں مسلمانوں نے برج بھاشا کو اپنی ہندی شاعری کے لئے منتخب کیا ہوگا تو لازمی طور پر اس زبان پر فارسی کے گہرے اثرات پڑے ہوں گے یہی وہ وجہ ہے جس کو بنیاد بنا کر اردو کے برج سے استخراج کا نظریہ قائم کیا گیا ہے۔

بندیلی اور اردو

بندیلی یا بندیل کھنڈی اور اردو میں مغربی ہندی کے بنیادی گروہی اختلافات ہیں بندیلی کا تعلق (او) والی بولیوں کے گروہ سے ہے جب کہ اردو کا تعلق (اَ) والی بولیوں سے ہے بندیلی کا حلقۂ اثر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے وسط ہند کی سابق دیسی ریاستوں کے حدود سمیت بندیل کھنڈ، آگرہ، مین پوری ایٹہ تک ایک بہت وسیع علاقہ میں بندیلے اس زبان کو بولتے ہیں اس کا قنوجی اور برج بھاشا سے بہت قریبی رشتہ ہے ویسے بندیلکھنڈی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمسایہ بولیوں سے گھل مل کر ایک

---

[1] بحوالہ پنجاب میں اردو محمود شیرانی صہ ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹

[2] مقدمہ تاریخ زبان اردو صہ ۲۲۳

درمیانی شکل وصورت اختیار کرلیتی ہے یہ صرف ان علاقوں تک محدود ہوتا ہے جہاں اس کا اختلاط دوسروں سے ہوا کرتا ہے۔ بندیلی کے مشرق میں بگھیلی، جنوب مغرب میں راجستھانی اور جنوب میں مرہٹی بولی جاتی ہیں۔ مرہٹی کو چھوڑ کر بندیلی کے ہر ایک سے اختلاط کے نتیجہ میں درمیانی بولیاں وجود میں آئیں تاہم بندیلی میں ادب کا ایک وسیع سرمایہ موجود ہے۔

بندیلی اور اردو میں اختلافات کے باوجود بندیلکھنڈ کے علاقوں میں جہاں اُردو کا چلن ہے صوتی لحاظ سے بندیلی کے واضح نقوش پائے جاتے ہیں۔ بندیلی میں تلفظ کی بعض اپنی خصوصیات ہیں اس میں حروف (اے) اور (اَو) چھوٹے ہوکر (اِ) اور (اُو) بن جاتے ہیں مثلاً بیٹی سے بٹیا (بجائے بیٹیا) اور گھوڑے سے گھروا (گھوڑوا نہیں) دوسرے حروف علت (آئی) بالعموم (اے) اور (اُ) (او) میں بدل جاتے ہیں۔ مثلاً گیہوں (گے ہوں) اور (اُور) بجوپالی اُردو میں یہ تلفظ عام طور سے ملتا ہے جیٹھنا کینا (کہنا) تیرنا۔ ہے۔ پیسہ۔ کیسا۔ میں وغیرہ۔

حروف صحیح میں برج بھاشا کی طرح (ڑ) عموماً (ر) سے بدل جاتی ہے۔ (ہ) ہمیشہ گرادی جاتی ہے جب کہ اُردو میں یہ دونوں صورتیں نہیں پائی جاتیں البتہ بجوپالی اُردو میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں جو استثنائی صورت ہے۔ تبدیلی کے تمام علاقوں میں بہت کے بجائے بہوت کا استعمال ملتا ہے جو قدیم دکنی میں بھی پایا جاتا ہے۔ اردو میں مونث کے لئے (ن) لگاتے ہیں جیسے تیلی سے تیلن مگر بندیلی میں اس کی جداگانہ صورت ملتی ہے یعنی تیلنی وغیرہ [1]

قدیم اُردو یا بندیلی سے ربط رکھنے والے علاقوں کو چھوڑ کر بہت کم بندیلی اور اُردو کا ساتھ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو متاثر نہیں کرپاتے علاوہ ازیں قواعدی اعتبار سے اور صوتیات کے لحاظ سے بھی ان میں جو فرق پائے جاتے ہیں ان کی روشنی میں بندیلی کی علحدہ اور اُردو کی بالکل جداگانہ شناخت ہے چوں کہ بندیلی اور اردو ایک ہی سرچشمہ کے سوتے ہیں اس وجہ سے ان خردی اختلافات کے باوجود ان میں اصل اور بنیاد کی ہم آہنگی تو پائی جاتی ہے اردو اور بندیلی میں جو نمایاں امتیاز ہے وہ یہ کہ بندیلی میں مجموعی اعتبار سے بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے جب کہ

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۸۲، ۸۳

اُردو میں اس کا فقدان ہے اردو میں کئی اسباب وعلل کی بناء پر بڑی لسانی زرگار رنگی ملتی ہے۔

قنوجی اور اُردو

مغربی ہندی کی (او) والی بولیوں میں قنوجی بھی شامل ہے اس لحاظ سے اس میں اور اردو میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ قنوجی کی خالص شکل ایٹہ فرخ آباد اور شاہجہاں پور کے علاقوں میں ملتی ہے جب کہ کانپور میں، بندیلی اور ہردولی میں اودھی کا اثر قنوجی پر ملتا ہے پیلی بھیت میں اس کا برج بھاشا سے ملاپ ہوتا ہے۔ قنوجی میں بہت زیادہ قسمیں نہیں ملتی ادبی حیثیت سے بھی یہ پیچھے ہے کیوں کہ برج بھاشا کے وسیع تر پھیلاؤ نے اس کو ترقی کرنے سے روک دیا۔ برج بھاشا اور قنوجی میں قواعدی اعتبار سے بہت نزدیکی ہے۔ تاہم برج کے برخلاف (اَو) کی جگہ (اُو) کا استعمال ہوتا ہے جہاں تک حروف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ میں ان کے آخر میں (او) بڑھا دیا جاتا ہے۔ جب کہ اُردو میں ایسا نہیں کیا جاتا مثلاً اُردو کے گھر کو قنوجی میں گھرو کہتے ہیں قنوجی میں حروف علت کے بیچ کا (ہ) گرا دی جاتی ہے جیسے کہیں ہوئے کے بجائے کہیں اوئے[1]

بندیلی کی طرح قنوجی کا بھی اُردو کے ساتھ رشتہ فقط ایک سرچشمہ کی حد تک نظر آتا ہے۔ جہاں تک موتی خصوصیات اور قواعدی اصول ہیں ان میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ بندیلی یا برج اور اُردو کے درمیان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ برج سے قنوجی کے بہت سے امور میں قریبی روابط ہیں چوں کہ اُردو کے ارتقاء اور نکھار میں برج کا جو کچھ کردار ہے اس کا اگر لحاظ کیا جائے تو برج کے توسط سے قنوجی کا بھی تھوڑا بہت حصہ مانا جا سکتا ہے۔

ہریانی (بانگرو یا جاٹو) اور اُردو

اُردو کی ابتداء، نشوونما اور ارتقاء کی مختلف منزلوں میں جن زبانوں کا بنیادی کردار ہے ان میں ہریانی کے حصہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مانا جا چکا ہے کہ اُردو کی ابتدا اور نشوونما نواح دہلی کی بولیوں کے زیر اثر ہوئی ہے لہٰذا دہلی کے قرب میں جو زبان سب سے زیادہ مقبول تھی وہ ہریانی یا

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اُردو ص ۸۶

بانگرو یا جاٹو تھی اس ضمن میں دورِ حاضر کے تقریباً سب ہی محققین متفق ہیں چناں چہ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں "یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے [1]" چوں کہ ہریانی پنجاب اور دہلی کے درمیانی علاقوں میں بولی جاتی ہے اس وجہ سے اردو کی تشکیل میں ہریانی عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا پروفیسر حشام حسین صاحب نے بھی اردو پر پنجابی اور کھڑی بولی کے ساتھ - ساتھ ہریانی کے اثرات کو تسلیم کیا ہے کیوں کہ دہلی میں رائج زبانوں میں سے ہریانی بھی ایک تھی ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب بھی اردو اور ہریانی کے آپسی تعلق کو اہمیت دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اُردو کی تشکیل میں اور مابعد ارتقاء میں نواح دہلی کی دیگر بولیوں کی طرح ہریانی کا بھی بنیادی حصہ ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۲۱۲ میں فرماتے ہیں "اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا قدیم اردو کھڑی بولی اور جمنا پار کی ہریانی بولی سے قریب تر ہے" ظفر ادیب کا خیال ہے کہ "ہریانی کو اردو کی تعمیر و تشکیل میں دخل رہا ہے اور یہ دخل کافی رہا ہے [2]" - پروفیسر سہروری صاحب کو ہریانی اور اُردو کے مابین چند امتیازی اختلافات کی بناء پر اردو پر ہریانی کے اثر کو ماننے میں تامل ہے بل کہ انھیں اُردو کے مغربی ہندی کی بولیوں سے تعلق کو تسلیم کرنے میں بھی چند دقتیں نظر آتی ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے نہ صرف مغربی ہندی بلکہ مشرقی ہندی کی تشفی بخش مطالعہ کی ضرورت پر زور دیا ہے تاکہ اُردو کے آغاز کا مسئلہ یکسو ہو سکے [3]

اُردو اور ہریانی کے تعلقات کے بارے میں مندرجہ خیالات ہمیں اردو کی تعمیر و ترقی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنے کا ایک قیمتی وسیلہ ہیں اُردو پر ہریانی کے اثرات ان دونوں میں کس حد تک موافقت اور کس حد تک اختلاف ہے یہ معلوم کرنا موضوع کی ضرورت ہے۔

اُردو زبان کا مغربی ہندی کے اس لسانی گروہ سے تعلق ہے جس کی اساس (اَ) پر ہے برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی (اَو) والی بولیوں سے متعلق ہیں ہریانی اور کھڑی بولی (اَ) والی بولیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہریانی اور اردو میں یہ بنیادی مماثلت ہے شاید اسی وجہ سے پروفیسر شیرانی نے ہریانی کو قدیم اردو کی ایک شکل سمجھا ہے۔ پروفیسر ژول بلوک

---

[1] ہندوستانی لسانیات ص ۹۵ [2] اردو زبان کا قومی کردار ص ۲۲۹ [3] زبان اور علم زبان پروفیسر سہروری ص ۲۱۶، ۲۱۷

[illegible] دکنی قدیم کی تحقیق کے ضمن میں اس کو اہمیت دی ہے چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں یوں گویا ہیں "جو لوگ پہلے پہل اپنی زبان کو دکن لے گئے، پنجاب سے متعلق تھے بلکہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبہ سے تعلق رکھتے تھے۔"

چوں کہ ہریانی زبان میں ادبی سرمائے کا فقدان ہے اور ساتھ ہی اس زبان کے قواعد بھی عدم دستیاب ہیں اس وجہ سے ہریانی سے متعلق لسانیاتی تحقیقات میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اورینٹل میگزین[1] کے نومبر ۱۹۳۱ء اور فروری ۱۹۳۲ء میں جو مضامین شائع فرمائے ہیں ان سے اس ضمن میں بڑی تلافی ہوئی ہے شیخ عبداللہ انصاری، شیخ محبوب عالم، جھجھر، اکرم رہتکی، شاہ عبدالحکیم اور شاہ غلام جیلانی کی ادبی تصنیفات کے علاوہ عالمگیری دور کے میر عبدالواسع بانسوی کی حمد باری اور فرہنگ غرائب اللغات وغیرہ سے ہریانی کی ادبی حیثیت کا تعین کیا جا سکا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے ہریانی کے قواعد کی کمی کو دور کرنے کے لئے بڑی گرانقدر مساعی فرمائی ہے ڈاکٹر صاحب موصوف نے مقدمہ تاریخ زبان اردو میں ہریانی اور دکنی کے زیر عنوان ہریانی اور اردو کا تقابلی جائزہ لیا ہے جو بڑی حد تک اس ضرورت کی تکمیل کرتا ہے جو موضوع سے متعلق ہے۔

ہریانی میں اردو کی ڑ کی جگہ ڈ کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ہریانی اور قدیم دکنی میں لسانی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ڑ کی بجائے ڈ کے استعمال کی چند مثالیں چھوڑ ہریانی میں چھوڈ پڑھے = پڈھے = بڑا = بڈا، چڑھنا، چڈھنا بلاد جہی نے سب رس اور قطب مشتری میں اسی طرح استعمال کیا ہے) ہریانی کے قدیم مصنف شیخ عبدی کے ہاں فقہ ہندی میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ اساڑھ = اساڈھ۔ بڑھئی = بڈھئی، بڑھنا = بڈھنا، بھیڑ = بھیڈ، پیڑو = پیڈو۔ فقہ ہندی میں ترف کی حرکت سے [illegible] علت کے اضافہ کی مثالیں، برائی = بورائی۔ رکھے = راکھے، سیکھ = سیاکھ، سکھانا = سکھاونا نیں = نائیں، ہڈی = ہاڈی، لہو = لوہو وغیرہ غرائب اللغات میں۔ بند = باندھ، بندر = باندر، تو = تاتو، تپ = تاپ، پھلکنی = پھونکنی ملتے ہیں۔ اسی طرح کی اور مثالیں سب رس، نشہ پارے۔ محشر نامہ وغیرہ میں مل جاتی ہیں۔

بلانا = بولانا، چھپاتی = چھپاتی، لگا = لاگا، بیٹی = باٹی، رکھوں = راکھوں، چلیں = چالیں۔

---

[1] بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۲۶۸، ۲۷۰

ٹڑی = ہڈی وغیرہ۔ علاوہ ازیں عنہ کا کثرت استعمال اردوئے قدیم (دکنی) میں ہریانی کے ہی زیر اثر ہے۔ جیسے سے = سیں، کو = کوں، تو = توں علامت مصدر میں بھی اس کا رواج ملتا ہے۔ نا = ناں بولنا = بولناں، چلنا = چلناں، کھانا = کھاناں، جانا = جاناں وغیرہ سانا = سنتانا، آدمی = آدمیں برسات = برسانت۔ محشر نامہ (شیخ محبوب عالم ہریانوی) میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں پہلے = پہلیں بچائی = بچنجائی۔ پاس = پانس اور سیں کوں توں وغیرہ۔

ہریانی اور قدیم اردو (دکنی) میں جمع بنانے کا طریقہ بھی مشترک ہے۔ دونوں میں جدید معیاری اردو کے قاعدے "وں" کے بجائے "آں" لگاتے ہیں مثلاً ٹکراں، غزیباں، جھوٹاں اوٹتاں، گھوڑاں گھتیاں وغیرہ

موجودہ ہریانی میں پنجابی کے زیر اثر سے سوں، سیں اور ساں ملتے ہیں جب کہ قدیم اردو میں اس کا فقدان ہے [1]۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں: ہریانی اور اردو کے آپسی تعلقات اور قدیم اردو (دکنی) پر ہریانی اثرات کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری کا موقف جداگانہ ہے وہ زبان اور علم زبان میں فرماتے ہیں "مغربی ہندی کی بولیوں میں دو تمیز شاخوں ("او" اور "آ" اساس والی بولیوں) کے نشو ونما پانے کے بارے میں جو لسانی شہادتیں دستیاب ہوتی ہیں وہ ابھی پوری طرح یقین آفریں نہیں ثابت ہو سکی ہیں۔ ہریانی کے "آ" اساس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ لسانی حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ہریانی اپنی خصوصیتوں میں جہاں پنجابی سے مشابہ ہے وہیں مشدد حروف یا دہرے مصمتہ کے استعمال میں اردو سے مختلف ہے پنجابی میں مشدد حروف دہرے مصمتہ یا جفتیاے ہوئے، روپ کا استعمال ایک عام رجحان ہے اردو میں ان دہرے مصمتہ کے ماقبل کے مصوتہ کے دراز ہو جانے کی وجہ سے ایک مصمتہ گر جاتا ہے (جیسے ہتھ سے ہاتھ چنڈ سے چاند وغیرہ) ہریانی اس عمل کے آغاز اور تکمیل کے درمیانی مرحلے کی زبان ہے۔" "لیکن اردو میں یہ عمل مکمل ہو چکا ہے" [2]۔

ہندوستان کے مرکزی علاقہ بالخصوص دہلی پر آئے دن انقلابات کے سلسلے پڑتے رہے

---

[1] مقدمہ سب رس بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۲۷۱ تا ۲۷۵

[2] زبان اردو علم زبان ص ۲۱۷

دارالسلطنت کی حیثیت سے ہر سیاسی تبدیلی کا گہرا اثر دہلی کی سماجی و معاشرتی زندگی پر پڑتا رہا بیرونی حملہ آوروں کا نشانہ بھی یہی شہر بنتا رہا ان کے زیر اثر یہاں کی زندگی اتھل پتھل ہوتی رہی ہریانہ چوں کہ دہلی سے قریب ہے اس بنا پر دہلی کی ہر تبدیلی کا ہریانہ پر اثر پڑنا فطری بات تھی تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح زبانوں کا متاثر ہونا تعجب خیز نہیں یہی وجہ ہے کہ ہریانی زبان میں بہت زیادہ تغیر و تبدل ہوتے رہے ہریانی اور کھڑی بولی کا زمانہ تقریباً یکساں ہے۔ لسانی اعتبار سے وہ دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف قریب بلکہ بعض دفعہ ماہرین کو ایک ہی بولی کے دو روپ ماننے پر سوچنا پڑا ہریانی کی قدامت کے بارے میں سب ہی متفق ہیں البتہ اس میں ادبی سرمائے کی ابتدا بہت بعد میں ہوئی ہریانہ میں ادبی تحریک کے نتیجہ میں غریب اللغات جیسی نادر لغت مرتب ہوئی چنانچہ ہریانی زبان کی معیاری حیثیت کا ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے یوں اندازہ کیا ہے۔ "میر عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات ہندی کی تصنیف کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہانسی کے نواح کی ہریانی بولی معیاری مانی جانے لگی تھی جو جمنا پار کی میرٹھ ضلع کی کھڑی بولی (ہندوستانی) سے بہت مماثلت رکھتی تھی[1]"۔ ڈاکٹر صاحب آگے فرماتے ہیں۔ "قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیر اثر ہوتی ہے اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پروفیسر احتشام حسین صاحب کا خیال ہی زیادہ قابل قبول نظر آتا ہے جو انہوں نے اردو کے ضمن میں ظاہر کیا ہے جس سے اردو اور ہریانی کے آپسی رشتہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ "اردو دراصل کھڑی بولی اور ہریانی کے سرچشمہ ہی سے پیدا ہوئی اور اسی کی بنیاد پر اردو کا ڈھانچہ تیار ہوا"۔ بہرحال اردو کی تعمیر و تشکیل میں، ہریانی کے اہم حصہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

کھڑی بولی اور اردو

مغربی ہندی کی (آ) اساس کی بولیوں میں کھڑی کا شمار کیا جاتا ہے یہ دلی اور مغربی اتر پردیش میں عوام کی بول چال کی زبان تھی بوجہ بھاشا کے نرم و نازک لب و لہجہ کے مقابل کھڑی بولی میں لہجہ کا مردانہ پن اور آوازوں کی درشتی اس کے نام پر اثر انداز ہوئی ہو۔ چٹرجی کے خیال میں اس کا تعلق مسلمان بادشاہوں سے ہو گیا تھا اسی لئے اس کو کھڑی بولی سے موسوم کیا گیا جب کہ اسی علاقے کی دوسری

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو

زبان یعنی برج کو پڑی بولی کا نام دیا گیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کھڑی بولی کا نام ایڈیلنگ نے دیا ہوگا۔
گریرسن نے اپنے لسانیاتی جائزہ ہند میں کھڑی بولی کا رقبہ مغربی روہیلکھنڈ سے ضلع انبالہ کی مشرقی تحصیلوں تک شمال میں دہرہ دون کے میدانی علاقوں سے دہلی تک قرار دیا ہے ہندی کے مشہور و معروف عالم پنڈت چندر دھر شرما گلیری کے بموجب "بدیسی مسلمانوں نے اگرہ، دلی، سہارن پور اور میرٹھ کی پڑی بولی لوگوں" بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے مطابق بنا لیا[1] پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے بھی کھڑی بولی اور ہریانی کو قدیم مانتے سے انکار فرمایا ہے۔
کھڑی بولی کی شناخت کا آسان طریقہ یہ ہے "تا" (علامت مصدر) "تا" (علامت مضارع) آ" (علامت ماضی) "کا" (علامت مستقبل) اور کا۔ میں۔ پر۔ سے والی بولی کھڑی بولی ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کھڑی بولی کی قدامت کے ثبوت میں ایک وقیع اور ٹھوس مواد اکٹھا فرمایا ہے انہوں نے عہد اپ بھرنش کی تصنیفات کے لسانیاتی جائزہ کے ذریعہ اپنے خیال کو واضح کرتے ہوئے بدھ سدھوں کے دوہوں کو بھی بطور شہادت پیش کیا ہے جن میں "نہ" "نا ہیں" "کری آ" "اجوا" "دری آ" وغیرہ الفاظ کے آپر اختتام کو پنجابی کی خصوصیت کے بجائے اپ بھرنش کے دور کی مروجہ زبانوں کا خاصہ بتایا ہے مزید برآں "کہیا" اور "کہیو" دونوں شکلوں کے رواج کی دلیل پیش کی ہے بدھ سدھوں کے ساتھ ساتھ گورکھ ناتھ جوگیوں کی کتابوں سے بھی چند نمونے دیئے ہیں جن کی زبان دیش بھاشا یا پرانی ہندوستانی (اپ بھرنش) مانی جاتی ہے۔ انہوں نے اپ بھرنش عہد کے ادبی سرمائے کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے (جس کے اقتباسات آگے کسی جگہ آئیں گے) اس دور کی سنسکرت اور ہندی شاعری اور نثری تصانیف کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب نے مدلل طریقے پر ثابت کیا ہے کہ کھڑی بولی کا وجود قدیمی ہے آگے انہوں نے لکھا ہے کہ "کھڑی بولی جس کی شکل ہم قدیم ہندی کے ادب میں پہچانتے آئے ہیں۔ پہلی بار مسلمانوں کے ہاتھوں ایک نئے عروض اور نئے رسم الخط کے ساتھ تشکیل پاتی ہے[2]۔ حضرت امیر خسرو، شیخ باجن اور ابوالفضل جیسے فاضل بزرگوں کی تحریروں سے بھی کھڑی بولی کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے شیخ باجن نے پہلی بار اردو کو زبان دہلوی کا نام دیا۔ حضرت امیر خسرو جن کی نثری مثنوی میں ہندوستانی بولیوں کی تفصیل ملتی ہے "زبان دہلوی" بھی الگ حیثیت سے

---

[1] ناگری پرچارنی پتر ص ۴۴ بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۲۰۵ [2] بحوالہ مقدمہ تاریخ و زبان اردو

شامل ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے لکھا ہے کہ "چوں کہ میں ہندوستان میں پیدا ہوں اس لئے چند کلمات اس کی زبانوں کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہر صوبہ کی جداگانہ بولی ہے جو اس کی اپنی اور مواس کی اپنی اور مخصوص اور کسی دوسری زبان کی ماخوذ نہیں"[1] (۱) سندھی (۲) لاہوری (۳) کشمیری (۴) بنگالی (۵) "تمل" (۶) دھور سمندری "کنڑ" (۷) اردھی (۸) گجراتی (۹) تلنگی (۱۰) گوڑی (۱۱) زبان دہلوی (لشکول زبان نواح دہلی)

غیاث اکبر اعظم میں ابوالفضل نے ہندوستانی زبانوں کی فہرست یوں دی ہے۔ (۱) دہلوی (۲) بنگالی (۳) ملتانی (۴) مارواڑی (۵) گجراتی (۶) تلنگی (۷) مرہٹی (۸) کرناٹکی (۹) سندھی (۱۰) افغانی (۱۱) سندھ کابل اور قندھار کے بیچ کے علاقہ کی زبان (۲) بلوچستانی (۱۳) کشمیری۔

ان دونوں فہرستوں میں امیر خسروؒ کی فہرست کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ قدیمہ اور دہلی کے بسنے کے دور کی تقسیم ہے حضرت امیر خسروؒ نے دہلوی اور لاہوری میں امتیاز کیا ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ خسرو کے عہد میں دہلی اور نواح کی زبانوں کی قدیم شکلوں میں مسلمانوں کے زیر اثر تبدیلیاں آنے لگیں اور ایک نئی صورت کھڑی بولی کے روپ میں ابھرنے لگی جس کو بعد میں ہندوستانی کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کا یہ نظریہ کہ "اردو کی تہہ میں جو بنیادی بولی ہے اس کا تعلق نواح دہلی ہی سے ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی کے عہد میں اس پر پنجاب کی زبان کا گہرا اثر رہا ہے جس کی وجہ سے دو تین صدیوں تک اس کا کینڈا متعین نہ ہو سکا"[2]۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو کا بنیادی تعلق پنجاب سے نہیں بلکہ دہلی سے ہے جہاں مختلف مغربی ہندی بولیوں کا چلن تھا۔ پروفیسر محمود شیرانی صاحب کا یہ ادعا کہ اردو کا سرچشمہ پنجابی (لاہوری) ہے اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر امیر خسروؒ نے زبانوں کی جو فہرست دی ہے اس پر نظر ثانی کی ضرورت درپیش ہوگی کیوں کہ انہوں نے لاہوری کو ایک علیحدہ زبان مانا ہے اور دہلوی کو الگ زبان کی حیثیت بخشی ہے اگر مسلمانوں کی پنجاب سے دہلی آمد کے ساتھ ساتھ زبان کی منتقلی کی بات مان لی جائے تو پھر دہلی کی قدیم زبان کے متعلق کیا کہا جائے گا جب کہ

---

[1] تاریخ ہند ایلیٹ اینڈ ڈوسن ص ۵۶۶ جلد سوم ضمیمہ بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۳۱ [2] بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۳۳

وہ پہلے سے نہ صرف موجود بلکہ عوامی بول چال کی زبان کی حیثیت مقبول بھی تھی ۔ جہاں تک اردو کے صوتیاتی اور قواعدی اصول ہیں اتفاق سے کم و بیش سب خسرو کی دہلوی کی ہی دین نظر آتے ہیں ۔ لیکن ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ اردو کی نشو و نما اور لسانی شان کی تعمیر میں پنجاب کا بھی اہم کردار ہے ۔

چوں کہ لاہوری اور دہلوی دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف شکل و صورت میں موجود ملتی ہیں تو اس صورت میں دونوں میں سے کسی ایک کو اردو کے سرچشمہ کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑے گا جہاں تک لاہوری کا تعلق ہے اردو سے اس کا تعلق ماں بیٹی جیسا کئی وجوہ کی بناء پر مانا نہیں جا سکتا ۔ (اس کی تشریحات کسی باب میں آئیں گی) البتہ جہاں تک دہلوی یا کھڑی بولی کا معاملہ ہے اردو کے بنیادی ڈھانچہ سے اس کی صوتی و صرفی و نحوی مناسبت و قربت ایک ناقابل تردید حقیقت ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کے ارتقاء میں دیگر کئی زبانوں کی طرح پنجابی کا بھی حصہ ہو ہاں اردو اور پنجابی میں بعض مماثلتیں قابل غور ضرور ہیں مگر محض چند مماثلتیں کی وجہ سے اردو کا رشتہ پنجابی سے قائم نہیں ہو جاتا ۔ مسلمانوں کے قیام پنجاب کے زمانے میں مقامی زبانوں اور بیرونی عربی و فارسی اور ترکی کے اشتراک و تعاون سے جو بھی زبان معرض وجود میں آئی وہ سب کچھ تو ہو سکتی ہے لیکن اردو نہیں ہو سکتی کیوں کہ اردو زبان کی حقیقی ابتداء کا زمانہ تو مسلمانوں کے ورود دہلی کے بعد ہی مانا جا سکتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ آئی ہوئی لاہوری زبان مقامی بولیوں کے ساتھ گھل مل کر ایک نیا روپ و سروپ اختیار کر کے اردو کا نام پا چکی ہو ۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد نے جہاں سیاسی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا وہیں معاشرتی و ثقافتی میدانوں میں بھی ایک ہلچل سی مچا دی تھی مسلمان اپنے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں ان کے ہزاروں الفاظ لے آئے تھے یہاں پر فتح پنجاب کے بعد انہوں نے پنجابی کو متاثر کیا ۔ قبل ازیں فتح سندھ کے نتیجہ میں سندھی زبان پر عربی و فارسی کا غلبہ نمایاں تھا ۔ پنجاب کے بعد جب ان کے قدم دہلی کی طرف بڑھے یہاں انہوں نے فتح و ظفر کے پرچم لہرا دیئے اور دہلی کو دارالسلطنت کا قدیمی موقف عطا کیا دہلی میں سلاطین اور مسلمانوں کے ساتھ مقامی باشندوں کا رابطہ ضبط ہوا دونوں فریقوں کو کاراجرائی کے لئے کسی نہ کسی ایسے رابطہ کی زبان کی احتیاج تھی جو ہر دو فریقوں کو مطمئن کر سکے ۔

دہلی میں مروج زبانوں میں جو ساری کی ساری بنیادی طور پر آریائی نسل کی نمائندہ اور خالص ہندوستانی مزاج کی حامل تھیں ان میں کھڑی بولی اور دیگر ہمسایہ زبانوں نے نو واردوں کے لئے اپنا دامن وسیع کر دیا ۔ اور ان کے لائے ہوئے بیرونی زبانوں کے الفاظ کے لئے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ۔ کھڑی جو عام بول چال

کی زبان تھی اس ضمن میں خامی پیش پیش رہی جب کہ برج بھاشا وغیرہ کو اپنے تحفظ اور اپنے لسانی حصار کی سلامتی کی فکر دامن گیر تھی۔ برج کے الگ ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے کھڑی بولی کو اپنا کر اسے اسفل السافلین سے نکال کر علو منزلت درجات عطا کر دیئے ابتداء میں جس طرح پنجابی میں عربی فارسی کی آمیزش کا عمل جاری تھا اسی طرح مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد کھڑی بولی میں یہ تسلسل برقرار رہا اس کی صوتیات کے دائرہ میں عربی فارسی آوازوں کے نامانوس داخلہ نے بتدریج صورت حال پر اثر ڈالا اور ایک ایسا صوتی نظام بن رہا تھا جس میں فارسی لہجہ اور تلفظ کی کھپت ہو سکے۔ اس طرح کھڑی بولی ادبی حیثیت سے بالکل نہتی دامن تھی اور صرف بول چال کی زبان ہونے کی وجہ سے ایک چھوٹے سے علاقہ میں محدود تھی نئے عناصر جذب کر کے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی [1]

ہمیں یہ ماننے میں کوئی تامل ہی نہیں کہ اردو کا صرف اور صرف دہلوی ماحول میں ہی آغاز ہوا بلکہ مسلمانوں کی پنجاب میں آمد کے ساتھ ہی ایک نئی زبان کا خمیر تیار ہونا شروع ہو گیا جو دو سال کی مختصر مدت میں اس قابل ہوا کہ دہلی پہنچ کر ایک مخلوط زبان کے کینڈا کی صورت گری کا خاکہ پیش کر سکے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی اردو کا کینڈا مسلمانوں کے دہلی میں آنے کے تین سو سال کے دوران متعین ہو سکا۔ دہلی کی مرکزیت ایک تاریخی حقیقت ہے یہاں پنجابی ہریانی کھڑی اور برج بھاشا سب ہی کے علاقے ملتے تھے۔

کھڑی بولی دراصل اردو ہندی کے اس بنیادی روپ کا نام ہے جو عہد قدیم میں اپ بھرنش کی نمائندہ اور قدیم ہندی کی صورت میں اطراف دہلی رائج تھی۔ عہد انگلشیہ میں اس کو ہندوستانی کا نام دیا گیا تھا [2] فورٹ ولیم کالج میں شری للو لعل جی نے ادبی اردو نثر کے نمونے دیوناگری میں جو نثر لکھنی شروع کی۔ اس کے لئے کھڑی بولی کا نام استعمال کیا۔ [3]

کھڑی بولی ابتداء ہی سے مسلمانوں کی پسندیدہ رہی ہندوؤں نے اپنی شناخت کے لئے برج کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ جب کہ مسلمان صوفی بزرگوں کی عام گفتگو کھڑی بولی میں ہوا کرتی البتہ کبیر کے پاس مخلوط زبان ہوا کرتی مسلمانوں کا کھڑی کے ساتھ یہ تعلق کئی لحاظ سے اس بولی کے حق میں ایسا مفید ثابت ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس زبان نے ترقی کی وہ بلند و بالا منزلیں سر

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۵۵ [2] زبان اور علم زبان ص ۲۱۹

کرلیں جو اس کی ہم عصر بولیوں کے لئے آج تک بھی ممکن نہ ہو سکا۔ پہلی بات تو سلاطین دہلی کی شاہی سرپرستی، فاتح قوم کی دلچسپی نے اس زبان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔ امراؤ رؤسا و شعراء اہل قلم سبھوں نے اس کی حسب مقدور حوصلہ افزائی کی عوام نے اس کو اختیار کیا سینے سے لگایا سر پر بٹھایا۔

اگرچیکہ مغل عہد تک یہ ارتقاء کی ابتدائی سیڑھیوں پر ہی تھی مگر شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ حکومت میں کھڑی بولی نے روپ میں خوب نکھری خوب سنوری۔ اس نے جو نیا روپ اختیار کیا تھا اسے شروع شروع میں زبان دہلوی ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ دکن پہونچ کر دکنی کہلائی گجرات میں گجری نام پھر ریختہ زبان اردو اور اردوئے معلی کہی گئی۔ مغربی مصنفین نے ہندوستانی کا نام دیا آسانی کے لئے اسے اردو یا ہندوستانی کہنا مناسب ہوگا[1]۔

اردو اور پنجابی

"اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر وطن اختیار کر لیا ہے"[2] پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے ان الفاظ میں اردو کی ابتدا کی بابت اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اظہار خیال فرمایا ہے جیسا کہ پچھلے صفحات میں مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے سبب اردو کے آغاز کے نظریات کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں۔ چوں کہ اردو پر فارسی اور عربی کے گہرے اثرات ملتے ہیں اور ترک نژاد مسلمان فاتحین اور عام مسلمان جو فارسی بولا کرتے تھے پہلے پہل میں ہندوستان کے شمال مغربی صوبہ پنجاب کو اپنے زیر نگین کیا اور پنجاب میں باضابطہ بود و باش اختیار کر کے اسے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اگرچہ کہ اس سے پہلے سندھ مسلمان عرب فاتح محمد بن قاسم کے قبضہ و تصرف میں آچکا تھا عربوں اور سندھی بولنے والوں کے آپسی اختلاط سے کسی نئی زبان نے جنم نہیں لیا تھا۔ سوائے اس کے کہ سندھی زبان میں عربی الفاظ کی کثرت ہو گئی اور بعد میں سندھی کا رسم الخط عربی میں بدل گیا ٹھیک اسی طرح جنوب میں ملابار کے ساحلی علاقوں میں عرب تاجروں کی آمد و رفت کی وجہ سے مقامی بولیوں میں عربی کے اثرات تو ملتے ہیں مگر کسی نئی زبان کے آغاز

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۵۵

[2] پنجاب میں اردو پروفیسر محمود شیرانی

کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اس ضمن میں بعض قدیم بزرگ ماہرین السنہ نے جو قیاسات پر مبنی نظریات قائم کئے تھے جدید تحقیقات نے انھیں پوری طرح رد کر دیا ہے۔ لیکن پنجاب کا معاملہ دوسرا ہے یہاں پر جو مسلمان آئے وہ صرف عربی ہی نہیں بولتے تھے بل کہ ان کی زبان فارسی تھی ساتھ ہی تھوڑی بہت عربی کا ان پر اثر تھا مگر چوں کہ بنیادی طور پر ان کی زبان ایران سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں تک ایرانی لسانی کنبہ کی شاخ فارسی کا تعلق ہے وہ بھی ہند۔ یورپی خاندان کی نسل ہی سے متعلق ہے ادھر ہندوستان میں سوائے جنوب کے چند صوبوں کو چھوڑ کر ہر جگہ ہند آریائی لسانی کنبہ کی زبانیں ہی بولی جاتی تھیں جو رشتہ کے اعتبار سے ایرانی کنبہ سے نسلی ہم سری رکھتی ہیں۔ ہند ایرانی اور ہند آریائی دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان السنہ ہند یورپی سے ہونے کے ناطے ان میں کچھ نہ کچھ مناسبت تو ضرور ہے جب کہ عربی قطعاً دوسرے خانوادے یعنی سامی خاندان السنہ کی نمایندگی کرتی ہے اس وجہ سے ہند آریائی اور عربی میں بیّن فرق انھیں ایک دوسرے سے قریب کرنے میں مانع رہا جس کی بنیاد پر سندھ اور مالا بار میں باوجود موافق حالات کے وہ دونوں مل کر بھی کوئی نئی لسانی تاریخ نہ بنا سکے۔

مسلمانوں کی فتوحاتِ ہند کا دوسرا سلسلہ محمود غزنوی سے ہوا جس نے متعدد مرتبہ ہندوستان میں فاتحانہ پیش قدمی کی مگر آخر میں پنجاب میں مستحکم حکومت قائم کر کے ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود کی ایک نئی تاریخ کا آغاز کیا۔ غزنی حکومت نے لاہور کو دار السلطنت قرار دے کر لگ بھگ پونے دو سو سال تک کامیاب حکومت کی۔ اسی عہد میں ہندی زبان کے فارسی پر اور فارسی زبان کے ہندی پر اثرات کا سلسلہ زور و شور سے چلتا ہے اردو کی پنجاب میں ابتدا کے بارے میں نظریہ چند تاریخی حقایق اور لسانی مماثلتوں کی بنیاد پر اس قدر اہم ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے اس موضوع پر معلوماتی مباحث کا دلچسپ سلسلہ جاری ہے پروفیسر شیرانی کا خیال آپ نے پچھلے کسی باب میں تفصیل سے جان لیا ہے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ پنجاب میں اردو کے زیر عنوان ان کی کتاب میں جو دلائل ملتے ہیں انھیں محض جدید تحقیقات کی آڑ لے کر یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا پروفیسر موصوف کے استدلال اور لب و لہجہ کے وزن کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ متاخر محققین اور ماہرین السنہ نے بھی جو ہندوستانی زبانوں پر کام کرتے ہوئے اپنی قیمتی زندگیاں وقف کر چکے ہیں۔ پروفیسر شیرانی کی بعض دلیلوں کو رد نہیں کر سکے بہر حال پنجاب میں

اُردو کا آغاز ایک ایسا نظریہ ہے جسے ایک عرصہ تک بے حد مقبولیت حاصل رہی۔ یہ ضرور ہے کہ اُردو زبان جس کے کینڈے کا تعین نواح دہلی کی بولیوں کے زیر اثر خالص ہندوستانی زبان کی حیثیت سے مغربی ہندی کے مرکزی علاقہ میں ہوا اس کی ابتداء کا سہرا پنجاب کے سر ہے جہاں اس نئی مخلوط زبان کا خمیر تیار ہوا۔ کسی زبان کے عالم وجود میں آنے کے لئے دو سو سالہ ابتدائی کاوشیں لسانی اعتبار سے بے حد اہمیت رکھتی ہیں ان سے انکار گویا حقائق سے منہ موڑ لینا کہلائے گا۔

حضرت امیر خسروؒ نے پنجاب کی زبان کو لاہوری زبان سے موسوم کیا ہے۔ گریرسن نے پنجابی کو اندرونی گروہ کی زبانوں میں شمار کیا ہے جب کہ مغربی پنجابی کو جسے لہندا بھی کہا جاتا ہے بیرونی گروہ میں شامل کیا ہے لیکن اہل پنجاب دونوں کو ایک ہی مانتے ہیں یہ اور بات ہے کہ پورے پنجاب میں ضلعی اعتبار سے بولیوں میں تھوڑا بہت فرق ان کے نزدیک کوئی بڑی چیز نہیں۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد پنجابی زبان ترقی کے زینے تیز رفتاری سے طے کرنے لگی اور بہت جلد اس میں علم و ادب کا ایک گرانقدر سرمایہ اکٹھا ہو گیا۔ پنجابی پر فارسی کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کے اختلاط کے نتیجہ میں زبانوں کا متاثر ہونا، اذخائر الفاظ کے تبادلے، صوتی تغیرات اور بعض ناگزیر تبدیلیوں کا رونما ہونا پروفیسر شیرانی کے نظریہ کی بنیاد ہے۔ انہوں نے پنجابی اور اردو کا جو تقابلی جائزہ لیا ہے وہ علمی اعتبار سے اور تحقیقی نقطۂ نظر سے نہایت عظیم الشان کام کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر شیرانی مرحوم نے پنجابی اور اُردو کے صرف و نحو کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہونے کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل دیئے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اُردو میں انتقادی تبصرہ کرتے ہوئے ان کا بطلان کیا ہے۔ پہلے ہم اجمالاً پروفیسر شیرانی کے دلائل کو پیش کریں گے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کے تبصرہ کو مختصراً پیش کریں گے تاکہ نفس مضمون واضح ہو سکے۔

(۱) پنجابی اور اُردو میں مصدر کا قاعدہ یکساں ہے۔ علامت مصدر "نا" امر کے آخر میں اضافہ کر دی جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں "ناں" تھا

جو بعد میں متروک ہوا[1]

(۲) تذکیر و تانیث کے قواعد پنجابی اور اُردو میں ایک ہیں۔ اکثر ایسے لفظ جو الف پر ختم ہوتے ہیں تانیث کی حالت میں ی پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً بکرا = بکری، کالا = کالی، گھوڑا = گھوڑی

(۱) جب اسم مذکر حروف علت کے سواء حروف صحیح پر ختم ہو تو تانیت کے لئے نی یا انی کا اضافہ ہوتا ہے۔

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو	مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو	مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
مغل	مغلانی	مغلانی	اونٹ	اوٹنی	اونٹنی	ڈوم	ڈومنی	ڈومنی
لوہار	لہارن	لوہاری	نٹ	نٹنی	نٹنی	سید	سیدزادی	سیدانی
	لوہاری		فقیر	فقیرنی	فقیرنی			
	لوہارنی	لوہارن	زمیندار	زمینداری	زمینداری			
دیور	دیرانی	دورانی						

(ب) اگر مذکر "ی" پر ختم ہو تو مونث میں ی کے بجائے "ن" کا استعمال ہوتا ہے۔

میراثی	میراثن	تیلی	تیلن	جوگی	جوگن

(۳) اعلام و اسما اور اسمائے صفات پنجابی اور اُردو میں الف پر ختم ہوتے ہیں

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اردو
منڈا	لڑکا	گھوڑا	گھوڑا	کتا	کتا	اچا	اونچا

(۴) اسماء صفات تذکر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کے تابع ہوتے ہیں۔

اُردو	اونچا گھوڑا	میرا لڑکا	چھوٹی لڑکی	بڑے لڑکے	چھوٹی لڑکیاں
پنجابی	اُچا گھوڑا	میرا منڈا	نکی کڑی	وڈے منڈے	نکیاں کڑیاں

(۵) خبر و تذکیر و تانیث واحد و جمع میں مبتدا کے موافق آتی ہے۔

---

[1] دیکھئے پنجاب میں اردو پروفیسر شیرانی

اردو (۱) یہ بات بھلی نہیں (۲) یہ باتیں بھلی نہیں پنجابی (۱) ایہ گل چنگی نہیں
(۲) ایہ گلاں جنگیاں نہیں۔

اردو کے دوسرے جملہ میں حالیہ اصلاحی پہلو ہے جب کہ قدیم دور میں یہ جملہ یوں ہوتا۔ یہ باتاں بھلیاں نہیں۔

(۶) فعل تذکیر و تانیث و جمع و واحد میں اپنے فاعل کے مطابق ہے۔

اردو: گھوڑا آیا۔ گھوڑے آئے۔ عورت آئی۔ پنجابی۔ گھوڑا آیا۔ گھوڑے آئے، بڈھی آئی۔

(۷) اضافت اپنے فاعل کے مطابق ہوتی ہے۔

اردو: اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں بعض چاندی کی بعض یاقوت سرخ کی۔

پنجابی۔ اوہ دے وچہ کوٹھریاں رنگ برنگیاں ہیں بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت سرخ دیاں یہاں بھی اردو نے پرانے قواعد توڑے ہیں۔ جمع کی اضافت "ہ" کی "واحد" میں۔

(۸) ماضی مطلق دونوں ایک ہے۔

اردو: وہ آیا، ہم آئیں۔

پنجابی: اوہ آیا، اسی آئیاں

(۹) ماضی قریب فعل امدادی کی تصریف سے بنتی ہے یہاں پنجابی اور اردو میں کسی قدر اختلاف ہے [۱]

(۱۰) ماضی بعید بھی توابع کی تصریف سے بنتی ہے [۲]

(۱۱) ماضی ناتمام میں بڑا فرق یہ ہے کہ پنجابی میں جہاں دال ہے اردو میں تے بن گئی ہے جیسے اردو: وہ مارتا تھا، ہم مارتے تھے پنجابی: اوہ مارداسی، اسی مار دے ساں

(۱۲) ماضی احتمالی دونوں زبانوں میں ایک ہے۔

اردو: وہ کھاتا ہو پنجابی: اوہ کھاندا ہووے

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھئے پنجاب میں اردو، پروفیسر شیرانی ص ۶۵

(۱۳) مضارع دونوں زبانوں میں ایک ہے۔
اُردو : وہ آئے ، ہم آئے
پنجابی : اوہ آوے ، اسی آئیے
(۱۴) فعل حال کی تصریف کا ایک اصول ہے۔
اُردو : وہ کرتا ہے ، وہ کرتے ہیں۔
پنجابی : اوہ کردا ہے ، اوہ کردے نے
(۱۵) مستقبل کا اصول یکساں ہے
اُردو وہ آئے گا ، ہم آئیں گے
پنجابی: اوہ آوے گا ، اسی آوانگے
(۱۶) امر کا قاعدہ ایک ہے۔
اُردو : دیکھ ، جاؤ ، پڑھنا
پنجابی : دیکھ ، جاؤ ، پڑھنا ؎۱
(۱۷) گا پنجابی میں حال کے معنی بھی دیتا ہے۔ اردو میں تحریر میں متروک ہے لیکن عوام بولتے ہیں۔
(۱۸) دعائیہ اُردو اور پنجابی میں ایک ہی طریق پر ہے۔
اُردو :۔ تجھے سانپ ڈسے پنجابی : تینوں سپ لڑے۔
(۱۹) لازمی و متعدی کا ایک ہی اصول ہے۔ متعدی بالواسطہ کا بھی یکساں قاعدہ ہے۔
اُردو : سیکھنا ، سکھانا ، ٹوٹنا ، توڑنا۔
پنجابی : سکھنا سکھاونا ، ٹٹنا ، توڑنا۔
(۲۰) معروف و مجہول کا وہی طریقہ ہے۔
اردو :۔ لڑکی ماری گئی ، لڑکا مارا گیا۔
پنجابی : کڑی ماری گئی منڈا مارا گیا۔

؎۱ تفصیلات کے لئے دیکھئے پنجاب میں اردو

(۲۱) ندائیہ کا یکساں طریقہ ہے۔
اُردو : اے لڑکو پنجابی :- اے یا اوہنڈیو
(۲۲) نفی کے کلمے ایک طرح ہیں۔
اُردو : نہ ۔ نا ۔ ناں ۔ نہیں پنجابی: نئیں ۔ ناہی ۔ ناہیں
(۲۳) امدادی افعال کے ذریعہ مختلف مقاصد کے اظہار کے لئے افعال مرکب بنا لینے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج ہے ۔آنا' ہونا' چکنا' دینا' لینا وغیرہ ۔
پروفیسر شیرانی نے مندرجہ بالا صرفی خصوصیات میں یکسانیت کے لحد تک موافقیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جن کا مختصر تعارفی انداز کا جائزہ پیش ہے۔
(۱) پنجابی اور اردو کی جمع کا اثر تمام جملہ پر محیط ہے۔ جیسے مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں ۔
پنجابی میں یہ جملہ یوں ہوگا ۔ مرن والیاں کڑیاں دیاں ماواں رو ندیا رو ندیاں کیہندیاں سن۔
(۲) پنجابی میں آ۔ جا ۔ کھا وغیرہ کے علاوہ ان ہی کو " ئیں" یا " دیں" لگانے سے مزید ایک اور امر بنتا ہے آدیں ۔ جادیں ' لاویں وغیرہ
(۳) مستقبل کے لئے گا پنجابی اور اردو میں عام ہے ۔ ایک اور مستقبل " سی " کی تعریف سے بنتا ہے [1]
(۴) اُردو میں کھڑا سے مصادر بنتے ہیں جو پنجابی مصدر کھڑنا کی ماضی یا اسم مفعول میں مانی جاسکتی ہے۔
(۵) تھاکو لمانی زبان کے مصدر تھیونا کی ماضی انا جاسکتا ہے۔
(۶) پنجابی اور قدیم اردو میں بعض مصادر کی ماضی خلاف قاعدہ آتی ہے جیسے کرنے لینے دینے سے کیتا' دیتا' لیتا ۔
(۷) پنجابی اور قدیم اُردو میں غیر زبان کے الفاظ کے آخری میں اکثر ایک یا ے زائدہ اضافہ کر دیتے ہیں جیسے نظر سے نظری اور حیات سے حیاتی جدید اُردو میں یہ طریقہ متروک ہے۔

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے پنجاب میں اردو

(۸) نالگا تانگا محاورہ اردو میں مستعمل ہے جو مصدر تانگنا سے مشتق ہے اور مانگنا کا مرادف ہے۔
(۹) چپ چپاتے میں چپاتے کو اہل اردو تابع مہمل مانتے ہیں جبکہ پنجابی میں چپاتا، چپ کا مترادف ہے۔
(۱۰) دن دھاڑے محاورے میں دھاڑے پنجابی لفظ ہے اور دن کے معنی دیتا ہے۔
(۱۱) ملنا جلنا میں اہل اردو جلنا کو تابع مانتے ہی جبکہ پنجابی میں جلنا کے معنی رکھتا ہے
(۱۲) یائے مخلوط قدیم دور میں پنجابی اور اردو میں ملتا ہے جیسے لگیا، منگیا، ہویا وغیرہ۔
(۱۳) پنجابی میں ایسے الفاظ جن میں ثانی حرف علت ہو تو بہ تخفیف حرف علت تلفظ کیا جاتا ہے۔ جیسے کان، ناک ہاتھ اور لات پنجابی میں کن، نک، ہتھ اور لت بن جاتے ہیں۔ اردو میں یہ رجحان ملتا ہے جبکہ بھاشہ میں نوعیت الگ ہے جدید اردو میں دونوں صورتیں حسب موقع رائج ہیں۔ لیکن اردو کا زیادہ تر میلان پنجابی کی طرف ہے۔

بھاشہ	پنجابی	اردو	بھاشہ	پنجابی	اردو	بھاشہ	پنجابی	اردو
بیاکل	بیکل	بیکل	چاکھنا	چکھنا	چکھنا	پاتھر	پتھر	پتھر
کھیال	کھیڈ	کھیل	باندر	باندر	بندر	کاندھا	کندھا	کندھا
کاپوت	کاپوتر	کپوت	باجنا	بجنا	بجنا	ہاڈی	ہڈی	ہڈی

(۱۴) اے، ایہ اور اوہ اسمائے اشارہ قریب و بعید پنجابی کے ساتھ مخصوص ہیں مگر دکنی میں بھی ملتے ہیں۔
(۱۵) حالت مجروری میں کسی لفظ کے آخر میں "ون" کا اضافہ پنجابی اور قدیم اردو میں ملتا ہے مثلاً پچھیوں ہاتھوں یعنی پیچھے سے ہاتھ سے
(۱۶) خلاف قیاس جمع دکنی اور پنجابی میں ملتی ہیں۔ دکنی میں سات کی جمع ستیں دو کی جمع دوہوں پنجابی میں ستے اور دوہوں۔
(۱۷) مصدر کو مصرف کرنے کے لئے اردو و پنجابی میں مصدر کے آخری "حرف" الف کو "ی" سے بدلتے ہیں جیسے نکلنا، جانا کو نکلنے اور جانے سے بناتے ہیں [۱]

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھئے پنجاب میں اردو

ان کے علاوہ پروفیسر شیرانی نے اُردو اور پنجابی کے مشترک الفاظ کی حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب بھی پیش کی ہے جو طوالت کے خوف سے یہاں پیش نہیں کی جاسکتی البتہ "پنجاب میں اردو" میں دیکھی جاسکتی ہے پروفیسر شیرانی صاحب نے اردو اور پنجابی کی مماثلت کرنے کے لئے برج بھاشا کا بھی تقابلی انداز سے جائزہ لیا ہے آخر کار وہ اپنے اس ادعا کو بڑے پر زور انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اُردو درحقیقت پنجابی کی وہ دین ہے جو مسلمانوں کے ورود ہند کے نتیجہ میں عالم وجود میں آئی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو میں پروفیسر شیرانی کے نظریہ کا بطلان کیا ہے۔ انہوں نے "پنجاب میں اردو کے تنقیدی جائزہ کے بعد روزدار انداز سے موخر الذکر کے دلائل کا رد کیا ہے بالخصوص کھڑی بولی اور ہریانی کی قدامت کی پرزور مدافعت کی ہے جو شیرانی صاحب کے معروضات کی بناء پر جدید بولیوں کی صف میں شامل کی جارہی تھیں۔ بعدہٗ ڈاکٹر صاحب موصوف نے قواعدی اعتبار سے پروفیسر شیرانی کی تردید کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ علامت مصدر "نا" پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں بل کہ ہریانی میں ان کے ساتھ "نا" بھی ملتا ہے۔ لفظ کے اختتام پر نون غنہ "ناں" کا حلین دلی کی نواحی بولیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ دلی والے آج بھی وہی کو وہیں بولتے ہیں۔ غنہ کی آواز کی پیدائش جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیر خصوصیت ہے۔

اعلام و اسما اور اسمائے صفات اردو میں الف پر ختم ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ "آ" اساس والی بولی ہے جب کہ برج بندیلی اور قنوجی "او" اساس کی بولیاں ہیں پنجابی میں الف پر اختتام سے اردو کے ساتھ اس کا تعلق قطعاً قابل لحاظ نہیں کیوں کہ یہ آ اور او والی شکلیں ازمنہ وسطیٰ کی پراکرتوں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ لہٰذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اردو بجائے کھڑی بولی کے جو "آ" اساس والی بولی ہے پنجابی سے ہی مشتق ہے۔

پروفیسر شیرانی کے ۳ تا ۷ دلائل کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے ان صرفی مناسبتوں کو بے بنیاد قیاس آرائی قرار دے کر ان کی دہلی کے قرب و جوار کی بولیوں سے مطابقت و مناسبت کی بات کہی ہے۔

آئیاں جائیاں وغیرہ حاتم، میر، سودا سے لے کر لکھنؤ میں میر انیس اور دلی میں داغ تک نے باندھا ہے لال قلعہ کی یہی زبان تھی۔ اردوے قدیم میں "نے" کا استعمال

بے ضابطگی سے ملتا ہے۔ قدیم اردو میں "نے" علامت فاعلی کے طور پر استعمال ہونے لگا افعال کا مفعول کے بجائے فاعلی کے مطابق آنے کی یہی وجہ ہے دکنی میں یہ فاعل مفعول دونوں کے لئے آتا ہے[1] حرف عطف میں "ہور" جو دکنی سے بھی مخصوص ہے پنجابی کی خصوصیت نہیں بلکہ مغربی ہندی کی اکثر بولیوں اور راجستھانی میں مشترک ہے[2] امر کا قاعدہ (علامت مصدر گرا دی جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے جیسے چلنا (چل) کرنا (کر)) امر کا یہ قاعدہ پنجابی یا اردو کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جدید آریائی زبانوں میں امر اسی طرح بنتا ہے اردو اور بنگالی ... اور مرہٹی ... اور گجراتی کی مثالیں موجود ہیں[3]۔

لفظ "تھا" کا تعلق سنسکرت کے "ہو" سے نہیں ستھ स्थ سے ہے اردو کا تھا پراکرت تھائی ... سنسکرت استھت स्थित ہونا اور تھیا ملتانی میں مصدر اور فعل ماضی ہیں پنجابی اور ملتانی میں فعل امدادی ماضی کے طور پر مستعمل نہیں[4] پنجابی میں گا گی گے علاوہ مستقبل "سی" کی تعریف سے بھی بنتا ہے یہ خصوصیت راجستھانی کی اکثر بولیوں میں بھی ملتی ہے:

غیر زبان کے الفاظ کے آخر میں یا ے زائدہ کا اضافہ بھی پنجابی کی تنہا خصوصیت نہیں برج بھاشا قنوجی اور اودھی میں بھی ایسا ہوتا ہے کانپور کی قنوجی میں "بعد" کو "بعدی" کہا جاتا ہے۔

ماڑکا تالگا چھپ چھاتے ملنا جلنا کے دوسرے لفظ کو لغت نگاروں نے غلطی سے مہمل کہا ہے پنجابی میں مستقل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے اس قسم کے دوہرے اسما گھوڑا دوڑا اوٹھا اوٹا میں عام طور سے دوسرا لفظ تابع مہمل ہے۔ لیکن افعال میں عام طور سے ہم معنی لفظ یکجا کر دئے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہندوستان کی نئی آریائی زبانوں میں ملتی ہے۔

حالت مجروری میں "دی" کا اضافہ بھی پنجابی سے مخصوص نہیں اردو میں آنکھوں دیکھا بمعنی آنکھوں سے دیکھا اب بھی مستعمل ہے[5] پنجابی اور اردو کے بعض الفاظ کی آپسی تبدیلی مثلاً پنجابی "و" کا اردو "ب" میں بدلنا کوئی خاص بات نہیں ایسی تبدیلیاں سندھی لہندا

---

[1] [2] [3] [4] [5] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مقدمہ تاریخ زبان اردو

اور گجراتی میں بھی ہیں گجراتی: پروت، وچار وش اردو؛ پربت، بچار، پس سنسکرت؛ وچار، برج دکنی ہریانی کھڑی کا بچار[۱]

تمام ایسے الفاظ جن میں ثانی حروف علت ہو بہ تخفیف حرف علت تلفظ عام طور سے دکنی میں تو رائج ہے مگر جدید اور برج کی متقلد بن گئی ہے۔ پنجابی: منگتا، منگن، بدّل، وچ، چوّل، اچا، لکھ اردو: مانگنا، مونگ، بادل، بیچ، چاول، اونچا، لاکھ۔ برج: مانگتا مونگ بادل بیچ، چاول، اونچا، لاکھ اس سلسلہ میں اردو پنجابی اور برج کے مابین ڈوگری ہے جو قدیم اردو اور دکنی میں یہ تخفیف پنجابی کے زیر اثر نہیں بلکہ برج کو چھوڑ کر نواح دہلی کی تمام بولیوں کی خصوصیت ہے جس کا سلسلہ شورسینی اپ بھرنش سے ملتا ہے۔

جدید اردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی	جدید اردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی
آٹھ	اَٹھ	آٹھ		اوپر	اوپر	اُتّے	
آدھا	آدھ	اڈھ	ایک	ایک	اک		
آج	آج	اَج		بھوکا	بھوکا	بھیڑا بھا	

جدید اردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی
کام	کام	کم	
ہاتھ	ہاتھ	ہتھ	ہاتھ
بیتہ	پات	پتہ	پات

---

[۱] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مقدمہ تاریخ زبان اردو

باب سوم

اُردو زبان کی دکن دیس میں آمد کا تاریخی پس منظر

ہندوستان میں جب آریائی قبائل کا داخلہ شروع ہوا تو انھیں یہاں سب سے پہلے قدیم باشندگان یعنی دراوڑیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سرزمین ہند میں اپنے قدم جمانے کے لئے آریہ لوگ سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے موڈ میں تھے۔ دراوڑی جو کئی اعتبار سے نو واردوں کے مقابلہ میں کمزور تھے اچھی طرح ان کی مدافعت نہ کر سکے اور ان کے آگے ہتھیار ڈال کر لیٹ ہو گئے۔ اپنا وطن ان کے حوالے کر کے ملک کے انتہائی اندرونی حصوں میں پیچھے ہٹ گئے زیادہ تر جنوب کی جانب دور دور تک نکل گئے جہاں تین طرف سمندری ساحلی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ ان علاقوں میں دراوڑیوں سے قدیم قومیں آباد تھیں۔ دراوڑیوں نے جنوبی ہند کے وسیع و عریض خطہ میں جگہ جگہ اپنی تازہ بستیاں بسالیں۔ آریہ جو وسطی ایشیا سے ایران میں رکتے ہوئے ہندوستان آئے تھے ایک ترقی یافتہ تہذیب کے نمائندہ تھے وہ علوم و فنون کے دلدادہ ماہر جنگ، کاشتکاری سے واقف کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی فلسفہ سے بہرہ مند تھے[1] اپنی ان خصوصیات کی بنا پر انہوں نے ہندوستان میں بہت جلد اپنے قدم جما لئے اور یہاں اپنی مستحکم حکومتیں بھی قائم کر لیں۔ آریاؤں کا مذہبی نظام انھیں اپنے سے ہٹ کر کسی اور کے ساتھ خلا ملا کرنے سے روکتا تھا۔ وہ سماج کی طبقہ واری تقسیم کا حامی تھا۔ مذہبی فرائض انجام دینے والا طبقہ سب سے اعلیٰ و ارفع مانا جاتا تھا اس کے بعد کا درجہ حکمران

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے ہند آریائی اور ہندی ڈاکٹر چیٹرجی۔

اور خاکر کا تھا جو آریہ معاشرے میں سیاسی امور پر گرفت رکھتا تھا ان کے بعد کاشتکار، تاجر، اہل ہنر وغیرہ کا مقام تھا۔ نچلا طبقہ تینوں اعلیٰ ذاتوں کی خدمت گزاری پر مامور تھا۔ ایسے سخت مذہبی اصولوں کو ماننے والے آریہ جو خود کو دنیا بھر میں ممتاز ترین خیال کرتے تھے کسی طرح اپنی انفرادی خصوصیتوں سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے تھے ان کا رہن سہن، رکھ رکھاؤ فکری و عملی زاویے بلا شبہہ ان کے انفرادی تہذیبی اقدار کو ظاہر کرتے تھے۔ آریہ لوگ اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے تھے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان میں رائج دراوڑی زبانوں سے جدا تھی۔ انہوں نے ہندوستان میں نہ صرف اپنے مذہب، معاشرے اور فلسفہ زندگی کی حفاظت کی بل کہ اپنی زبان کو بھی مقام اثرات سے بچانے کی سعی کی۔ چنانچہ شکست خوردہ دراوڑی لوگوں سے وہ خرصہ دراز تک اجنبیت برتتے رہے لیکن حالات و ضروریات زمانہ نے انھیں کچھ رواداری پر مائل کیا بھی تو مقامی باشندوں کو اپنے سماجی نظام میں چوتھے درجہ میں شامل کرنا منظور کیا مگر چھوت چھات کے اصولوں پر سختی کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیا دور دراز جنوبی ہند میں بس جانے والے دراوڑی بڑی حد تک آریائی معاشرے کی ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہی رہے مگر آہستہ آہستہ آریائی مذہب کا اثر قبول کرنے لگے۔ دراوڑیوں کی زبانیں ٹامل، ملیالم، تلنگی اور کنڑی وغیرہ جنوبی ہند میں پھیل چکی تھیں۔ ان کا شمال میں اثر باقی نہ رہا تھا اور اگر کچھ تھا تو ہند آریائی زبانوں کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ گیا تھا۔ اس طرح ہندوستان سے وادیٔ عظیم خاندان السنہ کی زبانوں میں تقسیم ہو گیا۔ یعنی شمالی ہندوستان ہند یورپی خاندان کی شاخ ہند آریائی زبانوں کا علاقہ بن گیا اور جنوبی ہند میں دراوڑی خاندان السنہ کی زبانیں اعتبار پا گئیں۔ شمالی ہند میں بدھ مت کے زور کے نتیجہ میں ویدک دھرم کے ماننے والے جنوبی ہند چلے آئے اور یہاں کے دراوڑیوں میں دھرم پرچار شروع کیا ان کی زبان سنسکرت تھی جو ہند آریائی کی نمایندہ علمی و مذہبی زبان تھی۔ جنوبی ہند میں سنسکرت نے دراوڑی زبانوں کو کسی حد تک متاثر کیا مگر خود مقامی زبانوں کے اثر سے محفوظ رہی۔ جنوبی ہند میں آج بھی کثرت سے جو ویدک مذہبی آثار ہیں وہ اسی عہد کی یادگار ہیں جب شمال میں برہمن ازم کے خلاف ایک بڑی تحریک اٹھی تھی اور بدھ مت کا بول بالا تھا۔ اس کے نتیجہ میں شمال کا بڑا مذہبی طبقہ جنوب منتقل ہو گیا۔ یہاں بھی انہوں نے سماج کی طبقہ واری تقسیم کے نظام کو شدت کے ساتھ جاری کیا جس کے نتیجہ میں آج بھی جنوبی ہند

کا ہندو سماج ان بندھنوں میں بندھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

بدھ مت کا جب روز کم ہوا تو شمالی ہند میں ویدک مذہب کے احیاء کی تحریک زور و شور سے اٹھی اور بہت جلد ہندو دھرم کا اثر دوبارہ قائم ہو گیا جس کے نتیجہ میں زندگی کے تمام شعبوں میں ارتقا کا رجحان پایا جانے لگا۔ آریائی زبانیں بھی نئے سرے سے ترقی کرنے لگیں بدھ مذہب نے مہاکریائی زبانوں کی عوامی پراکرتوں کو اپنا وسیلۂ تبلیغ بنایا تھا اس وجہ سے یہ پراکرتیں دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے آسمان پر پہنچ گئیں تھیں مگر سنسکرت کی ترقی رک سی گئی تھی مگر ہندوؤں کی عظمتِ رفتہ کے لوٹ آنے سے "سنسکرت کو ایک نیا وقار اور نئی اہمیت ملی ادھر پراکرتوں نے بھی ادبی حیثیت اختیار کر لی تب لازماً عوامی بول چال کی اپ بھرنشوں نے ان کی جگہ سنبھالنی شروع کر دیں۔ ان سب میں سورسینی پراکرت کی جانشین شورسینی اپ بھرنش بے حد اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ یہ ہندوؤں کے مذہبی مرکز متھرا سے تعلق رکھتی ہے اور اکثر اہم بولیوں کا اس سے رشتہ ہے جن میں قابل ذکر ہندی یا ہندوستانی (کھڑی بولی) کے علاوہ راجستھانی، پنجابی، گجراتی وغیرہ ہیں۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد ایک عظیم تاریخی واقعہ تھی [1] پہلے پہل سندھ پر مسلمان فاتح محمد بن قاسم نے غلبہ حاصل کیا۔ اس سلسلہ کی دوسری اور اہم کڑی سلطان محمود غزنوی کی پیش قدمی تھی جس نے یوں تو کئی بار ہندوستان پر حملے کئے مگر کبھی رکا نہیں مگر آخر کار اس نے پنجاب میں اپنی حکومت کی باضابطہ بنا ڈالی غزنوی خاندان کے دو سو سال تک صوبہ پنجاب میں حکومت کرتا رہا۔ یہی وہ دور ہے جب پنجاب میں جس کا دارالسلطنت لاہور تھا، ہندوستانیوں اور بیرونی باشندوں کے آپسی اختلاط اور میل جول سے ایک رابطہ کی زبان کی ضرورت کے پیش نظر ایک مخلوط زبان کی ابتداء ہوئی تھی اور یہ زبان پنجابی (آریائی) اور فارسی عربی (ایرانی اور سامی) کے اجزاء سے ترکیب پائی تھی۔ اس بات کو کوئی مانے یا نہ مانے مگر پنجاب میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جس زبان کا خمیر تیار ہونے لگا تھا وہ اردو تھی۔ چناں چہ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے بھی اس بات کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ "ابتدائی اردو (یا مخلوط زبان) میں

---

[1] بحوالہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ پروفیسر احتشام حسین۔

پنجابی کی آمیزش نظر آتی ہے [1] غزنوی خاندان کے بعد سلطان شہاب الدین محمد غوری نے پنجاب سے آگے کا ارادہ کیا۔ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کا متحدہ محاذ پرتھوی راج کی سرکردگی میں محمد غوری کے مقابل ہوا لیکن غوری نے پرتھوی راج کو شکست دیدی اور دہلی پر قابض ہو گیا۔ پنجاب سے دہلی تک مسلم فاتحین کے ہمراہ جو زبان آئی وہ پنجابی اور فارسی کا مرکب تھی اس کو چاہے کوئی نام دیا جائے مگر اردو زبان کی انتہائی اولین صورت لئے ہوئے تھی۔ دہلی میں شورسینی اپ بھرنش کی مختلف بولیاں رائج تھیں جو نووارد وں کے لئے "ہندی" ہی کی مختلف شکلیں تھیں چناں چہ تمام قدیم مسلمان مصنفین اور مورخین نے ان بولیوں کے لئے "ہندی" کا لفظ ہی استعمال کیا [2] لگ بھگ (۹۰) سال تک مسلمان دہلی میں عام بول چال کے لئے یہی ہندوی بولی بولتے رہے مگر ادبی اغراض اور شعر و سخن کے لئے انہوں نے کبھی بھی اس زبان کو قابل اعتنا نہ سمجھا صرف روزمرہ کی ضروریات کے لئے فارسی آمیز ہندوستانی کو استعمال میں لاتے رہے مسلمان پنجاب سے جو مخلوط زبان کا کچا سانچہ لے آئے تھے دہلی میں پنجابی کی مشابہت والی مغربی ہندی کی مختلف بولیوں کے ساتھ اس کا واسطہ پڑا یہاں برج بھاشا، ہریانی، کھڑی بولی کے علاوہ راجستھانی اور میواتی بولیوں نے اس محفوظ زبان کے سانچہ کو پختگی دینے کا سامان فراہم کیا یہ ضرور ہے کہ زبان کے کینڈے کا تعین کھڑی بولی کی بنیاد پر ہونے لگا۔ دیگر زبانیں معاونین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جنھیں تمام ماہرین ہندوستانیات بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ اس نشوونما اور ارتقاء کے عہد میں اردو کا چاہے کچھ نام رہا ہو لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ اردو کی تشکیل دہلی کی نواحی بولیوں کی اساس پر ہوئی امیر خسرو نے اس کو دہلوی کا نام دیا۔ اور اسی زبان میں انہوں نے جو کچھ لکھا آج وہ ہندوی کے روپ میں پہچانا جاتا ہے یہی ہندی یا ہندوستانی ہے جو آگے چل کر اردو سے موسوم ہو جاتی ہے۔

یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط اور اشتراک سے وجود میں آنے والی زبان جو ابھی تعینات اور لسانی سانچہ میں ڈھلنے کے ابتدائی مراحل میں ہی تھی۔ دہلی

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ صـ ۵۵ [2] پنجاب میں اردو صـ ۲۳

کے سلطان علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور کے ہمراہ دکن پہنچتی ہے جہاں انہوں نے توسیع سلطنت کے لئے حملے کئے تھے ان کے فتح دکن کے سبب بہت سارے مسلمان یہاں آباد ہو گئے تھے جو اسی مخلوط زبان کو بول چال کے لئے استعمال کرتے تھے۔ دکن اور گجرات کے اطراف واکناف چوں کہ دراوڑی زبانیں رائج تھیں جو بعض لسانی خصوصیات کی بناء پر اپنی خالص صورت میں تغیر کی متحمل نہ تھیں علاوہ ازیں دکن میں جنوبی ہند کے سواحل سے بھی مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ تھا جو یہاں بس گئے تھے ان کے لئے ہندوستان کے شمال سے آنے والی اسی زبان کو جلد اپنا لینا فطری امر بھی تھا۔ لہٰذا فاتحین اور مہاجرین نے اس زبان کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اردو اور دکن دیس

پنجاب ہو یا دہلی۔ اردو کی حیثیت وہاں صرف اور صرف بول چال یا سودا سلف سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ کبھی اس کو اہل علم یا امراء اور روسا کے پاس شاہی درباروں میں جگہ نہ مل سکی یہ ضرور ہے کہ دہلی میں اس کی صورت گری یا کینڈا تیار ہوا لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس میں صرف عامۃ الناس کا ہی بنیادی کردار رہا اہل علم، ماہرین مصنفین شعراء نے اس طرف ابتداء میں کوئی خاص توجہ نہ دی۔ بل کہ اس مخلوط زبان کو وہ ادبی اغراض کے لئے استعمال میں لانا کسر شان سمجھتے تھے البتہ صوفیا کی خانقاہیں جہاں زیادہ تر عوام ہی جاتے آتے تھے اس کو تھوڑا بہت منہ لگاتی تھیں۔ حضرت امیر خسرو رحم اور چند اکابرین کو چھوڑ کر کسی بلند مرتبہ مصنف نے اس عہد میں اُردو (ہندوستانی) کو قابل اعتنا ہی نہ سمجھا۔ اردو کی ابتداء کا سہرا صرف اور صرف عوام کے سر بندھتا ہے جنھوں نے لاہور سے لے کر دہلی تک اس کی ابتدائی صورت گری میں بھرپور حصہ لیا۔

اس نومولود زبان کے مقدر میں لکھا تھا کہ اپنے جائے پیدائش سے بہت دور نشو ونما پائے اور ترقی کرے چنانچہ سب سے پہلے علاء الدین خلجی، ملک کافور اور ان کے لشکر والوں کے ساتھ وہ دکن پہنچی[1] جہاں اسے سرپرستانہ ماحول میسر آیا۔ اس کے بعد اس کی تقدیر دوبارہ چمکی جب محمد بن تغلق نے دہلی کے بجائے دیوگیری (دولت آباد) کو پایہ تخت بنانے کا اعلان کیا۔ دہلی کی ساری آبادی دولت آباد کو منتقل کر دی گئی۔ جنھوں نے اثاثۂ زندگی کے ساتھ اپنی بول چال کی زبان بھی ساتھ لے گئے[2] اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں پورے دکن میں صوفیا اور بزرگان دین کی وسیع تر دینی تبلیغی اور اشاعتی سرگرمیاں شروع

---

[1] تاریخ فرشتہ [2] اکم التواریخ

ہوگئیں محمد تغلق کے دولت آباد کو دارالسلطنت بنانے کے فیصلہ کی بناء پر جہاں سارے امراء رؤسا اور عوام دکن آئے وہیں علماء کرام صوفیا اور اولیاء وصالحین کی کثیر تعداد منتقل ہوئی کسی ایک زمانہ میں اس قدر بڑی تعداد میں بزرگان دین کا کسی ایک جگہ منتقل ہو جانا ایک تاریخی یادگار واقعہ ہے۔ صوفیاء کی چودہ سو پالکیاں یہاں آئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کے مریدین ومعتقدین کی بھی کثیر تعداد یہاں منتقل ہوئی تھی"[1]

قبل ازیں علاءالدین خلجی نے، ۱۲۹۶ء میں گجرات کو مستقل طور پر سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بنا دیا تھا ویسے محمود غزنوی، محمد غوری اور قطب الدین ایبک بھی وہاں پہنچے تھے۔ گجرات میں اردو کے داخلہ کا سبب یہی سیاسی انقلاب ہے۔

دکن دیس میں شمالی ہند سے مسلم حکمرانوں کی آمد سے بیشتر ہی سے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ وہ عرب تاجر تھے جن کی آمد ورفت ابتدائے اسلام کے وقت ہی سے جاری تھی جنھوں نے سواحلی علاقوں کے علاوہ دکن اور مہاراشٹرا کے اکثر مقامات پر بستیاں بسائی تھی[2] علاءالدین خلجی اور ملک کافور کے فتوحات دکن کے پہلے کئی ایک صوفیاء کرام دکن کے مختلف حصوں میں سکونت کر کے اپنے اخلاق حسنہ کے باعث ہندوؤں میں ہر دل عزیز ہو گئے تھے ان کی تبلیغ اور ہدایت جاری تھی[3] ان سب باتوں کے علاوہ ہمیں ان تاریخی واقعات کا بھی سرسری جائزہ لینا پڑے گا جو سرزمین دکن میں اردو کی نشوونما ترقی اور ترویج واشاعت کا باعث بنے۔ جہاں تک اردو کے مولد کا سوال ہے ہم کسی طرح دکن کو نہیں مان سکتے کیوں کہ یہاں دراوڑی زبانوں کے ماحول میں عربی یا فارسی بولنے والوں کے لئے وہ ماحول نہ تھا جو کسی نئی زبان کے وجود کا سبب بنتا اردو بنیادی طور پر ایک آریائی اور لسانی اعتبار سے (اَ) اساس والی زبان ہے جس پر فارسی اور عربی کا غالب اثر ہے جب کہ دکن اور جنوبی ہند کی زبانیں بنیادی طور پر الگ ہیں۔ البتہ مندرجہ بالا تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ مانا جا سکتا ہے کہ سلاطین دہلی کے دکن کو فتح کر لینے کے سبب یہ زبان یہاں پہنچی اور اس کو لانے والے وہ لشکری، سپاہی، تاجر، ہنرمند اور عوام تھے

---

[1] شکارنامہ مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت ص ۹، ۱۰ بحوالہ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر

[2] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ڈاکٹر پرکاش مونس ص ۱۵۰

[3] دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی ص ۳۵

جو فتوحات کے سلسلہ میں یہاں آکر بس گئے یا وہ دہلوی افسران و عہدہ داران تھے جو یہاں کے انتظامات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بالخصوص محمد بن تغلق کے تبدیلی دارالسلطنت کے فیصلہ کے نتیجہ میں دہلی والوں کی ساری آبادی کا دکن منتقل ہو جانا سب سے اہم سبب بنا اس کے بعد محمد بن تغلق نے دوبارہ دہلی ہی کو پایہ تخت بنانے کا اعلان کیا اور آبادی کو دہلی واپس ہونے کی ترغیب دی مگر لوگوں کی بڑی تعداد نے دوبارہ طویل سفر کی صعوبتوں کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور دولت آباد یا دکن کے دیگر حصوں ہی میں رہ بس جانے کو ترجیح دی محمد بن تغلق کے پہلے فیصلے کے نتیجہ میں دہلی اور نواح دہلی کی بولیاں دکن میں پہنچی تھیں ان میں وہ "مخلوط زبان" جو اب تک کوئی نام نہ پا سکی تھی یہاں پہونچ کر دکنی کے نام سے موسوم ہو گئی۔ اور آبادی کے ایک بڑے حصے میں آزادانہ طور پر نشو و نما پانے لگی علاوہ ازیں یہاں اس کو ایک کھلا اور سازگار ماحول بھی مل گیا جو دہلی میں مفقود تھا یہاں اس کی کوئی حریف زبان موجود نہ تھی جب کہ دہلی میں جو مختلف بولیوں کا سنگم ہے کئی زبانوں کے درمیان اس کو پھلنا پھولنا بڑا دشوار تھا مابعد واقعات کے سیاسی پہلوؤں نے بھی اس کو یہاں قدم جمانے میں بھرپور تعاون دیا۔

دہلی کے دوبارہ پایہ تخت بن جانے کے بعد بادشاہ اور امراء کی بڑی تعداد واپس ہو گئی جس کے نتیجہ میں یہاں وقتاً فوقتاً بغاوت کے حالات پیدا ہوتے رہے سلطان نے ان کے دائمی تدارک کے لئے کئی ترک افسروں کو مستقلاً دکن میں متعین کر دیا جس کے نتیجہ میں کئی خاندان یہاں آکر بس گئے ان حالات کے سبب شمالی ہند کے باشندگان کی ایک خاصی تعداد یہاں جمع ہو گئی جو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی یا زبان دہلوی یا کھڑی بولی گھریلو امور یا سودا سلف کے لئے یا عام رابطہ کے لئے بولتے تھے۔ دکن میں سوائے مرہٹی کے ساری زبانیں نہایت مشکل لب و لہجہ کی دراوڑی زبانیں رائج تھیں جو ان لوگوں سے بہ آسانی سیکھی نہیں جاتی تھیں لامحالہ انھیں اپنے ساتھ لائی ہوئی ملواں یا مخلوط ہندوستانی ہی سے کام چلانا پڑتا تھا جسے آج[1] اردو کے نام سے جانا جاتا ہے البتہ سرکاری اغراض اور ادبی امور کے لئے زیادہ تر فارسی کا ہی چلن تھا۔ دکن کے مقامی باشندوں کے لئے فارسی عربی کی بہ نسبت یہی رابطہ کا بہترین ذریعہ تھی چنانچہ چند مقامی ردوبدل کے ساتھ تلنگی، کنڑی، ملیالم اور تامل بولنے والے بھی اس کو بولنے لگے جس کے نتیجہ میں یہ بہت جلد مقبول ہو گئی۔ اور آج سارے دکن میں غیر اردو داں لوگوں کے لئے

---

[1] بحوالہ ادعا دب پر ہندی ادب کا اثر ڈاکٹر پرکاش مولش

بھی یہ زبان ایک حد تک قابل فہم ہے۔ دکنی کے الفاظ کو ان لوگوں نے اپنی زبانوں میں شامل بھی کیا ہے جس کی اکثر مثالیں تمام جنوبی ہند کی دراوڑی بولیوں میں ملتی ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد (آبِ حیات) پروفیسر حافظ شیرانی (پنجاب میں اُردو) ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو) ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو زبان کا ارتقاء) اور دیگر علماء و ماہرین کی اردو کے نشو و نما اور ارتقاء کے متعلق جو بھی رائے یا خیالات ہیں وہ اپنی جگہ ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اُردو کی حقیقی نشو و نما کا سہرا دکن دلیں کے سر ہے یہ ضرور ہے کہ اُردو کا مولد تو شمال ہے مگر اس کی پرورش نگہداشت اور اس کے پروان چڑھانے میں صرف دکن دیس کا حصہ ہے وہ زبان جسے بازاروں میں عوام کے سوائے کوئی منہ نہ لگاتا تھا جو صرف بول چال کی کام چلاؤ زبان کی حیثیت سے دلی کے کوچہ و بازار میں بے سہارا بے چاری بے حال اور زبوں و خوار تھی دکن میں نہ صرف ہاتھوں ہاتھ لی گئی بل کہ اپنے تاجداروں نے منہ لگا کر سرفراز کیا عزت بخشی اور باقاعدہ رتبہ عطا کیا سائل قلم فن کاروں، شاعروں ادیبوں نے سینہ سے لگایا علماء و صوفیاء نے اسے روحانی جذب و علمی کمال عطا کیا۔ اس ناتراشیدہ پتھر کو اہلِ دکن نے تراش کر جواب کوہ نور بنا دیا۔ ظفر ادیب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "شمالی ہند میں اسے (یعنی اردو) صرف بول چال کا اہل ہی سمجھا جاتا تھا اور اس قابل قرار نہیں دیا جاتا تھا کہ شعر و ادب کی زبان بن سکے[1] اُردو کی صحیح پہچان اور اس کی اہمیت کا اندازہ شمالی ہند والوں کو اٹھارویں صدی یعنی سنہ بھگ (۵۰۰) سال بعد ہوا جب کہ دکن میں اس کی عزت و حرمت کی تاریخ تیرھویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مشہور بزرگ عالم و محقق پروفیسر احتشام حسین صاحب کا یہ خیال حقیقت کا کھلا اظہار ہے۔ "اٹھارویں صدی کے شروع میں جب دہلی کے لوگ دلی کے دیوان سے روشناس ہوئے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ یعنی بولتے تو ہیں اردو جو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے اور شعر کہتے ہیں فارسی میں! چناں چہ اسی زمانے سے دہلی میں اردو شاعری کا دور شروع ہو گیا[2]" ان دو آراء کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں کہ اُردو کی حقیقی

---

[1] اردو زبان کا قومی کردار صـ ۱۲۷

[2] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ صـ ۶۱

نشو ونما بجائے شمال کے دکن میں ہی ہوئی اُردو کے قدیم ناموں میں دکنی ایک معتبر اور اہم علامت ہے۔

گجرات میں اُردو

گجرات کو ۱۲۹۷ء میں علاؤالدین خلجی نے فتح کیا جس طرح فتح دکن کے بعد قدیم اردو کا دکن میں داخلہ ہوا اسی طرح گجرات میں بھی اُردو پہونچی۔ سلاطین دہلی کے عہد میں تمام گجرات میں شمال سے آئی ہوئی یہ زبان پھیل گئی۔ چوں کہ گجراتی کا نسلی تعلق ہند آریائی سے ہے اس وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ آئی ہوئی مخلوط زبان اردو (ہندوستانی) بہت جلد گجراتی سے گھل مل گئی ایک دوسرے نے آپس میں اپنے اپنے گہرے اثرات قبول کئے۔ دکنی کا معاملہ دوسرا تھا چوں کہ دکن کے علاقے میں دراوڑی بولیاں رائج تھیں اس وجہ سے دکنی کے نشو ونما کا ماحول گجراتی اردو سے الگ انداز کا تھا۔ دکنی ہو یا گجراتی اردو دراصل وہ ہندوستانی ہی ہیں جو مسلم فاتحین اور سیاسی حالات کے زیر اثر دکن اور گجرات کے علاقوں میں پھیلیں تھیں۔ ہندوستانی جب گجرات میں پہنچی تو گجراتی اردو دکن میں پہنچی تو دکنی سے موسوم ہوئی۔ شیخ محمد خوب، شیخ حبیب اللہ قریشی اور محمد امین وغیرہ گجراتی مصنفین نے اس کو گجراتی، گوجری سے یاد کیا ہے۔ جب عہد تغلق میں گجرات دہلی کی باجگذاری سے آزاد ہوگیا تو وہاں ایک آزاد خودمختار حکومت قائم ہوئی جس کی سرپرستی میں گجراتی اردو نے بھی خوب ترقی کی ڈاکٹر زور نے اس ضمن میں کئی اسباب بتائے ہیں (۱) فارسی کا اثر دوآبہ کے مقابل گجرات میں کم پھیلا۔ (۲) گجراتی ادیبوں کے لئے فارسی کے بعد ہندوستانی ہی ایسی زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک تھی اس وجہ سے انھیں اس میں ہی اظہار خیال کرنا پڑتا (۳) گجرات کی ہندوستانی کو بہت جلد ادبی وقار مل گیا۔ گجراتی شمال ہند کی زبان سے جس طرح جداگانہ شناخت رکھتی ہے اسی طرح دکنی کے ساتھ بھی اس کی سوائے سرچشمہ کے اور کوئی مناسبت نہیں ان میں آپسی اختلاف واضح ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب فرماتے ہیں۔ "جس وقت ابتدائی اردو شمالی ہند میں صرف بول چال کی زبان تھی دکن میں اس میں اچھا خاصا ذخیرہ اکٹھا ہوگیا تھا یہی اثاث گجرات میں بھی کام

کرتے ہے تھے[1] اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دکن کی طرح گجرات کا اردو کی نشو ونما' ترقی اور تکمیل میں بھی بڑا حصہ ہے۔ گجرات میں اردو تالیف و تصنیف کا سلسلہ کافی قدیم ہے۔ شیخ محمد خوب چشتی کی خوب ترنگ جو مولانا روم کی مثنوی شریف کی طرز پر ہے' شیخ بہاء الدین باجن رح کا کلام جو زیادہ تر تصوف کے موضوعات سمیٹے ہوئے ہے اور سید شاہ علی جیو گام دھنی کا کلام "جواہر اسرار اللہ" اس ضمن میں عمدہ مثالیں ہیں۔ گجرات کے ان صوفی بزرگوں نے قدیم اردو کو اپنے فنی و تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنا کر گجرات میں اردو کی تاریخ کو ایک اعتبار کیا ہے البتہ گجرات میں اردو کی تاریخ اور اس کا ارتقاء ایک محدود عرصہ تک رہا۔ کیوں کہ ۱۵۷۲ء میں یہ سلطنت ختم ہو گئی اور بزمانہ شہنشاہ اکبر یہ سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا۔ اس کے نتیجہ میں گجرات کے اہل علم و فن وہاں سے کوچ کر کے جانب دکن روانہ ہو گئے جہاں ان کی خوب آو بھگت ہوئی گجرات کے انضمام کے بعد دکنی کی ترقی اور عروج کی رفتار تیز ہو گئی۔ کیوں کہ گجرات کا علمی و ادبی شیرازہ بکھر سا گیا تھا۔ سلطنت بیجاپور کے والیٔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں جب کہ گجرات کے اہل علم و دانش انتشار کا شکار تھے انھیں بیجاپور آنے کی دعوت دی گئی۔ جہاں شاہ وقت نے ان کی قدر افزائی اور دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کے زیر اثر گجرات کی ادبی عظمت کے پرچم بیجاپور پر لہرانے لگے[2]۔

گجرات کے نامور اردو مصنفین میں خوب محمد' باجن' محمود دریائی اور جیو گام کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے گجرات میں اردو کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنے تحقیقی مقالہ "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" میں ان کے علمی و ادبی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے علاوہ ازیں ڈاکٹر زور مرحوم نے خوب ترنگ کا لسانیاتی تجزیہ کیا تھا جسے پیرس کے ایک جریدہ نے قسط وار شائع کیا ہے۔ گجراتی اور ہندوستانی کے میل جول سے جو زبان گوجری کے نام سے موسوم ہوئی وہ دراصل اردو کی وہ شکل ہے جو گجرات میں مسلمانوں کی آمد کے بعد رائج ہوئی اس میں علم و ادب کا ایک قابل قدر خزانہ ملتا ہے۔ گجرات کی دہلی سے علیحدگی کے بعد وہاں کے حکمرانوں نے اسے خوب رونق بخشی ہر اعتبار سے گجرات کو قابل رشک بنایا۔

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۵۹ [2] ہندوستانی لسانیات

اہلِ علم وفضل کے ساتھ ساتھ صوفیا و اولیاء کا یہاں اچھا خاصا مجمع ہوگیا تعلیمی ترقی مدرسوں کے قیام کے ذریعہ عمل میں آئی ۔ صوفیا کرام نے رشد و ہدایت کے لئے قدیم اردو کو اپنایا اس طرح گجرات میں اردو کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا [1]

دکن میں اُردو کی ترقی کے عوامل

محمد بن تغلق کی دہلی کو مراجعت کے بعد دکن کے مفتوحہ علاقوں میں وقتاً فوقتاً بغاوتیں رونما ہوتی رہیں ۔ جسے سلطنت دہلی کی جانب سے فرو کیا جاتا رہا مگر خود سلطان کی جانب سے مقرر کردہ عہدہ داران و افسران لشکر جنھیں ذمہ داریوں کے اعتبار سے امیرانِ صدہ کہا جاتا تھا ان سبھوں نے سلطان کی آخری عمر میں اس کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کر کے دہلی کی اطاعت کا جوا گلے سے اتار پھینکا ۔ محمد تغلق نے اس متحدہ و مشترکہ بغاوت کو کچلنے کے لئے بہت زور لگایا مگر آخر کار شکست فاش اٹھائی ۔ ادھر اہلِ دکن اور ترک نژاد امراء نے مل کر مشہور سپہ سالار ظفر خاں المعروف حسن خاں کو علاء الدین حسن بہمنی شاہ کے خطاب کے ساتھ تخت دکن پر بٹھا دیا ۔ دکن میں آزاد و خودمختار حکومت کی تاریخ کا آغاز علاء الدین حسن نے کیا ورنہ قبل ازیں دکن کا علاقہ یا تو دہلی کا باجگذار صوبہ ہوتا یا پھر چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستوں پر مشتمل منتشر اور غیر مستحکم حصہ ہوتا ۔ بہمنی سلطنت کے آغاز سے دکن میں وحدت اور استحکام کا سامان ممکن ہو سکا ۔ علاء الدین حسن کی طاقت اور دبدبہ کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خود سلاطین دہلی بھی صدیوں تک دکنی سلطنت کے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہ اٹھا سکے یہ سلطنت اس نے اپنی طاقت، حکمت عملی اور تدبیر سے قائم کی تھی اور اسے پائیداری عطا کی تھی ۔ بہمنیوں کی لسانی پالیسی پر سیاسی مزاج کا شدید غلبہ دکن میں اُردو کی ترقی کا سب سے اہم اور بنیادی سبب ہے ۔ چوں کہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں فارسی درباری زبان تھی اور امراء و روسائے عمایدین، علماء اور اعلیٰ طبقہ فارسی زبان ہی کو اہمیت دیتا تھا ۔ اس وجہ سے دکن کے دربار میں دکنی زبان کو بڑھاوا دیا جانے لگا جو ایک طرح سے دہلی سے لاتعلقی اور سیاسی علیحدگی کے جذبہ کا آئینہ دار تھا ۔ دکن کا ابتدائی دارالسلطنت

---

[1] اردو زبان کا قومی کردار صـ۱۸۱

دولت آباد تھا بعد میں گلبرگہ کو پایہ تخت بنایا گیا۔ یہاں بھی عوام و خواص کی دلچسپی اُردو سے برقرار رہی۔

لگ بھگ دو سو سال تک بہمنی سلطنت قائم رہی اس دوران گلبرگہ سے پایہ تخت بیدر منتقل ہو گیا مگر دکن کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی میں روز بروز ترقی جاری رہی اُردو زبان بھی برابر روبہ ترقی رہی جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ بہمنی خاندان کے لگ بھگ تمام بادشاہوں کے دور میں شاہی دفتروں کی زبان ہندی تھی [1] اور ہندی وہی زبان ہے جو محمد تغلق کے ساتھ دکن آئی تھی جسے بعد میں اُردو کا نام دیا گیا لیکن دکن میں وہ دکنی کے نام سے موسوم ہوئی۔

بہمنی سلطنت میں جب افراتفری اور انتشار پیدا ہونے لگا تو دکن کے مختلف صوبے خود مختار ہو گئے اور اپنی اپنی جگہ آزادانہ طور پر عالم وجود میں آئے وہ تعداد میں پانچ تھے۔ بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر، احمد نگر اور برار جہاں بالترتیب عادل شاہیہ، قطب شاہیہ، برید شاہیہ، نظام شاہیہ اور عماد شاہیہ حکمران تھے۔ ان میں اول الذکر دو شاہی خاندانوں کو اُردو کی ترویج و ترقی سے خصوصی دلچسپی تھی چنانچہ ان کی سرپرستی میں اُردو زبان نے، جو یہاں دکنی کہلاتی ہے اور قدیم عہد میں دکن میں ہندی کے نام سے پہچانی جاتی تھی، خوب ترقی کی لسانی اعتبار سے دکن میں اردو کو آزادانہ ماحول میں نشو و نما اور ترقی پانے کا موقع میسر آیا یہاں اس کے مقابل کوئی حریف زبان نہ تھی جب کہ دہلی اور شمالی ہند میں اس کا برج، راجستھانی پنجابی وغیرہ سے ہر وقت مقابلہ تھا شمالی ہند اور دکن میں اُردو کا ارتقاء الگ الگ ڈھنگ سے ہوتا رہا یہاں پر اُردو اپنی خالص شکل و صورت میں ارتقائی منزلیں طے کر رہی تھی جو کہ دکن میں آمد کے وقت تھی اس پر ہریانی، میواتی، برج اور پنجابی کا اس قدر ہی اثر رہا جتنا یہاں آنے وقت جب کہ شمال ہند میں دوسری صورت حال تھی۔

ڈاکٹر زور مغربی مصنفین کی طرح اُردو کے قدیم کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کی نشو و نما اور ارتقاء کے ضمن میں سہ مرکزی تقسیم کے قائل ہیں۔ وہ پنجاب سے لے کر دہلی تک سفر کے ساتھ ساتھ دہلی میں سو ڈیڑھ سو سالہ دور ارتقاء کے پیش نظر شمالی ہند

---

[1] تاریخ فرشتہ، جلد اول

کو اس کا پہلا مرکز اور دہلی سے جب یہ گجرات پہنچی تو اس کو دوسرا اور جب دکن میں پہنچی اور ترقی کرنے لگی تو دکن کو اردو کے ارتقاء کا تیسرا اور اہم مرکز قرار دیتے ہیں۔ ہندوستانی کے اس طرح مختلف مقامات پر پہنچنے اور بتدریج ترقی پانے کی بنا پر ایک دوسرے سے بعض واضح اختلافات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب صرف وہ عدم ربط ہے جو سیاسی اسباب کی بنا پر شمالی ہند اور دکن دنیز شمالی ہند اور گجرات کے درمیان رہا اگر ربط رہا بھی تو ایسا کہ اسے زیادہ اہمیت نہ دی جا سکے۔ بہرحال ہندوستانی (اردو) کے ارتقاء کے ضمن میں یہ ایک اہم خیال ہے۔

اردو کے نشوونما میں دکن کا بڑا قدر حصہ ہے۔ دکن کے بہمنی سلاطین اور سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد قائم شدہ سلطنتوں میں، بالعموم سب ہی نے اور بالخصوص عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ کی اردو خدمات تاریخ کا زریں باب ہیں۔ ان خاندانوں کے لگ بھگ تمام حکمران اور شاہی ازاد سب شعر و ادب کے دلدادہ اور اردو کو دل سے چاہنے والے تھے چناں چہ ان میں اکثریت نے اردو ہی کو اپنے فنی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جب کہ شمال والوں پر چاہے وہ بادشاہ ہو یا عام آدمی، امراء، روسا، علماء اور فاضلین سب نے اردو کے مقابلہ میں فارسی کو زیادہ ترجیح اور اہمیت دی ـــــ جس کی وجہ سے اردو زبان کی ادبی ترقی نہ ہو سکی! البتہ بول چال میں دیگر زبانوں کے تعاون سے عوام کے ہاں محاورں خوب نکھرنے لگی [1]

---

[1] دیکھئے ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر زور

دکنی اردو سے الگ زبان ہے

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ استاد شعبہ لسانیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی کتاب اُردو کی لسانی تشکیل میں "اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے" کے زیر عنوان ایک تنقیدی جائزہ میں بنگلور کی ڈاکٹر آمنہ خاتون کی کتاب "دکنی کی ابتداو" کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی کتاب کے بعض اہم اقتباسات نقل کئے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے خالی از دلچسپی نہیں۔" ڈاکٹر آمنہ خاتون کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے۔

"تاریخ شاہد ہے کہ بندرگاہ تھانہ پر قبضے ۱۳۶۳ء کے زمانے سے دولت آباد کے پایہ تخت قرار پانے (۱۳۲۷ء) کے زمانے تک مہاراشٹر کے مسلمانوں کی زبان پہلے بلاشبہہ شورسینی اپ بھرنش اور بلاشبہہ اس کی مقامی پیداوار مراٹھی تھی اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ شورسینی اپ بھرنش اور مرہٹی میں عربی اور فارسی کی سات سو سال کے عرصے میں بتدریج آمیزش اور پڑوس کی جدید آریائی زبانوں سے لین دین اور راہ رسم کی وجہ سے مرہٹی کے دوش بدوش دکنی کی نشو و نما ہوئی۔" اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں سنیتی کمار چیٹرجی محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر مسعود حسین خاں اور دیگر عالموں کے تحقیقی نظریات کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے وہ دکنی کی ابتدا میں ایک جگہ یہ عبارت لکھتی ہیں۔" یہ فرض کرنا کہ دکن میں پورے پونے سات سو سال کے عرصے میں مرہٹی میں عربی اور فارسی کے شمول سے راجستھانی گجراتی اور برج بھاشا کا ماحول کے اثر سے دکنی وجود میں نہیں آئی ہے، کہ دفعتہً (۱۳۲۷ء) میں دلی کی آبادی کے دولت آباد منتقل ہو جانے سے موجود ہو گئی، کسی زبان کے وجود میں آنے اور اس کے نشو و نما پانے کے کل مسلمہ لسانیاتی اصولوں کے سراسر خلاف ہے اور اس حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ دولت آباد گلبرگہ اور بیدر جو سلطنت دہلی کے مرکز حکومت تھے مرہٹواڑہ میں واقع تھے اور یہاں کے باشندوں کی زبان مرہٹی تھی۔"

ڈاکٹر آمنہ خاتون کی کتاب کے اقتباسات پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر بیگ نے ان پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے اس خیال کو محض قیاس آرائی پر محمول کیا ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں اُردو کے دکن میں پیدا ہونے کا نظریہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا و نیز انہوں نے ڈاکٹر آمنہ خاتون کے اس خیال کی پُر زور تردید کی ہے۔" دکنی اردو سے ایک علیحدہ زبان ہے" ڈاکٹر آمنہ خاتون کے خیال میں دکنی نہ تو دہلی میں بولی جانے والی زبان سے ماخوذ ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری جگہ

سے چل کر دکن پہنچی ہے بلکہ اس کی ابتدا سرزمین دکن سے ہوئی ہے اور وہیں نشو و نما پا کر پروان چڑھی ہے ان کے خیال میں ساتویں صدی عیسوی ہی میں مرہٹی زبان میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے دکنی کی داغ بیل پڑ ناشروع ہوگئی تھی [۱]

---

[۱] بحوالہ اردو کی لسانی تشکیل، صفحہ ۲۳ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء

باب چہارم

دکنی اور دیگر زبانیں

گیارھویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی کے ختم تک اردو زبان اپنے ابتدائی پھیلاؤ کے لحاظ سے ہندوستان کے شمال سے لے کر جنوب تک مختلف علاقوں میں بولی جانے لگی تھی اگرچہ کہ اس مخلوط زبان کا نام ابھی تک اردو نہ پڑا تھا مگر ہندی، ہندوی ہندوستانی اور ترک ماٹا کے ناموں سے یہ پنجاب، دہلی، دوآبہ گنگ و جمن گجرات اور دکن کے بیشتر حصوں میں رائج ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے اس قدر کم عرصہ میں اس ملواں زبان کا اس قدر پھیل جانا کئی طرح کے لسانی اور صوتی تغیرات کے ظہور پذیر ہونے کا سبب بننا غیر فطری نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مختلف علاقوں میں لب لہجہ، اصوات، روزمرہ اور محاوروں میں زمین آسمان کا فرق نمایاں ہونے لگا۔ اسی عالم میں ہندوستانی (اُردو) ملک کے مختلف علاقوں میں اپنے جدا جدا ڈھنگ سے ارتقا پانے لگی۔ یہاں صوتیاتی اور لسانی اعتبار سے ان کے آپسی فرق کا مطالعہ بے سود نہ ہوگا۔

دکنی اور پنجابی

پروفیسر حافظ محمود شیرانی اور دیگر ماہرین السنہ نے اُردو کی پنجاب سے ابتداء کا ادعا پیش کیا ہے جس کا متاخر محققین نے مدلل انداز سے رد بھی کر دیا ہے تاہم شیرانی مرحوم کے اس خیال میں کچھ وزن کئی حقائق کی بناء پر موجود ہے۔ پروفیسر جیونز بلاک — بلیئن اسکول

ورنٹیل اسٹڈیز کی جلد ۵ کے صفحات ۲۹ ۷ و ۳۰ ۷ میں یوں گویا ہیں "اس میں شک نہیں کہ پنجاب پہلا صوبہ ہے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا اور ۶ صدیوں تک رہا۔ اسی لئے پنجابی اور اردو کی مماثلت یاد رکھئے۔" وہ آگے لکھتے ہیں "میرے خیال میں مشرقی پنجاب کے اضلاع کی زبان لشکریوں کے ذریعہ دکن پہنچی ہے جس نے مردسایام سے شستہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی ہے [1] قبل ازیں پنجابی اور اردو کے درمیان موافقت و مخالفت کے رجحانات کا ہم نے مفصل جائزہ محمود شیرانی مرحوم اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی گراں قدر تحقیقات کی روشنی میں لیا ہے یہاں ہم دکنی اور پنجابی کے بنیادی فرق کو پیش کریں گے۔

(۱) اردو میں (ہ) کا تلفظ واضح ہوتا ہے یہی رجحان دکنی میں پایا جاتا ہے جب کہ پنجابی میں (ہ) ہمیشہ لفظ کے شروع میں آتی ہے اور اگر درمیان میں آئے تو اس کی آواز "ع" ہمزہ سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً گھوڑا۔ کوڑا ے سمجھ سمج، کچھ = کچ، لاہور = لاؤر بعض دفعہ اردو (دکنی) کے برخلاف لہجہ کے زور کے لئے لفظ کے آخر میں یا درمیان (ہ) کا اضافہ بھی کردیا جاتا ہے جیسے کرو۔ کرہو۔ جان، جانہہ۔ راتیں = رہاتیں ایسی کچھ صورتیں ہریانی اور کھڑی میں بھی ملتی ہیں۔ بھیک = بیکھ، پائی = پاہی، چڑائی = چڑھائی باج = باجھ [2]

(۲) اردو کے ڈھ جھ گھ بھ اور دھ کا تلفظ پنجابی میں الگ ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ اردو میں (ڑھ) کی آواز اضافہ ہے جو پنجابی میں نہیں۔ جدید دکنی میں یہ آواز اسی طرح ہے لیکن قدیم دکنی میں اس کا تلفظ ڈ کیا جاتا تھا اکثر اس کی قدیم شکل ڈ یا ڈھ کو ہی برقرار لکھا جاتا تھا مثلاً بڈا، بڈائی، چڈاوغیرہ

(۳) دکنی اور پنجابی میں بیشتر ضمائر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

واحد غائب حالت فاعلی = پنجابی (اوہہ) دکنی میں بالعموم = (یو)

حالت اضافی = دکنی میں (کا۔ کی۔ کے) پنجابی میں (دا۔ دی۔ دے)

حالت مفعولی = پنجابی میں حالت مفعولی "نوں" کے اضافہ سے بنائی جاتی ہے۔ دکنی میں یہ صورت نہیں۔

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۲۲۹ [2] دیکھئے مقدمہ تاریخ زبان اردو

فاعلی جمع متکلم : دکنی = ہمیں پنجابی = اسی مفعولی جمع متکلم = دکنی = ہمنا ' تمنا کون
اضافی جمع متکلم : دکنی = ہمارا ' ہمن پنجابی = ساڈا ' ساڈا
فاعلی جمع حاضر : دکنی = تم پنجابی تسیں اضافی جمع حاضر : دکنی = تمارا تمن پنجابی
توہاڈا ' تاڈا
فاعلی جمع غائب : دکنی = یو پنجابی = ایہہ ۔ اضافی اور مفعولی حالت غائب میں
پنجابی = اوہ دکنی = وو
ضمائر اشارہ : دکنی = اِتا اُتا پنجابی اِنّا اُنّا (اتنا اور اُتنا)
(۴) دکنی اور پنجابی میں اعداد کے لحاظ سے بھی اختلافات ہیں ۔
پانچ : پنجابی میں پنج ہے ' دکنی میں نہیں ۔ تین : پنجابی میں تن اور ترائی ۔ دکنی
میں ترائی نہیں ۔
دکنی : بیس ۔ انیس ۔ اکیس ۔ تیس ۔ اکتیس ۔ بتیس ۔ چالیس ۔ بارہ ۔
تیرہ ۔ سولا ۔ سترہ ۔ پچاس ۔ اکاون ۔
پنجابی : ویہ ۔ اُنتی اِکی تیہہ اکتی بتیہہ چالی ۔ بارہاں تیراں ۔ سوال
ستراں ۔ پنجاہ ۔ اکونجا
(۵) افعال میں دکنی اور پنجابی میں بعض مماثلتیں اور بعض بنیادی اختلافات ہیں
ا ۔ حالیہ ناتمام مادہ میں دکنی میں (تا) اور پنجابی میں (دا) آتا ہے
مادہ : مر ' نکل ' پی ' جی ' کہہ ۔ دکنی : مرتا ' نکلتا ' پیتا ' جیتا ' کہتا ' پنجابی مردا '
نکلدا ' پیندا ' جیوندا ' کہندا
(ب) مستقبل کے لئے گائی گے دکنی اور پنجابی میں مشترک ہیں پنجابی میں (وا) کا
استعمال بھی ہے ۔
(ج) افعال امدادی میں تلفظ اور صورد دونوں کے لحاظ سے اختلاف ملتے ہیں ۔
دکنی : میں ہوں ' توں ہے وہ ہے ' ہم ہیں ' تم ہو ' وہ ہیں ۔ پنجابی : میں آں ' توایں '
اوہ اے ' اسااں ' تسیں او ' اوہ ان
متکلم واحد کے صیغہ میں آں یا ہاں کی شکل نہیں ۔ البتہ ماضی میں بنیادی اختلاف ابتدا

ہیں۔ دکنی تھا یا اتھا پنجابی میں مختلف شکلیں دکنی میں تھا (اتھا)، توں تھا، وہ تھا، ہم تھے (اتھے)، تم تھے وہ تھے۔ پنجابی : میں سال، توسائیں، اوہ سی، اسی سال، تسی ساوں، اوہن

(د) افعال مرکب میں پنجابی : بیہنا (بیٹھنا) رہنا مٹنا اور چکنا دکنی: اول الذکر تینوں کا استعمال اس طرح نہیں البتہ چکنا فصیح دیا محاورہ ہے علاوہ ازیں دکنی : کیا دیا سویا۔ پنجابی ۔ کتیا، دتا، ستا (یہ ہندا کے اثر سے ہے) اردو میں ایسی بہت کم مثالیں ہیں جواب متروک ہیں۔

(ہ) پنجابی کے بعض عام حروف دکنی میں نہیں جیسے نوں (کو) دچ (بیچ، میں) نالی (طرح) توڑی (لگ) وغیرہ [1]

(و) عام اسماء و افعال جو پنجابی میں ہیں دکنی میں نہیں ملتے۔ پیو (باپ) بھرا (بھائی) پت پتر (بیٹا) کڑی (بیٹی لڑکی) وغیرہ

پنجابی میں "و" والی آواز دکنی میں "ب" سے بدلتی ہے والی (بال) وچار (وچار) وات (بات) ویچنا (بیچنا) وغیرہ [2]

مندرجہ بالا اختلاف و اتفاق کے باوصف یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ دکنی زبان پر پنجابی کا غالب اثر نمایاں ہے ان میں آپسی مماثلت کو سب سے پہلے پروفیسر شیرانی مرحوم نے پیش کیا ان کی اس کاوش کو ہر علم دوست سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دکنی اور پنجابی کی مماثلت گذشتہ ابواب میں اردو اور پنجابی کے زیر عنوان گزر چکی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کے تقابلی جائزہ کو یہاں دونوں میں بنیادی اختلافات کے زیر عنوان اکٹھا کیا گیا ہے۔

دکنی اور ہریانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا خیال ہے کہ اردو پہ یا نگڑو یا ہریانی کا بھی قابل لحاظ اثر

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے مقدمہ تاریخ زبان اردو

ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف میں اس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے۔ "ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی تحقیقات اس سلسلہ میں بے حد قیمتی ہیں دکنی اور ہریانی کی مماثلتوں کو انہوں نے ٹھوس لسانی بنیادوں پر ثابت کیا ہے۔ جس کی تھوڑی بہت تفصیل ہریانی اور قدیم اردو کے زیر عنوان گذر چکی ہیں یہاں اجمالاً ان کا تذکرہ ہوگا تاکہ بہ آسانی نفس مضمون سمجھ میں آسکے۔

(۱) ہریانی اور دکنی میں صوتی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ڑ کی جگہ ڈ کا استعمال دونوں میں ملتا ہے جیسے پڑھے کو پڈھے کہنا [۱] حرف کی حرکت سے متاثر ہو کر حرف علت کے اضافہ کا دونوں میں رجحان جیسے برائی = بورائی وغیرہ [۲] غنہ کا کثرتِ استعمال سے کے بجائے سیں،

کوکے بجائے کوں وغیرہ [۳]

اردو کی معیاری فعلیہ شکل کھا کر، آ کر، جا کر کے بجائے کھاکے، آکے، جاکے وغیرہ کا استعمال۔ افعال امدادی میں (ہریانی) اسوں، سیٹیں اور ہوں (دکنی) سوں کو چھوڑ کر دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ فعل احتمالیہ ہریانی میں اپنے اصل مفہوم یعنی حال کے معنوں میں مستعمل ہے اس کی دکنی سے قریبی مماثلت ہے۔ مصادر کی ماضی مطلق کے لئے ہریانی میں (۱) اور دکنی میں (یا) لگایا جاتا ہے ہریانی: مارا، رہا، کہا، کھیلا، لگا اردو دکنی: ماریا، رہیا، کہیا، کھیلیا لگیا (علامت مصدر سے قبل "یا" وگانہ ہونا شرط ہے) [۴] دکنی ضمائر ہریانی سے زیادہ قریب ہیں۔ متکلم جمع وحاضر جمع کی مثالیں ہم، ہمیں، تم، تمہیں۔ ضمائر اشارہ یو، اس، جو، جس، کون، کسی وغیرہ ہریانی اور دکنی میں مشترک ہیں۔ ضمائر میں تعریف بھی یکساں طرز پر ہے ہم سے ہموں ہمیں، اُن سے انہاں، انہوں تمام حروف جو قدیم تالیفات میں ملتے ہیں مشترک ہیں جیسے ماہنہ میں سوں، ناہنہ اگوہ پچھوں، کو، بہت، مال، ماہیں، بیچ، بیچ، سیں کوں، پر، توں، تے تھے اور سیتی وغیرہ۔ "نے" کا استعمال دکنی اور ہریانی میں علامت فاعلی ومفعول دونوں طرح سے مستعمل ہے۔ البتہ جدید اردو میں چوں کہ "کو" علامت مفعول ملتی ہے اس لئے "نے" فاعل کے ساتھ مخصوص ہے [۵]۔

---

[۱] تا [۵] مقدمہ سب رس بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے دکنی کو سامنے رکھ کر شمالی ہند کی معروف ہندی بولیاں (بالخصوص نواح دہلی کی بولیاں جن کی اساس پر ہندوستانی یا اردو کی تشکیل کا انہوں نے نظریہ پیش کیا ہے) جیسے پنجابی، ہریانی کھڑی اور میواتی اور برج وغیرہ کا تقابلی جائزہ لیا ہے اس ضمن میں ان کے سامنے مولوی عبدالحق بابائے اردو اور شمالی ہند کے معتبر محققین کی تالیفات رہیں جس کا انہوں نے اپنی کتاب میں حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے نقطہ نظر کی روشنی میں یہ بے حد اہم اور تحقیقی مواد فراہم کرتا ہے۔ اس سے بلاشبہ تفہیم میں نئی آسانیاں پیدا ہو سکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی جدید تحقیقات کے پیش نظر پروفیسر شیرانی اور ڈاکٹر زور مرحوم کے بعض بنیادی تصورات کا بطلان پیش کرتے ہیں جو بڑی حد تک معقول اور قابل قبول ہیں جن کے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔

دکنی اور شمالی

دکنی اور شمالی کا تقابلی جائزہ ڈاکٹر زور مرحوم کے اس نظریہ کا آئینہ دار ہے جو اردو کی قدیمی ہندوستانی شکل کو شمالی ہند کے ایسے تمام ہندی بولنے والوں کی مشترکہ دین سمجھتا ہے جو مخلوط زبان کی صورت میں شمال سے دکن میں آئی اور یہاں بولی جانے والی دراوڑی زبانوں کے اثرات کو لسانیات کے مختلف شعبوں میں قبول کرتی ہوئی ایک خاص سانچہ میں ڈھل گئی زور صاحب کا خیال ہے کہ اردو (ہندوستانی) کی پنجاب اور دہلی میں ہندی اور فارسی کے اشتراک سے جس حد تک صورت گری دکن پہونچنے تک ہو چکی تھی ہو چکی دکن میں آنے کے بعد اس پر نہ تو فارسی کا اتنا غلبہ رہا جتنا یہ زمانہ دہلی تھا اور نہ شمالی ہند کی بولیوں کا مزید اثر بڑھا بل کہ دکن میں آنے کے بعد اس کا سابقہ تلنگی، کنڑی اور بعض دفعہ ملیالم اور تامل سے پڑا تو اس نے ان زبانوں کے ماحول میں ان سے لسانی لین دین کرتے ہوئے خاص ڈھنگ سے ارتقائی منازل طے کیں۔ جب کہ شمالی ہند کی جدید مخلوط زبان (ہندوستانی) پر آئے دن فارسی کے اثرات بڑھتے گئے اور وہاں اس کی شکل وصورت روز بروز بدلتی گئی یہاں تک کہ دکنی سے اس کی دوریاں اتنی بڑھ گئیں کہ دونوں کی شناخت جداگانہ ڈھنگ سے کی جانے لگی۔ کیوں کہ دکن میں بیرونی عناصر کے داخلہ کے امکانات شمال کے مقابلہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ شمال پر آئے

دن فارسی داں بیرونی فاتحین کے حملے ہوتے رہے اور فارسی بولنے والوں کی آمد مختلف انداز سے برابر جاری رہی جس سے مروج زبانوں کا اثر قبول کرنا فطری بات تھی[1]۔

دکنی پر ایسا نہیں کہ شمالی زبان کے اثرات کا سلسلہ بالکلیہ ختم ہوگیا تھا بل کہ کسی نہ کسی طرح دکنی نے شمال بالخصوص دوآبہ کی زبان برج سے کچھ نہ کچھ اکتساب کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کیوں کہ عادل شاہی حکمرانوں کو خاص طور سے ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی اور ہندو تہذیب و ثقافت، روایات اور علوم سے گہری دلچسپی رہی اس کے دربار میں ایسے علماء فضلا، شعرا اور موسیقار جمع ہونے لگے جن کی زبان برج بھاشا تھی اور اس کا گہرا اثر تھا۔ خود ابراہیم نے برج سیکھی اور اسی زبان میں نورس لکھی۔ زبان دوآبہ گنگ و جمن یعنی برج بھاشا سے بادشاہ کی دلچسپی نے نہ صرف دکنی شعراء اور مصنفین کو متاثر کیا بلکہ رعایا بھی اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکی ڈاکٹر زور اس بات کو ماننے کے باوجود کہ دکنی پر برج کے خارجی اثرات مرتسم ہوئے دکنی اور ہندوستانی بولیوں کے بعض اصولی اختلافات کو اپنی کتاب ہندوستانی لسانیات میں نقل کرتے ہیں۔ "ہندوستانی صوتیات" میں ان اختلافات کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاہم یہاں بعض واضح اور امتیازی اختلافات کا سرسری جائزہ پیش ہے۔ زیر نظر جائزہ میں ہندوستانی کا مفہوم وہ تمام بولیاں ہیں جو اردو کی تشکیل میں حصہ دار ہیں " نواح دہلی" سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں تلفظ اور قواعد کے اعتبار سے مختصراً اختلافات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

"تلفظ" (۱) دکنی میں مقامی بولیوں کی آواز کے زیر اثر پیش (و) اور واو معروف (و) کی درمیانی آواز کا وجود ہے جو شمالی ہند میں نہیں ملتا۔ جیسے پٹّا (لڑکا) دُبّا (موٹا) بُڑا (تو ند) ڈبّا (ٹوپی) وغیرہ

(۲) کسی لفظ میں جب دو طویل حروف علت آجائیں تو دکنی میں حرف اول کا تلفظ چھوٹے کی طرح کیا جاتا ہے۔ جیسے شمالی: آدمی، آسمان، بھیگنا، سونگھنا دکنی: ادمی، اسمان، بھگنا، سنگھنا۔

---

[1] بحوالہ ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر زور مرحوم

حروف صحیح (۱) "ق" کا تلفظ دکنی میں "خ" ہوتا ہے جبکہ ہندوستانی شمالی میں صحیح طور پر نہیں ہوتا۔ پنجاب میں "ک" ہوتا ہے

(۲) ابتدائی دندانی اور درمیانی کوزی آواز کے الفاظ میں شمالی میں ابتدائی دندانی آواز کوزی بن گئی ہے۔ جب کہ دکنی میں اصلی تلفظ باقی رہا۔ دکنی (دندانی) تکڑا، ٹھڑنا، ڈیڑھ، ٹاٹ ٹھنڈ شمالی (کوزی) ٹکڑا، ٹھڑنا، ڈیڑھ، ٹاٹ، ٹھنڈ۔

(۳) دوہرے حروف صحیح والے لفظوں میں شمال میں ایک حروف صحیح کم ہوکر حرف علت بغرض وزن آتا ہے جیسے دکنی: چنّا، پھسکّا، منتھنی شمالی: چونا، پھیکا، ماکھی وغیرہ شمالی میں بعض ایک حرف صحیح سے بغیر حرف علت کے اضافہ کے ملفوظ ہوتے ہیں۔ دکنی: نمک، ڈلی، جوا، تلا شمالی: نمک ڈلی جوا اور تلا وغیرہ

(۴) نفسی حروف صحیح کے تلفظ میں بھی قابل امتیاز فرق ہے۔

(ا) درمیانی حرف "دھ" دکنی میں "د" سے بدلتا ہے۔
دکنی: سمدی، کدر، باندنا، سادو شمالی: سمدھی، کدھر، باندھنا، سادھو وغیرہ
"ب" اسی طرح ڈھ، ڑ سے بدلتا ہے دکنی: گڑا، چڑلاؤ شمالی: گڈھا، چڑھاؤ

(ج) غیر نفسی "ٹ" دکنی میں ٹھ سے بدلتی ہے دکنی: لٹھو، الٹا، پلٹنا شمالی: لٹو، الٹا، پلٹنا

(ہ) صرف ونحو کے اختلافات: دکنی کے سینکڑوں الفاظ اور محاورے شمال میں نہ مستعمل ہیں نہ قابل فہم۔ اسی طرح بعض شمالی کے الفاظ دکنی کے لئے نئے ہیں۔

(الف) ان میں وہ الفاظ جو مقامی بولیوں سے لئے گئے ہیں۔ مثلاً دکنی میں دراوڑی زبانوں سے شمالی میں مقامی بولیوں سے

(ب) غیر زبانوں کے الفاظ کی دکنی اور شمالی میں الگ الگ شکلیں اور ترکیبیں۔

(ج) وہ خاص مرکب اور مفرد الفاظ جنھیں محارہ یا ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

(۶) قواعد کے اختلاف: شہری ماحول کو چھوڑ کر دکن کے دیہاتوں اور شمال کی بولیوں میں بین فرق قواعد کے لحاظ سے پایا جاتا ہے ان میں بڑا فرق فعل کی جنس کا ہے۔

(۷) دکنی میں فعل فاعل کے لحاظ سے لایا جاتا ہے شمالی میں مفعول کے لحاظ سے[1]

(۸) اسما کی جمع بنانے کے اختلافات بھی نمایاں ہیں۔(ا) دکنی میں مذکر اسم کی جمع بنانے کے لئے الفی حرف علت "آں" واحد کے آگے بڑھاتے ہیں۔ شمال میں ایسا نہیں واحد و جمع دونوں کے لئے ایک ہی لفظ آتا ہے (ا) دکنی : کئی مرداں تھے، کتنے کاغذاں تھے، ڈھولاں اچھے ہیں۔ شمالی : کئی مرد تھے، کتنے کاغذ تھے، ڈھول اچھے ہیں۔

(ب) اسم جمع مونث کے لئے دکنی میں "آں" اور شمال میں "ایں" کا اضافہ ہوتا ہے۔

دکنی : دواتاں لاؤ، لاتاں مارتا ہے، کن کی کتایاں ہیں آنکھاں بند

شمالی : دوائیں لاؤ، لاتیں مارتا ہے، کن کی کتابیں ہیں آنکھیں بند کیں۔

(ج) دکنی میں حرف علت سے پہلے جمع اپنی شکلیں نہیں بدلتی۔ لیکن شمال میں حروف غیرہ کا بڑا اثر پڑتا ہے دکنی : آدمیاں کو مارا، کاغذاں کی ٹوکری، ڈھولاں سے آواز نکلی، پھولاں کے ہار

شمالی : آدمیوں کو مارا، کاغذوں کی ٹوکری، ڈھول سے آواز نکلی، پھولوں کے ہار

ڈاکٹر زور نے ان اختلافات کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جو بظاہر معمولی ہوتے ہیں مگر وہ اس قدر اہم ہیں کہ ان کی وجہ سے زبان کی شکل اور لب و لہجہ میں کافی فرق پیدا ہو جاتا ہے[2]۔

دکنی اور گجراتی اردو

دکنی اور گجراتی اگرچہ کہ ہندوستانی ہی کی مختلف شکلیں ہیں جو مسلمان فاتحین کے ذریعہ گجرات اور دکن پہنچیں تھیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے ہندوستانی شمالی ہند میں فارسی کے زیر اثر، گجری گجرات میں اور دکنی دکن کے مدراوڑی زبانوں کے جداگانہ انداز سے الگ الگ ارتقائی منزلیں طے کرتی رہیں۔ قدیم اردو یا ہندوستانی جب گجرات میں پہنچی تو وہاں کی مقامی زبان گجراتی جو

---

[1] ہندوستانی صوتیات میں مزید تفصیلات ملیں گی۔

[2] تفصیلات کے لئے دیکھئے ہندوستانی لسانیات

ہند آریائی کنبہ سے تعلق رکھتی ہے کے ساتھ گھل مل کر گجری کے روپ میں بہت جلد ادبی حیثیت پا گئی جب کہ دکن پہنچنے والی قدیم اردو کو ایک بدلا ہوا احول ملا جس کی وجہ سے صوتیاتی و قواعدی اعتبار سے دکنی بتدریج ہندوستانی سے اور گجری سے الگ ہونے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دکنی کا دھارا جدا ہو گیا۔ بنیادی لسانی خوبیوں سے قطع نظر ہندوستانی گجری اور دکنی کی الگ الگ شناخت بن گئی۔ یہاں عنوان کی مناسبت سے دکنی اور گجری کے چند صوتی امتیازات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

(۱) حروف جر کی کمی ہندوستانی اور گجری میں نمایاں ہے دکنی میں اس طرح کی بہت کم مثالیں ہیں جیسے گجری: لیلی منہ بات، ان بولوں شروع کیا، کس کام نہ ہووے، ہر بھائیں کہیا، اس آکھیں دکنی: لیلی کے منہ میں بات، ان الفاظ سے شروع کیا کسی سے کام نہ ہووے، ہر طرح سے کہا، اس کے آگے۔

(۲) دکنی میں حسب ذیل حروف نہیں ملتے جو گجری میں رائج تھے، مانہ، منجھ، ماہیں، نہیں وغیرہ۔

(۳) گجری میں سوں، تھیں، تھے کے علاوہ ایک شکل سوے بھی رائج تھی جو دکنی میں نہیں ملتی جیسے پہلوں سوے (یعنی پہلے سے) نہایت سوے (یعنی کثرت سے)

(۴) گجراتی اردو میں عام لفظوں اور خاص کر افعال کے آخری حروف علت الفی ہو جاتے ہیں مثلاً

گجراتی اردو: میرا کہناں، دیکھنا دیوے، چلنیں، بلنیں بانح، نیں، خوبیں

دکنی: میرا کہنا، دیکھنے دیوے، چھلتی، بلنے جلنے بانح، نے، خوبی

(۵) بعض الفاظ کا ارتقاء دکنی اور ہندوستانی میں ایک طرح ہوا اور گجری میں دوسری طرح پر

دکنی: کتا، کل، کھڈا، تھکنا، گھستا، پھر۔ گجری: کونا، کال، کاڈا، تھاکنا، گھاٹنا، پھیر

(۶) بعض الفاظ کا تلفظ گجری تحریروں میں عجیب و غریب مواد فراہم کرتا ہے۔ مثلاً سوے (سب) دوہوں (دونوں) بےدپا (بہردیپا) سود (آدھا) پلیت (پلید)

داون (دامن) چھان (چھانوں) کھوتا (کوتا) کلف (قاتل) الکی (الگ)[1]

دکنی اور میواتی

میواتی نواح دہلی کی بولیوں میں بے حد اہمیت رکھتی ہے جس کے اثرات قدیم اُردو اور اس کے توسط سے دکنی پر نہایت گہرائی کے ساتھ پڑے ہیں۔ میواتی بولی راجستھان کے شمال مغربی حصہ میں رائج ہے جس کے بازوں پر ایک طرف برج بھاشا اور دوسری طرف ہریانی کے علاقے ہیں میواتی کی قدیمی حیثیت کے بارے میں پروفیسر محمود شیرانی سمیت تمام محققین متفق ہیں چناں چہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے خصوصیت سے میواتی اور دکنی کے تقابلی مطالعہ کو اپنی تصنیف میں پیش کیا ہے جس کا مقاصد دکنی پر میواتی کے اثرات ظاہر کرنا ہے[2]

---

[1] دیکھیے ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر زور صفحہ ۱۰۰، ۱۰۹

[2] تفصیلات کے لئے دیکھیے مقدمہ تاریخ زبان اُردو صفحہ ۲۸

باب پنجم

اردو (جدید) کا تاریخی پس منظر

اُردو زبان کے آغاز' ابتدائی نشوونما' ارتقائی سفر کی تشفی بخش تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں پنجاب میں جس مخلوط زبان کا خمیر تیار ہوا تھا ہندوستان کے قلب میں سرزمین دہلی میں وہاں رائج بولیوں کی فضاء میں کھڑی بولی کی بنیاد اس کا کینڈا متعین ہوا اس لحاظ سے یہ نوزائیدہ زبان پوری طرح ہند آریائی اصل رکھتی ہے جو مغربی ہندی کی شاخ کھڑی بولی کی گودی میں برج بھاشا' ہریانوی' میواتی کے مزاج اور فارسی عربی کے زیر سایہ جنم لیتی ہے ابھی یہ ابتدائی منزلوں میں ہی تھی کہ مسلمان فاتحین کے ہمراہ گجرات اور دکن پہنچ جاتی ہے گجرات اور دکن میں مقامی بولیوں کے ساتھ اس کا میل جول اس کو نئے لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ سے ہمکنار کرتا ہے اس طرح یہ تین مختلف مقامات پر جدا جدا ڈھنگ سے نشوونما اور ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہے شمالی ہند میں یہ مسلمانوں' ترک فاتحین اور بیرونی لوگوں کے نزدیک ہندی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ فارسی بولنے والے تمام لوگ اس کو ہندی ہی سے موسوم کرتے تھے کیوں کہ ان کی بیرونی زبان کے مقابل یہ ہندوستانی الاصل زبان ہندی ہی تھی حتیٰ کہ وہ لوگ، جو خود عام بول چال میں اس کا استعمال کرتے تھے اسے ہندی ہی کہتے تھے۔ بعد میں انگریزوں نے اس کو ہندوستانی کا نام دیا جسے عرصہ دراز تک دکن اور گجرات والے اور دیگر لوگ ہندوستانی ہی کہتے رہے۔ بہرحال ہندی یا ہندوستانی اپنے مرکز یعنی دہلی اور شمال ہند میں الگ طرح سے ترقی کرنے لگی۔ اس زمانہ میں چوں کہ فارسی بولنے والوں کا ستارہ اقبال عروج پر تھا ملک میں جو تق در حوق فارسی کے حضرات آرہے تھے۔ فاتحین اور حکمرانوں کی زبان فارسی تھی۔ فارسی میں شعر کہنا کوئی باعث افتخار سمجھی جاتی تھی سرکاری امور فارسی میں انجام پاتے تھے۔ درباری زبان فارسی تھی جس کا

لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ روزمرہ کی بول چال کی زبان پر بھی دن بہ دن فارسی کا اثر گہرا ہونے لگا تاہم بادشاہوں اور صوفیاء کرام کے پیش نظر عوام کے قلوب کو جیتنا بھی تھا۔ تاکہ بہ آسانی حکومت و نیز تبلیغی و انسانی خدمات کے امور انجام پا سکیں اس لئے انہوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی بولی کو بھی استعمال کرنا روا رکھا جس کے نتیجہ میں ان کا عوام سے رابطہ مضبوط ہوا۔ ایسی بہت سی مثالیں صوفیاء کرام کے اقوال، فقروں اور کلام میں ملتی ہیں حضرت مسعود سلمان، بابا فرید گنج شکر، حمید الدین ناگوری، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت روشن چراغ دہلی، حضرت خواجہ امیر خسروؒ ان کے علاوہ حضرت بوعلی شاہ، قلندرؒ حضرت شمس بلخی، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ افضل نارنولی کے نام اردو کے ابتدائی عہد کے مصنفین اور شعراء کے طور پر ملتے ہیں ۱۵ بعد کے عہد میں کبیر داس اور گرو نانک کے نام بے حد اہمیت رکھتے ہیں بہرحال اردو کی قدیم شکل پر فارسی کا گہرا رنگ شمالی ہند میں روز افزوں چڑھتا جا رہا تھا جس سے اس دور میں فارسی کی بے پناہ اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اردو چونکہ دو مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان پل اور رابطہ کی زبان تھی اس وجہ سے ہندی الاصل اردو فارسی سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی اس کے ذخیرہ الفاظ میں فارسی اور عربی نے بے پناہ اضافہ کیا۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ ہندی اور ہندوؤں کے نزدیک ترک بھاشا تھی اردو میں فارسی عربی کے اس قدر رسوخ کے باوجود شمالی ہند میں عرصہ دراز تک اس کو ادبی شان نہ مل سکی سوائے فارسی کے اس زبان میں یا کسی اور ہندوستانی زبان میں شاعری کا تصور اس عہد میں کسر شان تھا۔ اردو فقط بول چال کی ہی زبان سمجھی جاتی رہی اس کو کبھی تحریر کے قابل یا ادبی اغراض کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ تاہم یہ برابر اپنی مقبولیت بڑھاتی رہی اور وسیع سے وسیع تر انداز میں پھیلتی رہی۔

گجرات میں جب اردو پہنچی تو جس قدر اس پر فارسی کا اثر تھا وہی باقی رہا اس میں اضافہ یا کمی نہ ہوئی۔ یہاں اردو کی ترقی گجراتی زبان کی آغوش میں بہت تیزی رفتاری کے ساتھ ہوئی۔ کم مدت میں گجراتی اردو میں ادب کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ گجراتی اردو یا گجری شمالی ہند کی طرح آئے دن فارسی کے اثر سے محفوظ رہی اور اپنے طور پر نشو و نما پانے لگی۔ گجری کے نامور شعرا اور مصنفین نے اپنی علمی و ادبی کاوشوں سے بہت جلد گجراتی اردو کو معیاری زبان بنا دیا۔ گجری تحریری اعتبار سے ترقی یافتہ زبان سمجھی جانے لگی جبکہ خود گجراتی کا دامن ادبی جواہر سے خالی تھا لیکن اس کی ترقی اچانک سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے تھم سی گئی۔ گجرات کا ادبی مرکز دکن منتقل ہو گیا۔

دکن میں اردو گجرات کے ساتھ ساتھ پہونچی شمالی ہند اور گجرات میں اردو کے ارتقاء کا حال ابھی

آپسنے پڑھانڈن کا معاملہ ان دونوں سے منفرد تھا۔ شمالی ہند میں اُردو کو فارسی عربی سے قطع نظر تمام ماحول آریائی زبانوں کا میسر تھا اور گجرات میں بھی اُردو کا سابقہ گجراتی سے پڑا جو ہند آریائی زبان ہی کی ایک شاخ ہے لیکن دکن میں سوائے مرہٹی زبان کے تمام ہمسایہ زبانیں ایک دوسرے خاندان السنہ یعنی دراوڑی سے تعلق رکھتی تھیں جو آریائی زبانوں سے بنیادی طور پر الگ ہیں۔ دکن میں اُردو اپنے ساتھ جو کچھ فارسی عربی اور شمالی ہند کی دیگر بولیوں کے اثرات لائی تھیں بس اس قدر ہی اس کے کشکول میں تھا۔ تشکیل و نشوونما اور ارتقاء کی تمام منزلیں اس نے اپنی اجنبی ساتھیوں کے سنگ طے کیں۔ دکن میں اُردو دکنی سے موسوم ہوئی۔ دکنی کو یہاں ایک خوشگوار ماحول ملا۔ سلاطین دکن نے ٹوٹ کر اس کو چاہا۔ شعراء نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ شمال کے برخلاف آئے دن کے بیرونی اثرات سے مکمل محفوظ رہی۔ موافق اور پرسکون حالات میں دکنی کو خوب پھیلنے پھولنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ سلاطین بہمنیہ نے دل کھول کر اس کی حوصلہ افزائی کی[1] شمالی ہند سے دکن کے سیاسی تناؤ نے جہاں بہت سارے معاملات پر اثر ڈالا وہیں یہ سیاسی کشاکشی اور شمال و جنوب کے عدم رابطہ نے اُردو سے قدیم یا دکنی کو ترقی کرنے کے عظیم الشان میدان فراہم کئے۔ بہمنی سلطنت کا نامور اولوالعزم حکمران فیروز شاہ نے اپنے دربار کو اہل علم و فضل کا جگہ دی خود دکنی زبانوں کا ماہر تھا اور دربار میں بھی دیا کرتا تھا اسی کے زمانہ میں اردو کے پہلے شاعر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے[2]۔ فیروز شاہ اور اس کے بھائی احمد شاہ کے دور میں دکن میں نامور شعراء تھے۔ شاہی دفتروں میں اُردو (ہندی) رائج تھی[3]۔ بہمنی دور میں اُردو کی ترویج و ترقی منظم طریقہ پر شروع ہو چکی تھی اس عہد کے معروف شعراء و نثار کی فہرست نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے "دکن میں اردو" نامی کتاب میں اس طرح دی ہے۔ حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز رح سید اکبر حسینی۔ نظامی۔ شاہ صدر الدین عبداللہ حسینی، مشتاق، لطفی، شاہ میراں شمس العشاق اور آذری ان میں حضرت بندہ نواز رح اور میراں جی شمس العشاق کو کئی وجوہ کی بنا پر ایک خصوصیت حاصل ہے[4]۔

سلطنت بہمنیہ کے خاتمہ پر دکن میں پانچ الگ الگ سلطنتیں قائم ہو گئیں جو قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی سے موسوم ہوئیں۔ ان سب میں قطب شاہی

---

[1] تاریخ فرشتہ [2] دکن میں اُردو

اور عادل شاہی خاندان جو علی الترتیب گولکنڈہ اور بیجاپور میں حکمران تھے، اردو زبان کی بطور خاص سرپرستی کی ان دونوں سلطنتوں میں اُردو کی ترقی : وہ تدریج کی رفتار قابل رشک تھی کیوں کہ ان کے درباروں میں چنیدہ اہلِ علم و فضل کا جمگھٹا رہا کرتا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ادبی سرگرمیاں بے حد مرغوب تھیں یہاں پر شعراء ادبا علماء اور فضلا کی قدر افزائی کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں کو مشترکہ طور پر یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے دکنی تہذیب و تمدن اور روایات کی اساس پر ایک ایسے مشترک کلچر کی بنیاد رکھی جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں شیر و شکر کر دیا۔ اور اس گنگا جمنی تہذیب کا ذوغ ہوا جسے بہمنی سلطنت کے حکمرانوں نے دکن میں شروع کیا تھا۔ اسی دور میں دہلی میں شہنشاہ اکبر کی بھی کوششوں کا جو حاصل تھا۔ اس اہم اور بنیادی کلچر کے فروغ میں، دکنی کی اہمیت کو اس واسطے فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ یہی وہ زبان تھی جو اس مشترک تہذیب کی بنیاد سمجھی جاتی تھی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے خوابوں کی تعبیر نظر آتی تھی۔ ان مشترک قدروں کو آگے بڑھانے میں دکنی کا کلیدی رول رہا ہے جس نے عام بے گانگی اور اجنبیت کے فاصلے مٹا کر دو عظیم تہذیبوں کے علمبرداروں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ اس ضمن میں دکنی کے شعراء مصنفین اور بالخصوص صوفیاء کرام کی عظیم خدمات قابل صد ہزار تحسین ہیں جنھوں نے اپنے سحر کار فن کے ذریعہ مختلف فرقوں میں ہم آہنگی اور یکجہتی کا احساس جگایا۔

گولکنڈہ کے دو سو سالہ دورِ حکومت میں یوں تو بے گنتی شعراء گزرے ہیں ان میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں جنھوں نے اپنے فکر و فن کے ذریعہ دکنی زبان کو اعتبار عطا کیا، ستوارا، نکھارا، اور ادبی اعتبار سے اعلیٰ ترین مقام پہ پہونچا دیا۔ اس فہرست میں سب سے قابل احترام نام حضرت میراں جی خدا نما کا ملتا ہے ان کے بعد خود اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی معانی کا نام آتا ہے۔ مُلّا خیالی۔ وجہی۔ غواصی۔ احمد۔ ابن نشاطی۔ محمود۔ فیروز۔ سلطان عبداللہ۔ بلاقی۔ شاہ راجو۔ تانا شاہ اور فائز وغیرہ۔ جنھوں نے نہ صرف شاعری بلکہ نثری تخلیقات کے ذریعہ اُردو زبان کی اہمیت کو دنیا سے منوایا۔

عادل شاہیہ نے لگ بھگ دو سو سال حکمرانی کی ان کا پایہ تخت بیجاپور تھا بیجاپور کا نام دکنی زبان کی تاریخ میں ہمیشہ مثل آفتاب جگمگا تا رہے گا۔ بیجاپور کی ادبی و علمی سرگرمیاں دکنی کے فروغ کی اہم کڑی ہیں۔ خانوادہ عادل شاہیہ نے دکنی زبان کی ترویج و اشاعت

پھیلاؤ اور ارتقاء کے لئے جو گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں اہلِ اُردو ہمیشہ انھیں یاد رکھیں گے۔ بیجاپور کے درباری ہمیشہ اہلِ کمال فن کاروں کا ازدحام سا رہتا چوں کہ سلاطین خود علم دوست تھے اس وجہ سے اہلِ علم حضرات کی قدر افزائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی عہد عادل شاہیہ میں دکنی کے ان ممتاز شعراء اور مصنفین کے نام ملتے ہیں جن کی ادبی خدمات نے اردو زبان کو استحکام اور وقار عطا کیا۔ حضرت شاہ برہان الدین جانم، سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی، عبدل، شوقی، صنعتی، ملک خوشنود رستمی، سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، حضرت امین، ہاشمی، شغلی، قدرتی، قادر اور معظم وغیرہ ان کے علاوہ سلاطین احمد نگر، برار، اور بیدر، نے بھی حتی المقدور اردو زبان کی ترقی میں دلچسپی لی نظام شاہی دربار سے وابستہ شعراء میں اشرف، آفابی اور شوقی کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ بریدشاہیہ سے وابستہ مشہور شاعر قریشی کا نام دکنی کے فروغ کی تاریخ میں ملتا ہے[1] بہرحال اُردو زبان جو دکن میں دکنی سے موسوم ہوئی یہاں ادبی کمال اور زبان کے معیار کے تعین کی منزل میں پہنچ چکی تھی۔ اُردو کی موجودہ جدید شکل میں قدیم ہندوستانی گجری اور دکنی کا علیحدہ علیحدہ حصہ تسلیم کیا جاسکتا ہے مگر درحقیقت دکنی ہی نے اُردو کی موجودہ صورت گری اور ادبی شان کی تخلیق میں بنیادی کردار ادا کیا ہے جس کا اعتراف سب ہی اُردو والوں کو ہے۔

---

[1] دکن میں اُردو

باب ششم

اُردو کا عہدِ جدید

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب — ہندوستانی لسانیات کا خاکہ کے مقدمہ میں اردو کے ارتقاد کے زیرِ عنوان یوں فرمایا ہے۔ "کھڑی بولی نے جو نیا روپ اختیار کیا تھا اسے شروع شروع زبان دہلوی، ہندی یا ہندوی کہا گیا دکن پہونچ کر دکھنی کہلائی اور گجرات میں گجری نام پھر ریختہ، زبان اردوے معلیٰ کہی گئی مغربی مصنفین نے ہندوستانی کا لفظ بھی اس کے لئے استعمال کیا گویا ارتقاد کی جتنی منزلیں اس نے طے کیں اتنے ہی نام اس کے پڑتے گئے۔ لیکن آسانی کے لئے اسے اردو یا ہندوستانی کہنا مناسب ہوگا[1] اس لحاظ سے اردو کے عہد بہ عہد ارتقاء اور مقامات کی مناسبت سے اس کے مختلف نام پڑتے گئے لیکن آخر کار "اردو" کے نام پر عام اتفاق ہوگیا چنانچہ آج یہ زبان ساری دنیا کے گوشے گوشے میں اردو ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے پڑھا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ زبان کس طرح مختلف مدارج اور مراحل سے گذرتی ہوئی دکن میں ادبی اعتبار پائی دکن میں اردو زبان دکنی کے نام سے ایک ایسی منزلت پر پہنچ گئی جہاں اس کو مستقبل کے ارتقائی مراحل طے کرنے آسان ہوگئے گویا اردو کی ادبی حیثیت کی بنیاد کا آغاز دکن میں ہو چکا تھا۔ شاعری اور نثری تصانیف کا ایک وسیع کام اردو میں شروع ہو چکا تھا۔ اہل دکن نے اردو کو اظہار خیال اور شعری و نثری تخلیقات کے لئے منتخب کر کے ایک ایسی روشن راہ کی نشاندہی کی جس پر آج تک مسلسل لاکھوں اردو ادیب اور شاعر چل رہے ہیں اور دنیا کی عظیم زبانوں کے دوش بدوش اردو والوں کو لا کھڑا کر دیا ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ بہمنیہ سلطنت پھر اس کی جانشین سلطنتوں میں اردو میں ادبی ذخائر کا مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ مقدمہ صفحہ ۵۸

دکن کے شعراء نے اُردو میں اپنے فکری و شعری شہ پاروں کو منتقل کر کے اُردو زبان کو مستقل ادبی حیثیت بخش دی تھی جب کہ شمالی ہند میں صدیوں بعد مزاج نہ بدلا تھا وہاں پہ اُردو اگرچہ کہ مقبول تھی مگر صرف عوامی حلقوں یا امراء کے طبقہ میں بول چال کی حد تک مسلسل دور تک بھی اُردو میں کوئی قابل ذکر ادبی سرمایہ شمال میں موجود نہ تھا اُردو کو تحریری زبان اور ادبی شان والی زبان سمجھنے میں شمال والے پس و پیش ہی کرتے تھے ویسے فارسی زبان چوں کہ حکمرانوں کی زبان تھی اور شاعری کے لئے فارسی زبان ہی سب سے زیادہ قابل وقعت سمجھی جاتی تھی۔ اُردو (ہندوستانی) کو بے حد عزیز رکھنے والے بھی شاعری اور تحریری ضروریات کے لئے فارسی ہی کو ترجیح دیتے تھے یہی وجہ ہے اُردو خاطر خواہ طریقے سے شمال میں پھلنے پھولنے نہ پائی تھی۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے جب دکن کی طرف رخ کیا تو حالات نے یکسر پلٹا کھایا۔ شمالی ہند سے بالکل گئی ہوئی اُردو (دکنی) کے دن پھر گئے۔ رفتہ رفتہ شمال والے دکن اور دکن والے شمالی ہند لوٹنے پلٹنے پہ جانے آنے لگے۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن نے اس سلسلہ کو اور زیادہ وسعت اور تیزرفتاری عطا کر دی۔ شمال اور جنوب والوں کے میل جول اور آپسی اختلاط نے انھیں جہاں زندگی کے سینکڑوں مسائل کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا وہیں انھیں اپنے آپسی معاملات پر بھی غور کرنے کا موقع ملا زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح لسانی اُردو ادبیاتی شعبہ ہائے زندگی پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ شمال والوں نے دکنی کو سمجھنے کی سعی کی اور دکنی والوں نے شمالی ہند کی زبان پر گہرائی کے ساتھ نظر ڈالی۔

دکن میں اُردو کی ترقی یافتہ شکل و صورت دکنی کے روپ میں دیکھ کر شمال والے انگشت بدنداں رہ گئے انھیں اس باب میں اپنی کوتاہیوں غفلتوں اور لاپرواہیوں کا احساس ہوا کہ انہوں نے بیرونی عناصر کے زیر اثر میں فارسی کو اس قدر اہمیت دی کہ اُردو جیسی ملکی مقامی اور شیریں زبان کو پس پشت ڈال دیا اس کو ادبی اغراض کے لئے استعمال کے قابل ہی نہ سمجھا جب کہ دکن کے باکمالوں نے اُردو کو اپنا کر ثابت کر دیا کہ اس زبان کو دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان مثلاً فارسی ترکی وغیرہ کے مقابل لا کھڑا کیا جا سکتا ہے اُردو کے ساتھ شمال والوں کی بے اعتنائی نے اس کو خود اس کے مولد اور وطن میں اجنبی اور لاوارث بنا دیا تھا۔ اس وقت شمال والوں کو شدید احساس ہوا کہ اس زبان کی سرپرستی شمال والوں کی جانب سے ناگزیر ہے فارسی کے مقابل ایک حریف ادبی زبان کی حیثیت سے اُردو کو پیش کیا جانا ملکی، قومی، سیاسی اور تہذیبی

ضرورتوں کی تکمیل کا باعث ہوگا۔ کیوں کہ اہلِ زبان فارسی شعراء کے مقابل قلعی شعراء ہمیشہ احساسِ کمتری میں مبتلا نظر آتے اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہی درباروں میں بیرونی شعراء کی خوب آؤ بھگت ہوتی ان کے مقابل غیر زبان والوں کو کون پوچھتا۔ اس کے زیرِ اثر شمالی ہند کے فارسی شعراء فارسی سے کچھ اکتا سے گئے تھے۔ جب دکن میں اردو شعر گوئی کی ترقی کا حال جانا تو وہ اس جانب متوجہ ہوئے چند فارسی شاعروں جیسے گلشنؔ اور بیدلؔ نے اپنی غزلوں میں اردو اشعار کو بھی جگہ دی۔ ان کے یہ تجربے کامیاب بھی رہے علاوہ ازیں آہستہ آہستہ سیاسی حالات کے تغیرات نے فارسی کی قدر و قیمت کو بھی متاثر کیا جس سے عام فارسی بیزاری پیدا ہونے لگی نتیجتاً ایک نئی راہ کی کھوج میں شدت ہوئی اس وقت سوائے دکنی ادبیات کے کوئی اور فارسی کی تلافی کا اہل نہ تھا۔ چنانچہ اردو میں فکری کاوشوں کا آغاز ہوا چنانچہ مغلیہ عہد کے کچھ اردو کے شعری نمونے ملتے ہیں تاہم انھیں وہ اہمیت حاصل نہیں جو پورے ماحول کے اردو اپنانے سے پیدا ہوئی کیوں کہ اس عہد میں اور اس سے ماقبل بھی اردو کی شعری کاوشوں میں فارسی کے عمل دخل کا تناسب اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اردو شعر کو بہ شکل اردو ماننا دشوار تھا کیوں کہ اس پر بہت زیادہ اور گہرا رنگ فارسی کا ہوا کرتا۔ اورنگ زیب کے فتح دکن کے نتیجہ میں دکنی تخلیقات شعری شاہکار نثری تصانیف وغیرہ شمال پہنچے تو وہاں علمی و ادبی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ شمال والے یہ باور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ہندوستانی میں اس طرح شاعری اور ادب کے نمونے مل سکتے ہیں اُن کے سامنے صرف فارسی کی عظمت و شان تھی لیکن جب عملاً انہوں نے اردو کے ادبی مواد کو دکنی میں موجود پایا تو ان کا نظریہ نگاہ بدلنے لگا۔ اس زمانے تک قطب شاہی سلطنت کے تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ جو فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں شاعری کرتے تھے اور معانی تخلص کرتے تھے کا کلام اہلِ شمال کے علم میں آچکا تھا۔ ویسے معانی کے اردو دیوان کو اردو میں اولیت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں بیسیوں دکنی شعراء نے دہلی کا سفر کیا اور اپنے فکر اور فن اور اردو نوازی کے سبب ہاتھوں ہاتھ لئے گئے ان سب میں وہ عظیم المرتبت شخصیت تھی جس نے سارے شمال میں بالخصوص دہلی کے ادبی حلقوں میں دھوم مچا دی اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ جو شمال میں اردو شاعری کی بنیاد کا سبب اور اردو کی ادبی شان کو منوانے والے سمجھے جاتے ہیں وہ حضرت ولی دکنی (اورنگ آبادی) ہیں[1]

---

[1] دیکھئے مختصر تاریخ ادب، اردو ڈاکٹر اعجاز حسین

ولی دکنی کو ایک عرصہ تک اُردو کا پہلا صاحب دیوان سمجھا جاتا رہا مگر سلطان قلی قطب شاہ کے کلام کی دستیابی نے اس خیال کی نفی کر دی تاہم ولی کی یہی کیا کم اہمیت ہے کہ اس کی اردو کی شاعری نے شمالی ہند کے ادبی شعری اور فکری دھاروں کو پلٹ کر رکھ دیا ولی کو دکنی شعراء میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے خود دہلی جا کر اپنے فنی کمال اور شاعرانہ عظمت کا لوہا منوالیا۔ ولی دکنی عہد اورنگ زیب کا شاعر تھا۔ دہلی میں سخن سنج اور سخن فہم حلقوں نے ولی کی قدر افزائی کا حق ادا کر دیا۔ دہلی میں ولی کی مقبولیت کی یہی لہر چلی کہ بڑے بڑے اہل کمال اس کی غزلوں کی تقلید میں غزلیں کہتے ولی کے مصرعوں کو اپنے مشاعروں کے لئے طرحی مصرع لیا کرتے۔ ولی کے تجربات سے بھرپور استفادہ اس وقت ایک ادبی فیشن بن گیا تھا۔ بڑے بڑے شعراء نے ولی کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔ شمالی ہند میں دو تین نسلوں تک ولی کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتم کا اعتراف، خود حاتم کا یہ شعر اس کا بین ثبوت ہے کہ حاتم اور دیگر اہل سخن کے نزدیک ولی کا کیا مقام تھا ؎

حاتم یہ فن شعر میں کچھ بھی تو کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہاں سخن کے بیچ

اسی طرح آبرو کا یہ خراج ؎

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولی کا سخن کرامت ہے

خدائے سخن میر تقی میر کا والہانہ انداز اس شعر سے جھلکتا ہے جو ولی دکنی کی عظمت کا مظہر ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولی کے ساتھ دہلی والوں کی غایت درجہ عقیدت کا اظہار اس مصرع سے ہو سکتا ہے جو تذکرہ قائم میں ملتا ہے جسے ڈاکٹر زور نے بھی ہندوستانی لسانیات میں نقل کیا ہے مصرع

ولی پہ جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

ولی دکنی نے اپنے متعدد سفروں میں دہلی والوں کے ذہنوں پہ اُردو میں فکر سخن کی نئی روشنی

نخشا جس کے نتیجہ میں پورا ماحول اُردو کے لئے نہایت سازگار ہو گیا۔ ایسا نہیں کہ ولی نے صرف اپنا اثر چھوڑا ہو بل کہ خود ولی نے بھی شمالی ہند کی مروج زبان جس پر فارسی کا شدید غلبہ تھا سے اثر قبول کیا جس کا ثبوت خود ان کے اس کلام سے ملتا ہے جو دہلی کے قیام کے دوران اور بعد تخلیق ہوا۔ دہلوی شاعر پہ قدیم فارسی شاعری کا بہت گہرا اثر تھا چناں چہ ولی کے پاس یہ رنگ بھی ملتا ہے

تری یہ زلف ہے شام غریباں
جبیں تری مجھے صبح وطن ہے
مشق کر اے دل سدا تجرید کی
عاشقی ہے ابتداء توحید کی
حسن تھا عالم تجرید میں سب سے آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ
مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
زندگی جام عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں

ولی کے بشمول دکنی شعراء ہی نے اردو شاعری ہی کو شمالی ہند نہیں پہنچایا بل کہ اُردو کی دکنی نثری تصنیفات نے بھی شمال میں اردو کی طرف اہلِ قلم حضرات کو متوجہ کیا۔ فتح دکن کے بعد دکنی نظم ونثر نے شمال میں اُردو زبان کی ادبی صورت گری میں بنیادی کردار ادا کیا ہے جس کا اعتراف تمام دانشوروں، مورخین اہلِ زبان شعراء اور ادبا کو ہے یہ بھی سچ ہے کہ جس زمانہ میں دکن میں اُردو تیز رفتاری سے ترقی کر رہی تھی شمال میں بالکل جمود نہ تھا بل کہ کچھ نہ کچھ کام تو ہو رہا تھا مگر اس پر پوری طرح فارسی ادبیات کا غلبہ تھا۔ ساتھ ہی شمال کے مختلف علاقوں میں مقامی بولیاں بھی اپنا حصہ ادا کر رہی تھیں اسی وجہ سے دکنی کے مقابلہ میں شمالی ہند کی اُردو ضلع ماری اساس پر اپنا لہجہ اپنا رنگ اپنا آہنگ بدلتی دکھائی دیتی ہے۔ بہ ایں ہمہ اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی شمال میں اردو کا بڑے روز وشور سے چرچا ہونے لگا شمال سے قبل دکن میں اردو نظم ونثر کے آغاز کا ثبوت وہ لاکھوں مخطوطات جو دنیا بھر کے مختلف کتب خانوں بالخصوص برطانیہ،

جرمنی اور فرانس کے علاوہ ہندوستان کے ہر بڑے کتب خانے میں موجود ہیں۔

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی اور دیگر محققین نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی بابت جو جدید تحقیقات پیش کی ہیں ان کی رو سے نہ صرف ولی بل کہ ولی سے قبل بھی دہلی میں اردو شاعری کے چرچے تھے اس عہد کے نامور شعراء میں برہمن فائز دہلوی، آبرو، ناجی، مضمون، یک رنگ، آرزو، اور انجام شامل ہیں۔ بعد والوں میں حاتم، فغاں، سودا، درد، میر، یقین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شمالی ہند میں فارسی کے بجائے اردو شاعری کے رواج کا بہرحال سہرا ولی دکنی کے سر بندھتا ہے اسی عہد سے اردو زبان اپنے جدید ادبی وقار کے ساتھ کا سامان کرتی ہے دکن والوں نے جس پودے کی آبیاری کی تھی صرف دو صدیوں میں شمالی ہند میں ایک تناور درخت میں بدل گیا۔

پروفیسر مغنی تبسم نے اس ضمن میں فرمایا ہے۔ "ولی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دہلی کی فارسی گو شاعروں کو یہ احساس دلایا کہ جس بازاری زبان کو وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اس میں ادبی اظہار کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ ولی کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فارسی غزل کی طویل روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اور غزل کو جو سراپا نگاری کی منزل سے آگے نہیں بڑھی تھی اتنی ترقی دی کہ وہ فارسی غزل سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی۔ دیوان ولی میں دو طرح کی شعری فرہنگیں مستعمل ہوئی ہیں: ایک وہ فرہنگ شعر جسے ہمنی دور سے لے کر قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے خاتمے تک شعرائے دکن نے پروان چڑھایا اور جس میں سنسکرت، خذ کے الفاظ کا تناسب زیادہ ہے دوسری وہ فرہنگ شعر جو دہلوی اردو سے قریب تھی اور جس میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی یلغار نظر آتی ہے۔ کچھ یہ جانتے کہ سفر دہلی کے بعد ولی کی زبان اور اسلوب میں یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔" پروفیسر مغنی تبسم آگے لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ ولی اور سراج کے عہد میں اورنگ آباد دکنی اور دہلوی زبانوں کا سنگم بن گیا تھا۔ یہاں اردو زبان کی تشکیل کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا، اس تشکیلی دور میں ادبی زبان ایک نئے معیار کی متلاشی تھی۔ اہل سخن اسے ایسے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے جو بیک وقت اہل دہلی اور اہل دکن کے ذوق کی تشفی کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی ان کے ہمعصروں اور نوعمر معاصرین کے کلام میں ایک سے زیادہ اسالیب اظہار ملتے ہیں۔ ان کی فرہنگ شعر بے حد لچکدار ہے۔" [1]

---

[1] سراج اورنگ آبادی، از مغنی تبسم، مشمولہ تحریر یہ امکان ص ۱۸۱ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈیمی ۱۹۸۴ء

ریختہ کیا ہے

اُردو کے نام سے خود قدیم اہلِ اُردو ناشناس تھے وہ اِسے ہندی ہندوی یا ریختہ کے نام سے یاد کرتے تھے' ہندی اور ہندوی نام تمام فارسی داں مسلمان عرصہ دراز تک پکارتے رہے بعد میں اسے ریختہ کا نام دیا گیا۔ میر جعفر زٹلی' شاہ حاتم' سودا' میر تقی میر' غلام علی عشرت' شاہ عبدالقادر دہلوی' میر امن' مرزا غالب اور شفیتہ وغیرہ نے قدیم اُردو کو ریختہ سے ہی خطاب کیا ہے [1] مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں۔"اس زبان کو (یعنی اُردو) ریختہ کہتے ہیں کیوں کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز۔ چوں کہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے ریختہ کہتے ہیں [2]۔ اکثر متقدمین نے ریختہ کے معنی فارسی کے شکستہ و ریختہ کے لحاظ سے گری پڑی اور پریشان چیز ہی کے لئے ہیں لیکن اس کے دوسرے معنی بھی فارسی ہی میں مستعمل ہیں یعنی ایجاد کرنا' بنانا' ڈھلان اور موزوں کرنا وغیرہ امیر خسرو کے نزدیک ریختہ کی اصطلاح موسیقی کے فن کے ضمن میں استعمال ہوئی ہے جس میں ہندی اور فارسی شعری مضامین تال اور راگ کے اختیار سے متحد ہوتے تھے۔ حضرت امیر کے بعد عرصہ تک ریختہ گیت کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد ریختہ موسیقی کی پابندی اصطلاح کے بجائے ہر ایسی منظوم چیز کے لئے جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو استعمال ہونے لگا۔ شیخ باجن' شیخ جمال' شیخ سعدی (عہد اکبری) کے پاس ریختہ کا یہی مفہوم ملتا ہے میر تقی میر نے ریختہ کی چار قسمیں گنائی ہیں۔ (۱) ایک مصرع ہندی اور ایک مصرع فارسی (۲) نصف مصرع فارسی نصف ہندی (۳) فارسی کا عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو (۴) صرف فارسی تراکیب کا پایا جانا۔ گیارھویں صدی میں ریختہ کا اطلاق اردو نظم پر ہونے لگا۔ ریختہ کا تعلق نثر یا مسائل زبان سے نہیں ہے [3]۔ ریختہ کے متعلق چند قدیم اور عظیم شعراء کے خیالات شعری صورت میں خالی از دلچسپی نہ ہوں گے ؎

ایک تو ریختہ ہے سہل زبان
دوسرے جب کہ ہو بہ شوخی بیاں
(میر اثر)

---

[1] پنجاب میں اردو [2] آب حیات

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیار سے
(سوداؔ)

قائمؔ میں تختہ کو دیا خلعت قبول
ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا
(قائمؔ)

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختیوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں
(میر تقی میرؔ)

سرسبز ہندی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ
(میرؔ)

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ تختہ کہنے سے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا
(میرؔ)

تختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا
(غالبؔ)

جیسا کہ اوپر کہیں کہا جا چکا ہے کہ شمالی ہند میں عہد مغلیہ میں اکثر اُردو شعراء کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے بالخصوص سترھویں صدی عیسوی میں، افضل جھنجھانوی اللہ جعفر زٹلی وغیرہ کی شاعری اسی میں ملتی ہے مگر ریختہ گوئی کے آغاز کے بارے میں دکنی شعراء ہی کی جدت، تجربہ اور پہل کو تسلیم کیا جاتا ہے دکن میں ریختہ کا مطلب نظم اُردو لیا جاتا تھا چناں چہ ولی دکنی اور سراج و دیگر شعرائے دکن کے پاس یہی مفہوم ملتا ہے لیکن شمال والوں نے خصوصاً اہل دہلی نے اس کو زبان اردو کا نام دیا کیوں کہ اردو زبان کا سارا سرمایہ نظم ہی کی شکل میں تھا بعد میں نثر کے لئے بھی یہی اصطلاح

چل پڑی آخرش ریختہ کا نام اُردو زبان پڑ گیا۔ قدیم زمانہ میں اسے زبان دہلوی کہا جاتا تھا۔ امیر خسرو اور متاخرین میں شیخ باجن وغیرہ کے پاس زبان دہلوی استعمال ہوا ہے۔ میر امن دہلوی کے خیال میں مختلف اقوام کی جدا جدا بولیوں کے اکٹھا ہونے سے "ایک زبان اردو مقرر ہوئی"[1] سر سید خاں کے نزدیک شاہجہاں آباد کے بسنے جانے کے سبب مختلف ملکوں کے لوگوں کے آپسی میل جول سے جو زبان تشکیل پائی وہ بعد میں اُردو سے موسوم ہوئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے پاس بھی ایسا ہی خیال ملتا ہے۔ بہرحال ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ اُردو زبان کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا یہ اور بات ہے کہ اس کا نام اُردو بعد میں پڑا پہلے وہ ہندی، ہندوی، لاہوری، دہلوی، گجری، دکنی، ریختہ، زبان اردو، اردو معلیٰ اور بالآخر اردو سے موسوم ہوئی۔ مغربی مصنفین اور خود جنوب والوں کے پاس اس کے لئے ہندوستانی کا نام بھی ملتا ہے۔ جدید اُردو کا آغاز اورنگ زیب کے فتح دکن کے بعد شمال و جنوب کے اہل علم و ادب، شعراء اور مصنفین کے تبادلوں کے نتیجہ میں بلا شبہہ سرزمین دہلی میں ہوا جہاں کہ اُردو زبان کی موجودہ شکل و صورت کی ترقی یافتہ کیفیت میں دہلوی شاعروں اور اہل زبان دانشوروں کا اہم اور گراں قدر حصہ ہے۔

اُردو میں اصلاحی تحریک (منظر تحریک)

دکن سے دہلی صرف ولی ہی نہیں گئے تھے بلکہ بہت سارے دکنی شعراء کے دورۂ دہلی کا حال مختلف تذکروں میں ملتا ہے لیکن جو شہرت اور مقبولیت ولی دکنی کو حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دہلی میں ولی کے سینکڑوں متبعین اور ہزاروں مداح پیدا ہو گئے۔ ولی کی تقلید میں ریختہ گوئی عام مذاق بن گئی فارسی کی شاعری میں محنت، دماغ سوزی اور فکری ورزش سے عام اکتاہٹ نے لوگوں کو ریختہ کی طرف مائل کیا تھوڑے ہی عرصہ میں اُردو شاعری فارسی کے دوش بدوش نظر آنے لگی اگرچہ کہ فارسی مغل دربار کی سرکاری زبان تھی اور تمام بڑے شاعر اور اساتذہ کو فارسی پر پورا عبور تھا تاہم اُردو شاعری کی اپنی خصوصیات اور جاذبیت نے انھیں بھی اس طرف متوجہ کیا تھوڑے ہی عرصہ میں ریختہ گوئی کا رواج عام ہو گیا۔ چونکہ دکنی زبان میں برج بھاشا کے

---

[1] باغ و بہار میر امن ص ۳

اسالیب اور انداز کا تناسب فارسی کے برابر موجود تھا اس وجہ سے شمالی ہند والوں نے برج بھاشا کے نمونوں کو سامنے رکھ کر اس کی پیروی کی ۔ برج دوہوں کے انداز میں فکر سخن کا عام رجحان بڑھنے لگا اس کے سبب صنعت ایہام کا رواج عام ہوا۔ شاعری کے علاوہ نثری تصانیف بھی جو دکن سے شمال پہونچی ان میں بھی شمال میں مروج زبان سے جداگانہ انداز تھا شمالی ہند والوں نے نثر میں بھی دکن کی تقلید کی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا۔

ڈاکٹر زور نے اس ضمن میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔ "دکنی طرز کی پیروی اہل شمال کے لئے غیر فطری تھی اس میں بھی خیال ادا کرنے کے لئے انھیں تکلیف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا[1] چوں کہ اس عہد کے تمام بڑے بڑے اہل قلم اردو کے علاوہ فارسی میں بھی استادانہ حیثیت رکھتے تھے ان پر فارسی کا رنگ غالب تھا اس وجہ سے وہ ہندی الفاظ پر فارسی کو ترجیح دیتے تھے۔ ولی دکنی کے بعد کچھ عرصہ تک تو دکنی اثر خوب گہرا رہا لیکن آہستہ آہستہ یہ پھیکا پڑنے لگا اور اساتذۂ سخن دوبارہ فارسی کی طرف زور دینے لگے۔ انہوں نے اپنی روزمرہ کی زبان (اردو) میں زیادہ سے زیادہ فارسی آمیزش کے ساتھ شعر گوئی کا سلسلہ شروع کیا جو ابتداء میں تو زیادہ مقبول نہ ہوا لیکن بعد میں زور و شور سے چل پڑا۔ اس دور میں جن لوگوں نے اردو زبان کی تطہیر کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا ان میں خود شاہ حاتم، حضرت مظہر جان جاناں، میر درد، سودا، قائم، یقین، بیان، ہدایت قدرت اور مضمار کے علاوہ ان کے بیسوں ہم عصر شامل تھے[2] اسی زمانہ میں اردو زبان کئی دکنی اور برج بھاشا کے الفاظ اور تراکیب سے پاک کی گئی جو ولی اور ان کے ہم عصر شعراء دہلی کے پاس کثرت سے ملتے تھے و نیز موزوں فارسی الفاظ اور محاورے اصلاً یا ترجمہ کی شکل میں شامل ہوئے۔ فن شعر کو نقائص اور معائب سے مبرا کیا گیا نئی تشبیہات اور استعاروں کا استعمال بڑھنے لگا۔ الفاظ کی تقطیع اور املا پر غور کیا گیا اور مناسب انداز سے انھیں بدلا گیا۔ صنعت ایہام اس دور میں کم ہو گئی۔ فارسی بحروں کا بہ کثرت استعمال شروع ہوا کئی اصناف شعر جو فارسی میں مروج تھے اردو میں رائج ہوئے گویا اس اصلاحی تحریک نے اردو زبان اور اردو شاعری کو اس ڈھنگ سے نکھارا، سنوارا سجایا کہ آج اردو اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہے۔ الفاظ کے عربی فارسی رسم الخط

---

[1] ہندوستانی لسانیات [2] تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ

کی طرف بطور خاص توجہ دی گئی جس کے نتیجہ میں تلفظ اور تشکل کو نیا اعتبار ملا جیسے دکنی میں تسبیح، صحی، بگانہ، دوانہ، لکھا جاتا ہے۔ غلط قرار دیا گیا اور اصلی عربی فارسی املا کی نشاندہی کی گئی مثلاً تسبیح، صحیح، بیگانہ اور دیوانہ ان کے علاوہ حسب ذیل الفاظ کی تشکل و آواز متعین کی گئی۔ مثلاً ستی اور ستی کو "سے" یہ کو "یہ" تجہ کو "تیری" اودھر کو اُدھر" کیدھر کو "کدھر" یاں کو "یہاں" واں کو "وہاں" سے بدلا گیا اور بہت سارے الفاظ ہیں جن کی اصلاح کی گئی۔ اردو کی تاریخ زبان و ادب میں اس اصلاحی تحریک کو "مظہر تحریک" کہا جاتا ہے کیوں کہ حضرت مظہر جان جاناں شہید نے بہت ہی سرگرمی سے اس تحریک کو آگے بڑھایا تھا۔ مظہر شہید کو ابتداء میں مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر بہت جلد انھیں کامیابی ملی اور یہ اصلاحی تحریک زور و شور سے جاری رہی جس کے نتیجہ میں اردو زبان نئے د حیثیت کی حامل ہے۔ ورنہ نہ جانے اس بیچاری زبان کی کیا شکل و صورت ہم تک پہونچتی۔

جدید اردو اور جدید ہندی

بیسویں صدی کے نویں دہے کے پچھلے سال جب ہم اُردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانوں کے روپ میں پا رہے ہیں اور ان کا تقابلی جائزہ لینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو ہمیں لسانی تاریخ کے اوراق پارینہ حیرت سے تک رہے ہوں گے کہ ایک ہی سرچشمہ کے دو دھاروں کو ہم دو الگ الگ کائیوں میں کیوں بانٹ رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ دو زبانیں نہیں بل کہ ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں وہ زبان جسے خسرو نے ہندی سے یاد کیا، ترک فاتحین نے ہندوی کہا، اتر پردیش والوں نے لاہوری، پنجابیوں نے دہلوی، یورپ والوں نے ہندوستانی سے موسوم کیا۔ مغربی ہندی کی "آ" اساس والی بولیوں کی بنیاد پر عربی فارسی اور نواح دہلی کی مختلف زبانوں سے ترکیب پانے والی یہ زبان گویا ہندوستان کے مشترک تاریخی و تہذیبی تسلسل کا ورثہ ہے جس کا وجود محض اتفاقی طور پر عمل میں نہیں آیا بل کہ صدیوں کے تہذیبی اختلاط کے نتیجہ میں ارتقائی عمل کے زیر اثر ہوا ہے۔ یہ زبان ایک طویل ترین سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور تاریخی تسلسل کی آئینہ دار ہے جو ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے آوراد اور جدید سیاسی و مذہبی تغیرات اور اسلام کے ہندوستان پر تہذیبی اثرات کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

گیارھویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک کسی نے بھی "ہندوستانی" کو اردو اور ہندی کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا۔ سبھوں نے اسے ایک جانا ایک مانا بل کہ ہندوستان کی

کہ بل سے گلستہ اور کشمیر سے کینا کماری تک یکجہتی کی حقیقی ترجمان کی حیثیت سے اس کو تسلیم کیا۔ قدما کے نزدیک اُردو اور ہندی کا کوئی سوال ہی نہ تھا سب کے نزدیک یہ ایک زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی میل ملاپ بھائی چارہ کی علامت اور یادگار تھی۔ جسے ہم بہ نظر سہولت ہندوستانی ہی کہیں گے۔
ہندوستانی بنیادی طور پر اسم بامسمیٰ ہے اس کی اصل اور بنیاد ہند آریائی زبانوں پر ہے اس کے ذخیرہ الفاظ میں فارسی اور عربی کے بیش بہا موتی محفوظ ہیں تو دوسری طرف خود ہندوستانی زبانوں کے گراں قدر جواہر بھی ان کے ساتھ موجود ہیں۔ قواعد، صوتیات، اور لسانی خصوصیات پوری طرح آریائی ہیں تو لغات، اسالیب، تراکیب اور روایات میں فارسی کا نمایاں حصہ ہے ہندوستان کے ایک بہت بڑے علاقہ میں ہندوستانی مختلف ناموں سے نشو ونما پاتی رہی دہلی میں دہلوی، گجرات میں گجری اور دکن میں دکنی سے موسوم ہوئی مگر جب دکن سے دوبارہ ادبی شان کے ساتھ شمال پہنچی تو کبھی ریختہ، کبھی زبان اُردو، کبھی اردوئے معلیٰ اور آخر کار اُردو کے نام سے پکاری جانے لگی۔ اُردو دراصل وہی ہندوستانی ہے جو کھڑی بولی پر فارسی کے اثرات کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی بہرحال ہندوستانی اپنے ارتقاء کے ہر دور میں اپنے نام بدلتی رہی لیکن اس کی بنیادی لسانی خوبیوں میں کوئی فرق رونما نہ ہوا بل کہ بہ حیثیت زبان روز بروز نکھرتی رہی۔

ہندوستانی ہی دراصل موجودہ اردو اور ہندی کی بنیاد ہے۔ یوں تو ہندوستان میں بیسوں زبانیں رائج تھیں اور اب بھی مروج ہیں اِن مروجہ زبانوں کی سینکڑوں شاخیں مختلف بولیوں کے روپ میں موجود ہیں مگر "ہندوستانی" کو ان سبھوں میں بے حد وقعت و اہمیت حاصل ہے کیوں کہ ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ اسی سے متعلق ہے۔ یہی حال ماضی میں بھی تھا۔ ہندوستانی میں شعر و شاعری کی حد تک برج بھاشا کی تقلید عام مزاج تھا اور نثر نگاری کے لئے فارسی کا رواج تھا۔ اس لحاظ سے برج اور فارسی دونوں کے مشترکہ چلن کے باوجود ہندوستانی کی اپنی شناخت تھی۔ ہندوستانی میں جو شاعری ہوتی اگرچہ کہ برج کے مزاج پر ہوتی اور تحریری اغراض اور نثری ضروریات کے لئے فارسی ہی مستعمل تھی ہر دو صورتوں میں وہ ہندوستانی کہلاتی۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان باشندگان کے بیچ اس مسئلہ پر کبھی کوئی اختلاف یا دورائیں نہ ہوئیں تھیں۔ سب کے نزدیک ہندوستانی ایک مشترک تہذیب کی علامت تھی۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کے خیال میں سب سے پہلے اُردو ہندی میں اختلاف

کا تصور فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ ابھرا۔ انیسویں صدی کے آغاز پر کلکتہ میں انگریز کمپنی نے اس کو قائم کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکام ہندوستانی زبانوں کو سیکھ کر انتظامی امور کی بہتر نگہداشت کریں علاوہ ازیں مسیحی مذہب کی ترویج و اشاعت کا کام بھی کیا جاسکے۔ متذکرہ بالا کالج میں یوں تو کئی تصانیف اور ترجموں کا کام ہوا لیکن انگریز حکام کی یہاں یہ سیاسی مصلحت تھی کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرکے ان میں پھوٹ ڈال دی جائے تاکہ انکے اقتدار میں استحکام اور سیاسی اغراض کی تکمیل ہوسکے۔ قبل ازیں، ہندوستانی کے رسم الخط کے بارے میں کسی قسم کا کوئی نزاع یا اختلاف نہ تھا۔ فورٹ ولیم کالج والوں نے پہلی بار ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی کہ "وہ اس عام مشترکہ زبان (ہندوستانی) کو اپنی قدیم ادبی زبانوں سنسکرت اور برج بھاشا کے رسم الخط میں لکھیں کیوں کہ فارسی رسم الخط ہندوؤں اور ہندوستانیوں کے لئے بدیسی ہے جس طرح ہندو اور مسلمان صدیوں کے میل جول اور یکجائی کے بعد بھی جداگانہ طرز معاشرت اور ذہنیت رکھتے ہیں ضروری ہے کہ ان کا رسم الخط بھی ان ضروریات اور رجحانات کے مطابق جدا ہو"[1]۔

اس فرقہ وارانہ ذہنیت کے پیدا کئے جانے کے سبب صدیوں کی مشترکہ کوششوں اور گنگا جمنی ورثہ کو سخت دھکا پہنچا۔ یہ تحریک روز بروز زور پکڑنے لگی۔ جب اس لسانی لہر کے زہریلے اثرات کو روکنے کی کوشش کی گئی تو اس طرح کا مطالبہ کیا جانے لگا کہ مسلمانوں کو بدیسی زبان فارسی کے رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط کو اپنا لینا چاہئے۔ بہرحال ان مطالبات اور اس تحریک کے پس پردہ انگریز ذہنیت کی شرارت کارفرما تھی جس کے خطرناک نتائج برآمد ہوئے وہ آپسی اتحاد و بھائی چارہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی وہ جذبہ اخوت جو صدیوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجود تھا آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ ہندو فارسی رسم الخط چھوڑ کر پوری شدت کے ساتھ دیوناگری کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ مسلمان فارسی رسم الخط ہی اپنائے رہے یہ لسانی اختلافات نازک صورت اختیار کرنے لگے۔ سرسید کی اصلاحی تحریک کا غلط مفہوم نکالا جانے لگا۔ کانگریس اپنے رویہ سے اس لسانی تفرقہ کو بجائے مٹانے کے بڑھانے لگی۔ ہندوستانی ایک عجیب و غریب

---

[1] ہندوستانی لسانیات ص ۔ ڈاکٹر زور مرحوم

صورت حال کا شکار ہو گئی۔ وہ دو جدا رسم الخطوں میں بٹ سی گئی۔ دیوناگری رسم الخط کی صورت میں اس کو ہندی کا نام دیا جانے لگا۔ اور فارسی رسم الخط کی بنا پر وہ اردو کہلائی جانے لگی۔ ہندی میں بہ کثرت برج اور سنسکرت کے نامانوس الفاظ کی بھرمار ہونے لگی دن بدن ہندی شدھ ہونے لگی یہ رجحان ہنوز پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف اردو زبان میں فارسی اور عربی الفاظ کی بہتات نے اس زبان کو ہندوستانی بولنے والوں کے لئے گویا اجنبی سا بنا دیا۔

فورٹ ولیم کالج کی ادبی و علمی کاوشوں کا جو بھی انداز رہا ہو مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسی کالج نے ایک صدیوں قدیم مشترک زبان کو ٹکڑے کر دیا۔ اس ضمن میں للولال جی اور شیام سندر داس کی مساعی کو بڑا دخل رہا۔ شروع شروع میں ہندوستانی کی اردو، ہندی تقسیم کا رجحان چند مخصوص حلقوں میں پایا جاتا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ رجحان ایک تحریک کی صورت اختیار کرنے لگا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب جدوجہد آزادی کا ہر طرف غلغلہ تھا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات دن بدن بدلتے جا رہے تھے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد غیر ملکی حکمرانوں کو عظیم خطرہ نظر آنے لگی۔ تب انہوں نے ان دو فرقوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا کیں وہ آگے چل کر زبردست سیاسی اختلافات کی صورت اختیار کر گئے۔ ایسے نامساعد حالات میں زبان اور رسم الخط کے مسائل گویا بے حد اہمیت کے حامل تھے۔ افتراپرداز دانوں نے اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھایا اور ہندوؤں کو دیوناگری اور مسلمانوں کو فارسی رسم الخط اختیار کرنے کے لئے مذہبی جذبات کی آڑ لے کر خوب خوب ابھارا جس کے نتیجہ میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان زبان دو الگ الگ حصوں میں بٹ سی گئی۔ ہندوستانی نے آٹھ صدیوں سے جس مشترک گنگا جمنی تہذیب کی تاریخ کی صورت گری کی تھی اس کے چہرے کو مسخ کر دیا گیا بہرحال رسم الخط کی تبدیلیوں نے اردو اور ہندی کی شکل میں ہندوستانی کو تقسیم کر دیا۔ اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو اور ہندی دراصل ایک ہیں اور وہ ہندوستانی کی جدید شکلیں ہیں جو ہندآریائی زبانوں کی نمائندہ ہیں۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کہتے ہیں۔ "ہندوستھانی" (ہندوستانی کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ہندوستھانی کہتے ہیں) اپنے دو اسالیب ہندی اور اردو کی حیثیت

سے عملاً پورے آریائی ہند کی مسلمہ زبان ہے[1]

ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ انھیں ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ ہندی کو جہاں قدیم ہند آریائی زبانوں سے الفاظ اور مادوں کا قابل لحاظ سرمایہ ملا ہے وہیں دراوڑی اور منڈا زبانوں سے بھی نحوی اعتبار سے مناسبت پائی جاتی ہے جب کہ اردو کو عربی اور فارسی کے ذخیرۂ الفاظ سے بہت کچھ حاصل ہوا رسم الخط، علمی، تہذیبی اور مذہبی اثاثوں کے علاوہ ادبی، ہیئتیں اور بعض مخصوص اسالیب بیان بھی انھیں کا لسانی فیضان ہے جس کی بنا پر اردو کو ایک اچھوتی ادبیت ملی ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو اور ہندی مشترکہ طور پر پورے ملک کی رابطہ کی زبانیں ہیں۔

ڈاکٹر سنیتی چٹرجی نے ہندوستانی کے وجود کو ہنوز تسلیم کیا ہے ان کے خیال میں اردو اور ہندی ہندوستانی کی ادبی اور علمی شکلیں ہیں جب کہ عوام کی عام بول چال میں وہی ہندوستانی زبان زندہ ہے جو کشمیر سے کنیا کماری تک، پنجاب سے بنگال تک آج بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح وہ ہندوستانی کے دو حصوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک ادبی و تحریری حصہ (اردو اور اعلیٰ ہندی) ہے دوسرا حصہ عام طور پر مروجہ عوامی زبان کا ہے جو ملک کے الگ الگ علاقوں میں دوسری بولیوں کے ساتھ گھل مل کر بعض دفعہ اپنا لب و لہجہ بھی بدل دیا کرتی ہے[2]۔

ہندی زبان میں، جہاں قدیم آریائی زبانوں کے لسانی باقیات کی حفاظت کا رجحان ہے وہیں تہذیبی اعتبار سے اس میں ہندوستان کی قدیم روایات معتقدات، مذہبی ادب اور تاریخی ورثہ کے تحفظ کا بھی حساس جذبہ نمایاں ہے اکثر احیاء پسند مصلحین، مذہبی رہنما اور اہل قلم حضرات ہندی کے رشتہ کو قدیم آریائی لسانی سلسلوں سے جوڑ کر اردو سے بالکلیہ جدا قرار دینا چاہتے ہیں جو جذباتیت اور انتہا پسندی کی ایک مثال ہے۔ اردو کا رسم الخط چوں کہ عربی ہے اس میں فارسی زبان کے کچھ حروف اور چند ہندی حروف کے اضافہ کے ساتھ مشکل کیا گیا ہے لہٰذا بعض ماہرین کے نزدیک یہ ایک مسلمان بولی کہلاتی ہے یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی تہذیبی علمی و ادبی سرمایہ زیادہ تر اسی میں ہے تاہم یہ کہنا کہ اردو ان وجوہ کی بنا پر ہندی بھاشا ہے کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا زبان کو کسی خاص طبقہ کے ساتھ جوڑ دینا علمی اور تحقیقی اعتبار سے کچھ

---

[1] ہند آریائی اور ہندی (اردو ترجمہ) سنیتی کمار چٹرجی ص ۱۲۹

[2] مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے ہند آریائی اور ہندی مولفہ سنیتی کمار چٹرجی

صحت مندبات نہیں۔

ہندستانی کو ہم بلاشبہ ہندوستان کی مشترک قدیم آریائی زبانوں کے سلسلہ کی ایک نمائندہ اور آخری کڑی کی حیثیت دے سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہندوستان کو فتح کر لینے کے بعد آریائی زبانوں کے ساتھ عربی فارسی اور ترکی کے اختلاط کی بناء پر اس کا روپ نکھرا الگ بھگ سات سو سالہ لسانی ارتقائی عمل کے بعد اس کی مشترکہ حیثیت مسلمہ ہو چکی تھی عین اسی وقت لیپی کی اساس پر اس زبان کی اردو ہندی کی صورت میں تقسیم نے عجیب و غریب صورت حال پیدا کر دی۔ اردو والوں اور ہندی والوں کی اپنے اپنے رسم الخط کے ضمن میں جذباتیت نے ہندستانی کی شکل کو معدوم کر دیا اور ادبی اور تحریری اغراض کے لئے اس کی دو شکلوں کو فروغ حاصل ہوا تاہم بول چال کی حد تک وہی زبان رائج رہی جو زمانہ قدیم ہی سے استعمال کی جاتی تھی جس کو چیٹرجی نے ہندوستھانی سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے نزدیک۔ "ہندوستھانی (ہندوستانی) کو خاص بنیادی کھڑی بولی کہا جا سکتا ہے جس کے ذخیرہ الفاظ میں (۱) اردو (۲) ناگری ہندی کے درمیان ایک توازن رہتا ہے اس میں کافی فارسی، عربی عناصر ہیں اور یہ سنسکرت الفاظ بھی استعمال کرتی ہے۔ اردو اور ہندی کی خصوصیات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو چند نقاط ابھرتے ہیں جنھیں ملحوظ رکھا جائے تو اس موضوع کے سمجھنے میں آسانی ہوگی

(۱) اردو کا رسم الخط عربی ہے لیکن اس میں حروف کے اضافے فارسی اور ہندی زبانوں سے کئے گئے ہیں جو ہندوستان میں اس کی لسانی مزدوروں کے لئے ناگزیر ہیں۔ اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات اور ان میں روز افزوں زیادتی کا رجحان اس کو ہندی دوستوں سے دن بہ دن دور کرتا جا رہا ہے نیز اردو پر فارسی قواعد کی چھاپ بھی گہری ہوتی جا رہی ہے۔ مرکب الفاظ کے لئے فارسی اضافت کا استعمال، حروف جر مثلاً کے سے وغیرہ کے لئے فارسی الفاظ از اور در کا استعمال روز افزوں بڑھ رہا ہے (مثلاً خود سے، حرف سے کے لئے از خود، از طرف اور میں کے لئے "در" اور فی کا استعمال دراصل (اصل میں) درحقیقت (حقیقت میں) بعض دفعہ فی الحال اور فی الحقیقت)[1]

(۲) "اعلیٰ ہندی یا ناگری ہندی کی قواعد تقریباً وہی ہے جو اردو کی ہے لیکن یہ دیوناگری یا ناگری رسم الخط استعمال کرتی ہے اور یہ دیسی ہندی یا ہندوستھانی (پراکرت) عناصر کا بھرپور استعمال کرتی ہے اس میں ان بہت سے فارسی عربی الفاظ کا بھی استعمال ہوتا ہے جو اب زبان میں گھل مل گئے ہیں لیکن اعلیٰ

---

[1] دیکھئے ہندستانی لسانیات ص ۱۳۷

تہذیبی الفاظ کے لئے یہ سنسکرت کا سہارا لیتی ہے یہ رفتہ رفتہ شمالی ہندوستان کے لئے ہندوؤں کی تہذیب اور تعلیم کی زبان بن گئی [1]

ہندی والوں کو اردو کے متعلق یہ سخت شکایت ہے کہ اس میں عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کی اس قدر کثرت ہے کہ یہ اب اجنبی حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے۔ دوسری طرف اردو والوں کو ہندی زبان میں سنسکرت کے نامانوس الفاظ کی بہتات کی شدید شکایت ہے قبل آزادی اردو اور ہندی کے یہ اختلافات اس قدر وسیع ہو چکے تھے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ ایک دوسرے سے بالکلیہ جدا ہو چکیں تھیں اور ہر ایک اپنی الگ شناخت کے ساتھ ابھر آئی تھی۔ جدوجہد آزادی میں ہندی اور اردو کے شعراء اور مصنفین نے دوش بدوش پوری سرگرمی اور جوش و خروش سے حصہ لیا قومی قائدین کی لسانی پالیسی غیر واضح تھی اس وجہ سے آزاد ہندوستان میں کون قومی زبان اور سرکاری رتبہ کے قابل ہوگی یہ طے نہ کیا جا سکا تھا تاہم کانگریس اور مسلم لیگ کے نظریات کے متصادم دھاروں نے عام ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہوا کے رُخ کا صحیح اندازہ کروا دیا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ حصول آزادی کی قدر مشترک کے باوجود دونوں گروہوں کے اکابرین اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثوں کے تحفظ کے ضمن میں بہت حساس ہو چکے تھے۔ وہ اس سلسلہ میں زبان کے بنیادی کردار کو خوب سمجھتے تھے لہٰذا اس عبوری دور میں ہندوؤں نے ہندی کی ترویج اور اشاعت، ہندی کے سنسکرتی اثاثے کے تحفظ اور تہذیبی سرمایہ کی حفاظت کی خاطر بہت زور و شور سے تحریک چلائی اس کے جواب میں مسلمان اہل قلم حضرات نے اردو کے رسم الخط، ادبی سرمائے، مذہبی ذخائر تہذیبی و تاریخی ورثہ کی توسیع و اشاعت کے ضمن میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بظاہر زبان کے بارے میں کوئی واضح ٹکراؤ یا کشاکش کی صورت نظر نہ آتی تھی مگر اندر ہی اندر یہ چنگاری سلگ رہی تھی جو آزادی کے موقع پر اور اس کے بعد پوری شدت سے بھڑک اٹھی۔ ملک کی سیاسی تقسیم نے جہاں زندگی کے عام سرگرمیوں پر اثر ڈالا وہیں ہندوستان کے صدیوں پرانے مشترک کلچر کو بھی دھکا پہنچایا ہے زبانیں اس نفرت اور بیگانگی کی آگ سے کیسے بچ سکتیں تھیں چناں چہ ملک ہی نہیں بل کہ زبان بھی تقسیم ہو گئی۔ پاکستان کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی۔ ہندوستان میں ہندی کو جن حالات میں قومی اور سرکاری

---

[1] ہندآریائی اور ہندی (اردو ترجمہ) صـ ۱۴۴

زبان کا درجہ دیا گیا وہ جمہوریت کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے کیوں کہ دستور ساز اسمبلی میں اُردو اور ہندی کو برابر، برابر ووٹ ملے تھے محض صدر اجلاس کے ترجیحی ووٹ کی بناء پر فارسی رسم الخط والی ہندوستانی کے مقابل ناگری ہندی کو کامیابی ہوئی اور اس کو سرکاری دفتری زبان کا موقف مل گیا۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ہندآریائی اور ہندی نامی کتاب میں ہندی کے نشو ونما اور ارتقاء کے زیر عنوان اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے [1]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے ہندوستانی لسانیات میں اُردو اور ہندی کے آپسی اختلافات کو نہایت عمدہ ڈھنگ سے واضح کیا ہے اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لئے للولال جی کی پریم ساگر اور ہندی زبان اور ادب سے متعلق شیام سندر داس کی تصنیف اور دیگر کتب کا مطالعہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔

---

[1] ہندآریائی اور ہندی (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۴۴

باب ششم

ہندوستانی (اُردو) کے معمار

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے قبل یہاں عوام وخواص کی زبانیں جداگانہ حیثیت سے ارتقاء پذیر تھیں۔ مذہبی طبقہ نے سنسکرت زبان کو علمی و مذہبی اغراض کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور اس زبان پر سوائے مذہبی پیشواؤں (برہمنوں) اور علماء کے کسی اور کا اجارہ نہ تھا۔ ہندو مت کے احیاء اور برہمنوں کے عروج و اقتدار کے نتیجہ میں سنسکرت پر لگائی گئی پابندیاں اور سخت ہو گئیں تھیں۔ بدھ مت کے اثرات کمزور پڑ چکے تھے جس کے نتیجہ میں پھر ایک بار اعلیٰ طبقہ میں سنسکرت کا بول بالا تھا۔ یہ سنسکرت کے ارتقاء کا اہم ترین دور ہے۔ عوام میں بالعموم پراکرتوں کا رواج تھا۔ پراکرت بھاشاؤں کی طرف برہمنوں کا عدم رجحان انھیں علم و ادب کے خزانوں سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ پراکرتیں عام بول چال کی حد تک ہی تھیں ان میں کسی بھی قسم کا علمی و ادبی سرمایہ موجود نہ تھا کیوں کہ اہلِ علم سنسکرت ہی کو ترجیح دیا کرتے تھے بدھ مت کے عروج کے دور میں البتہ یہ عوامی پراکرتیں کچھ مالا مال ہوئیں جہاں گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے سنسکرت کے بجائے عوام پراکرتوں کو اپنایا جس کے نتیجہ میں انھیں کچھ ترقی ہوئی اور تھوڑا بہت علمی وقار اور ادبی عظمت نصیب ہوئی لیکن بدھ مت کے زوال کے ساتھ ہی پراکرتوں کی ترقی بھی رک سی گئی۔ جو کچھ سرمایہ اب تک اس میں جمع ہو چکا تھا بس وہی اثاثہ باقی رہا یہ پراکرتیں ملک بھر میں مختلف ناموں سے رائج تھیں جن کی تفصیلات گذر چکی ہیں۔ ان سے ہی اب بھرنشاؤں کا جنم ہوا جنھیں بگڑی زبان کا نام دیا جاتا تھا اس ضمن میں بعض ماہرین کا خیال ہے کہ عوامی پراکرتیں بھی جب ادبی و علمی لبادوں میں اپنی شان دکھانے لگیں تو مجبوراً عوام الناس نے انھیں چھوڑ کر ملی جلی زبانوں کی بنیاد پر نئی زبان ایجاد

کر لیتے تھے یہ عوامی کوشش اس عہد میں اپ بھرنش کا نام پاتی ہے۔

بہر حال اپ بھرنشاؤں کے فروغ کے ضمن میں سماجی، معاشی اور سیاسی عوامل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض دفعہ ان کی ترقی کی رفتار انھیں اعلیٰ ادبی مقام پر پہنچا دیا کرتی تھیں چنانچہ ہندوستان بھر میں رائج عام اپ بھرنشاؤں میں دوآبہ گنگ وجمن کی شورسینی اپ بھرنش بلاشبہ پورے شمالی اور شمال مغربی علاقوں کی ادبی زبان کا درجہ پا گئی تھی۔ اسی دور میں جب مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو گویا ایک انقلابی صورت پیدا ہو گئی چونکہ مسلمان یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے۔ اور اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا یہاں ان کے مستقل قیام کی بنا پر بیرون ملک مسلمانوں سے ان کے گہری ملی و سیاسی مراسم کی بنا پر تجارت کو بے حد فروغ ہوا خارجی تعلقات استوار ہونے اہل علم و اہل کمال کی مسلسل آمد کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجہ میں معاشی، تجارتی، زرعی اقتصادی، سیاسی ثقافتی اور مذہبی میدانوں میں ارتقاء کا رجحان نمایاں ہوا ہندوستان والے مختلف کارآمد صنعتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ مسلمانوں نے اپنے خاص فنون کو یہاں رائج کیا اور انھیں خوب ترقی دی مقامی پیشوں اور صنعتوں میں دلچسپی لی۔ مختلف نئی چیزیں ایجاد کیں۔ گویا مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ یہاں کی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ جہاں زندگی کے تمام شعبے مسلمانوں کی آمد سے متاثر ہوئے وہیں زبان و ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جن کا سبھوں کا اعتراف ہے۔

مسلمانوں کی زبان عربی و فارسی کا مقامی زبانوں پر اثر پڑا اور مقامی زبانوں کے اثرات سے عربی و فارسی اپنا دامن نہ بچا سکے چنانچہ پروفیسر شروانی فرماتے ہیں فارسی کا بت دراصل ہندی بودھ کی بگڑی شکل ہے اور کوتوال ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بمعنی مالک قلعہ تھا۔[1] انہوں نے جھلانج، لکھن، سیل اور چندن وغیرہ الفاظ کی بدلیل تفصیل بھی دی ہے۔ المختصر مسلمانوں کو شعر و ادب سے خصوصیت ہے اس وجہ سے انہوں نے ہندوستان کی زبانوں میں اس لحاظ سے بھی نہایت گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجہ میں بلا کسی تاخیر کے انہوں نے ہندوستانی زبانوں میں فارسی کے خطوط پر شعر و سخن کو رواج دیا اور روز بروز اسے ترقی دی اور ساتھ ہی مقامی زبانوں کے ارتقاء

---

[1] پنجاب میں اردو صد ۲۹

میں بھرپور حصہ لیا مغرب کی اکثر زبانیں اس کی بہترین مثالیں ہیں جیسے سندھی، پشتو، کشمیری، اور پنجابی وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں دیگر زبانوں کی ادبی شان بنانے میں ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمانوں کا حصہ کا اعتراف برنج' اودھی' گجراتی اور بنگالی کے اہرین زبان کرتے ہیں مسلمانوں کی آمد کے وقت شورسینی اپ بھرنش کی ادبی حیثیت مانی جانے لگی تھی جس کی پنجاب میں جانشین مغربی ہندی ہوئی کھڑی بولی یا (موجودہ اردو' ہندی) ہندوستانی بھی اسی سے نکلی ہے۔ ظاہر ہے جب مسلمانوں کا پہلا قدم پنجاب میں پڑا تھا تو شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہوئی زبانیں کس طرح انھیں متاثر نہ کرتیں۔ چناں چہ ایسا ہوا مسلمانوں نے فارسی مزاج پر ہندی میں شعر گوئی کا آغاز کیا تو انھیں مقامی ہندی زبانوں کو ہی اپنایا۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی میں شعر و شاعری کی اور نثری تخلیقات میں ہندی الفاظ کا برملا استعمال شروع کیا۔ اس کا ثبوت صوفیاء کرام کے وہ اقوال اور فقرے ہیں جو مختلف تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ مختلف محققین مثلاً سر جارج ابراہیم گریرسن، ٹرول بلوک' محمد حسین آزاد' پروفیسر شیرانی' پروفیسر احتشام حسین' بابائے اردو عبدالحق' پروفیسر مسعود حسین خاں' گیان چند جین جی' ڈاکٹر زور' پرکاش مولن وغیرہ نے نہایت تلاش و جستجو سے اس بارے میں مواد فراہم کر دیا ہے جن کا اجمالی تذکرہ بھی طوالت کا باعث ہوگا۔ بہرحال ہندوستانی کی پیدائش سے پہلے بھی ہندی میں ادبی رجحانات ملتے ہیں چنانچہ ہندی ادبیات کے چند قدیم نمونے اس کا ثبوت ہیں۔ اس ضمن میں ترپتی نالہ کی مسل دیو راسو اور چند بروائی کی پرتھی راج راسو بے حد مشہور ہیں [1]

پروفیسر شیرانی نے حضرت خواجہ مسعود سعد سلمان کو ہندی کے مسلم شعراء کا سرتاج مانا ہے۔ جنھوں نے بارہ ماسہ سب سے پہلے لکھی۔ مسلمانوں کے پنجاب سے تعلقات سب سے پہلے قائم ہوئے اسی وجہ سے ہندی زبانوں میں پنجابی کو مسلمانوں کی سرپرستی کا اعزاز حاصل ہے! البعد دہلی اور اطراف واکناف کی ہندی زبانوں کے نام آتے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کی سرپرستی صوفیا اور مشائخ عظام نے بھرپور انداز سے کی انہوں نے اپنی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کے لئے بیرونی اور ہندستانیوں کے لئے نامانوس زبانوں کے بجائے مقامی زبانوں کو ترجیح دی اس ضمن میں حضرت بابا شیخ فرید الدین

---

[1] بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۱

مسعود گنج شکر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت امیر خسرو، حضرت روشن چراغ دہلوی، حضرت بوعلی شاہ قلندر، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت حسین شاہ جون پوری اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح کے نام بطور خاص لئے جا سکتے ہیں [1] ہندوستانی (اردو) کے اولین معماروں میں چند یہ ہیں۔

چند بردائی

چند بردائی کو ہندی کا اولین شاعر مانا گیا ہے۔ چند بردائی دہلی کے راج پوت راجہ پرتھوی راج کا عزیز دوست، وزیر، حکومت اور درباری شاعر تھا "پرتھوی راج راسو" اس کی مشہور و معروف تصنیف ہے جو ڈھائی ہزار صفحات اور (۶۹) ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں تمام قدیم مروجہ بحریں ملتی ہیں۔ اس میں پراکرت اور اپ بھرنش کے اسما و افعال کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بھی الفاظ ملتے ہیں۔ پرتھوی راج راسو کی قدامت اور چند بردائی کی تصنیف ہونے کے بارے میں شدید اختلاف پائے جاتے ہیں۔ یوروپی محققین کے علاوہ ہندی اور اردو کے ماہرین کے خیالات اس بارے میں متصادم ہیں اس لحاظ سے "راسو" ایک مشتبہ تصنیف قرار پاتی ہے [2]

پروفیسر ٹیسی ٹوری نے مشہور ہندی پنڈت شیام داس جی کے حوالے سے اس کو مشتبہ ٹھہرایا ہے [3]۔

مراری دھن جودھپوری نے بھی اسے جعلی قرار دیا ہے جب کہ پنڈت ہریشاد شاستری اس کی قدامت کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے چند تاریخی و لسانی شہادتوں کی بناء پر اس کو چند بردائی کی تصنیف مانا ہے البتہ اس میں بعد کے دور میں ہونے والے الحاق و اضافہ سے بھی انکار نہیں کیا ہے۔ پرتھوی راج راسو، سلطان شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج کے درمیان معرکہ آرائی اور پرتھوی راج کی مدح و تعریف میں لکھی گئی ہے۔

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۱۱۲

[2] پنجاب میں اردو ص ۱۱۴ [3] تفصیلات کے لئے پنجاب میں اردو اور مقدمہ تاریخ زبان اردو ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت امیر خسروؒ

طوطی ہند حضرت امیر خسرو اردو ہندی (ہندوستانی) کے مسلّمہ طور پر پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ خسرو صاحب دیوان شاعر تھے انہوں نے سب سے پہلے اُردو الفاظ ادبی اغراض کے لئے استعمال کئے اور سب سے پہلے اردو میں شعر کہا سب سے پہلی غزل بھی ان سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک مصرع فارسی میں اور ایک اردو میں ہے۔ ہندوستانی ادبیات میں خسرو کی حیثیت مثل آفتاب ہے ان کی تصانیف کی تعداد ننانوے بتائی جاتی ہے۔ مشہور محقق وحید مرزا اپنی کتاب امیر خسرو میں صرف اکیس ۲۱ تصانیف کو حضرت امیر سے منسوب کیا ہے۔ ان کے اشعار کی تعداد آج تک تحقیق طلب ہے۔ تاہم ۲½ لاکھ سے کم نہیں ہیں۔ وہ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کے کمالِ فن کا ہر ایک معترف ہے امیر خسرو کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ انھیں کئی فنون میں دخل تھا۔ ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی امیر خسرو کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے فارسی اور ہندی موسیقی کو ہم آہنگ کیا۔ اور اس میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ ہندی کلام کے علاوہ اکثر پہیلیاں مکرنیاں، دوسخنے اور دوہرے بھی حضرت امیر خسرو سے منسوب ہیں۔ وہ شمالی ہند کے ضلع میں پیدا ہوئے مختلف بادشاہوں کے درباروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء سے ارادت رکھتے تھے۔ حضرت امیر خسرو کی گوناگوں صلاحیتوں کی بناء پر شاہان وقت اور پیر و مرشد نے ان کی قدر افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ امیر خسرو کی تصانیف میں "خالق باری" بڑی شہرت رکھتی ہے۔ امیر خسرو کے کلام ان کی تصانیف اور ان سے منسوب ادبی سرمائے کا لسانیاتی جائزہ مختلف ماہرین نے لیا ہے۔ خسرو کی شخصیت اور فنی کمال کا اعتراف ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ خسرو کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ خسرو اُردو کے اولین معماروں میں سرِ فہرست نظر آتے ہیں انہوں نے ہندوستانی زبان کو روحانی غذا کرنے میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ خسرو کے کلام کی قدامت اور ان سے منسوب چیزوں کے بارے میں پروفیسر شیرانی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب اور دیگر محققین نے گراں قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ موخر الذکر نے خسرو کی ہندی شاعری کا پہلا مستند ماخذ جبھی کی سب رس کو مانا ہے [۱۵]

امیر خسرو کا ہندی کلام آج بڑی شدت سے موضوع بحث بنا ہوا ہے مختلف لوگ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ امیر خسرو ہندی کے گہوارے میں پیدا ہوئے تھے اور بچپن ہی سے دہلی کے ادبی ماحول میں سانس لیتے رہے ظاہر ہے ان کی مادری زبان ہندی تھی۔ انہوں نے ہندی زبان پر عبور حاصل تھا۔ جس کا ثبوت ان سے منسوب ہندی کلام ہے۔ مگر بدقسمتی سے ان کے ہندی کلام کے مستند نمونے گنے چنے ہی ملتے ہیں [1]

ڈاکٹر پرکاش مونس نے لکھا ہے کہ "ہمارے نزدیک دوہوں چار قطعات اور ایک ترکنہ غزل کے علاوہ امیر خسرو سے جو بھی ہندی کلام منسوب ہے اس کی صحت کی کوئی توثیق نہیں ہوتی" [2]

امیر خسرو کے کلام کی قدامت کے بارے میں دو نظریات ملتے ہیں بعض چند لسانی حقائق کی بناء پر اس کی قدامت کے قائل ہیں بعض اس کا ابطال کرتے ہیں بہرحال امیر خسرو کو ذاتی طور پر ہندی سے لگاؤ تھا جس کے نتیجہ میں انہوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی شاعری کی ہے جس کا تاریخی ثبوت بھی ملتا ہے یہ اور بات ہے کہ بعد والوں نے بہت سارا کلام محض جوش عقیدت میں ان سے منسوب کر دیا ہو۔ زبان کے لسانیاتی تجزیے کی بنیاد پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب وغیرہ ہم نے امیر خسرو کے بہت سے ہندی کلام کی قدامت مشتبہ قرار دیا ہے۔ امیر خسرو کو اپنے پیر و مرشد سے والہانہ عشق تھا۔ پیر کے انتقال کے وقت وہ سفر بنگال پر تھے جب واپس ہوئے تو پیر کی مزار کو دیکھ کر ایک دوہا کہا اور بے ہوش ہو گئے [3]

گوری سوئ سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے اور سانجھ بھئی چو دیس

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین کا عرس اسی دوہے سے شروع ہوتا ہے۔ [4]

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح کا نام اردو زبان بالخصوص دکنی زبان کے عظیم المرتبت معماروں کی فہرست آتا ہے آپ دہلی میں ۱۳۲۱ء میں غیاث الدین تغلق کے دور میں پیدا ہوئے [1] چنانچہ صوفیاء کے سلسلوں میں آپ سے زیادہ بڑا کوئی اور مصنف نظر نہیں آتا آپ کی تصانیف کی تعداد (۱۰۵) بتائی جاتی ہے جن میں معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود، شکار نامہ، رسالہ سہ بارہ وغیرہ علم تصوف میں بے حد مشہور ہیں۔ حضرت بندہ نواز نے تصنیف و تالیف کے لئے زبان دہلوی کے بجائے دکنی کو اختیار کر کے دکن میں اردو کی ترویج و اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ آپ کو شعر و سخن سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق اور آقا حیدر حسن صاحب نے حضرت خواجہ کی بعض نظمیں شائع کی ہیں جو دکنی زبان کے قدیم نمونوں کی عمدہ مثالیں ہیں "تذکرہ اردو مخطوطات" میں ڈاکٹر زور مرحوم نے حضرت خواجہ صاحب کے چکی نامہ کا تعارف کرایا ہے اس میں بارہ بند ہیں۔ یہ بھی دکنی زبان کا عمدہ نمونہ ہے [2]

"مصنف کی حیثیت سے حضرت خواجہ بزرگ کی شہرت کا مدار رسالہ "معراج العاشقین" پر قائم تھا جسے اردو کی قدیم ترین تصنیف کا خیال کیا جاتا تھا۔ جسے ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے ۱۹۲۴-۲۵ء میں شائع کیا تھا۔" لیکن ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ۱۹۶۸ء میں "معراج العاشقین کا مصنف" کے زیر عنوان کتاب میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ یہ حضرت خواجہ کی تصنیف ہے بلکہ بہت بعد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی ہے [3]۔

---

[1] علی گڈھ تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۱۵۲ بحوالہ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر، پرکاش مونس

[2] دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۵۰

[3] دیکھئے معراج العاشقین کا مصنف مصنفہ ڈاکٹر حفیظ قتیل

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اگرچہ کہ معراج العاشقین کے اسلوب اور زبان کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے تاہم بعض اہم لسانی پہلوؤں، زبان، قواعد، الفاظ، محاروں اور موضوع کے اعتبار سے بابائے اردو کا موقف بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل مرحوم کے علاوہ کسی اور محقق نے ابھی اس بارے میں کوئی قابل لحاظ مواد فراہم نہیں کیا ہے ۱۹۶۸ء کے بعد سے تمام لوگوں نے ڈاکٹر صاحب محترم کی تحقیق پر ہی انحصار کیا ہے یہ نظریہ مزید تحقیق طلب ہے جب تک اس ضمن میں مزید تحقیقاتی مسالہ نہ مل جائے کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی لہذا معراج العاشقین کو حضرت خواجہ بندہ نواز رح کی تصنیف نہ ماننے کا کوئی جواز سوائے متذکرہ صدر نظریہ کے نظر نہیں آتا۔ بہرحال حضرت خواجہ بندہ نواز رح گیسو دراز کو اردو کے محاروں میں ممتاز مقام حاصل ہے بعض لوگ آپ کو صرف دکنی ادب کی حد تک تسلیم کرتے ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے آپ کی عمر کا بہت بڑا حصہ دہلی میں گذرا جہاں سے آپ بہ عمر (۸۲) سال دکن آئے اور عمر کا آخری دور یہاں گذارا۔ ہندوستانی کی وہ شاخ جو دکن پہنچی دکنی سے موسوم ہوئی۔ اس لحاظ سے حضرات خواجہ چلہے دہلی میں رہیں یا دکن آئیں آپ کی تصانیف زیادہ تر مقامی زبانوں کے رنگ ہی میں دکھائی دیتی ہیں جو اس عہد کی صوفیاء کی تبلیغی و اشاعتی و تعلیمی پالیسی کا حصہ تھی۔ فارسی کے بجائے ہندوستانی زبانوں میں اظہار خیال کے رجحان نے اردو کی ترقی و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔

کبیر داس

ہندوستانی کے ارتقاء میں کبیر داس جی کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے کبیر بنارس کے رہنے والے تھے ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گذرا۔ کبیر ایک درویش صفت، صوفی منش اور انسانیت کے علمبردار انسان تھے ان کا دردمند دل ہمیشہ انسانوں کے درمیان پیار و محبت اور بھائی چارہ کے جذبات کو فروغ دینے کے لئے مچلتا رہتا تھا۔ کبیر فطری طور پر ایک شاعر تھے انہوں نے اپنے اس وسیلۂ اظہار کے ذریعہ انسانیت کی عظیم خدمت کا فریضہ انجام دیا۔ کبیر چونکہ ساری زندگی مختلف مقامات پر گھومتے رہے لہذا انھیں نت نئی زبانوں اور بولیوں سے سابقہ پڑتا رہا لیکن انہوں نے اس زبان کو شاعری کے لئے منتخب کیا جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اس ملی جلی زبان کو آج ہم ہندوستانی (موجودہ اردو ہندی) کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں اگرچہ کبیر پوربی زبان

ہی کے نمایندہ مانے جاتے ہیں مگر اس پر کھڑی بولی کے اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ کبیر کے پاس زبان کا وہ نقش ملتا ہے جو ہندوستانی بولیوں کی کثرت میں وحدت کو تصور کو ابھار رہا تھا کبیر داس کے کلام اور زبان کے نمونے ہمیں تقریباً تمام ماہرین ہندوستانیات کے پاس ملتے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے کبیر داس کی زبان کا تجزیاتی مطالعہ کرکے کبیر کو ہندوستانی کے معماروں میں ایک ممتاز جگہ دی ہے [1]

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے کبیر کی تصانیف کو برج کے بجائے ملی جلی زبان میں مانا ہے کیوں کہ پنجاب والوں کے لئے برج کے مقابل ہندی زبان زیادہ قابل قبول تھی۔ وہ کہتے ہیں۔ "سکھ گروؤں کے بھگتی گیتوں کی زبان اس کا ثبوت ہے کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب کے شاعروں کی پنجابی / ہندوستانی / برج کے امتزاج اور کبیر کی زبان سے ہندی یا ہندوستانی کے ادبی استعمال کا امکان ایک امر واقعہ بن گیا تھا [2]

کبیر داس کا عہد ہندوستانی زبانوں کی تاریخ میں اہم ترین مانا جا سکتا ہے کیوں کہ تہذیبی اختلاط اور مذہبی ارتباط کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش کا رجحان اپنے عروج پر تھا۔ چناں چہ کبیر کے پاس فارسی عربی الفاظ کی کثرت اس بات کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ۵ فی صد اور پروفیسر محمود شیرانی نے کبیر کے پاس (۱۰) فی صدی فارسی الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔ کبیر کی ملی جلی زبان بلاشبہ اردو سے بے حد نزدیک ہے کبیر فارسی کے محاوروں کا بلا تامل استعمال کرتے ہیں [3]۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار ص ۳۴۳ میں کبیر داس کو اپنے دادا شیخ سعد اللہ کے حوالے سے موحد تسلیم کرتے ہیں۔ کبیر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یکساں مقبول تھے۔ کبیر توحید پرست تھے انہوں نے بت پرستی کی بیخ کنی کی ان کے فلسفہ کے گہرے اثرات آج بھی ہندوستان کے مختلف نئے مذاہب پر ملتے ہیں۔ ان کی تصنیفات سے چند ریختے بھی مشہور ہیں کبیر داس کی

---

[1] دیکھئے مقدمہ تاریخ زبان اردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔

[2] ہندآریائی اور ہندی (اردو ترجمہ) ص ۱۷۵۔

[3] پنجاب میں اردو۔

تصانیف اور شعری سرمائے کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں تاہم ان کی شعری ادبی اور علمی صلاحیتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

گرونانک

سرزمین ہند میں جن مذاہب نے جنم لیا ان میں بدھ مت، جین مت، وغیرہ قدیمی حیثیت رکھتے ہیں حالیہ عرصہ میں جس نئے مذہب نے ہندوستان کے لاکھوں لوگوں کو متاثرہ کیا وہ سکھ مت ہے جس کے بانی گرونانک جی تھے۔ گرونانک کے کلام میں پنجابی کے دوش بدوش برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اسماء افعال اور ضمائر ملتے ہیں ان کا کلام نام دیو اور کبیر داس ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے گرونانک کی مادری زبان پنجابی تھی۔ لیکن ان کے مستند کلام میں جو گرو بانی کی حیثیت سے کلام الٰہی کا حکم رکھتی ہے [1]

ونیز دیگر سکھ گروؤں کے کلام میں روایتی برج کے ساتھ ساتھ زبان دہلوی کے اثرات نمایاں ہیں۔ کبیر داس کی طرح گرونانک کے پاس بھی عربی، فارسی الفاظ کی بہتات ہے فارسی محاوروں کو وہ بھی بلا تکلف برتتے ہیں۔ گرو گرنتھ صاحب میں بعض اشعار اردو دوہے من وعن فارسی کے شامل ہیں۔ گرونانک جی کا کلام گرنتھ صاحب کے پہلے حصہ "جپ جی" کی حد تک اناجانا ہے دوسرے حصے بعد والے گروؤں نے گرو دیو ہی کے تخلص کو استعمال کر کے شامل کر دیئے ہیں۔ خسرو، نام دیو، بندہ نواز، کبیر داس اور گرونانک کی زبان ہی دراصل وہ اساس ہے جس پر اردو زبان کی پوری شاندار عمارت کھڑی کی گئی۔ اردو کی ابتدائی صورت گری تشکیل اور نشوونما میں جہاں ہمیں بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے لے کر گرونانک تک کے نام ملتے ہیں وہیں ہندوستان کے طول وعرض میں اور بہت سے باکمال لوگوں کا حال ملتا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی طرح اردو کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا ہے۔

تغلق کے عہد میں پایہ تخت کی منتقلی کے واقعات کی بناء پر انتقال آبادی اور گجرات اور دکن کی قبل ازیں فتح کے سبب "زبان دہلوی" گجرات اور دکن پہنچ چکی تھی اور ان علاقوں

---

[1] دیکھئے مقدمہ تاریخ زبان اردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میں اپنے اپنے ڈھنگ سے ارتقائی زینے طے کر رہی تھیں۔ گجرات اور دکن کے علماء فاضلین صوفیا اولیاء شعراء و مصنفین نے اس کی ترقی میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا جس کی بناء پر شمالی ہند کی زبان کے مقابل گجری اور دکنی میں تیز رفتاری سے ادبی سرمائے کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اردو کی تعمیر و ترقی میں اولیاء کرام صوفیا کے علاوہ امراء و رؤسا اور بادشاہوں نے بھی خصوصی دلچسپی دکھائی جن کی تفصیلات سے زبان و ادب کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

اُردو کی ترویج اشاعت اور ارتقاء میں گجرات کے حصہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گجرات کے رہنے والے مشہور بزرگ شیخ خوب محمد چشتی کی اُردو شعری خدمات کے ذکر کے بغیر اُردو کی نشو و نما تفصیلات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" ۱۰۱۸ھ کی مشہور تصنیف ہے گجرات کے صوفیا اور بزرگ اپنے خیالات کا اظہار اور تعلیمات کے لئے ہندوستانی ہی کو استعمال کرتے جس کی تفصیلات پچھلے صفحات پر گزر چکی ہیں۔

فرہنگ

A	ذہنی عوامل
ACUTELY ACTIONS	
AFFINITY	وسیلہ
AIR	ہوا
ALBANIAN	البانوی
ALCOHOL	الکحول
ALPHABATIC	حروف تہجی
AMERICAN LANGUAGES	امریکی السنہ
ANALATIC	تحلیلی
ANALOGY	مماثلت
ANIMALS	حیوانات
ANTHROPOLOGY	بشریات
APBHRANSH	اپ بھرنش
ARABIC	عربی
ARAMAIC	آرامی
ARAON	ارادن
ARIANS	آریا
ARDH - MAGDHI	اردھ ماگدھی
ARMENIANS	ارمینی
ARRACK	الحرق
AROBA	الربع
ASSAMESE	آسامی
ASSOCIATIVE SIGNS	مجازی تعبیرات
AUSTRALIAN	آسٹریلیائی
BALTIC	آسٹرک

B	
BABYLONIAN	بابلی
BAGHELI	بگھیلی
BAINTAT	بائن ٹاٹ
BALTIC	بلقانی
BENGALI	بنگالی
BHOJPURI	بھوج پوری
BHOMEJ	بھومیج
BIHARI	بہاری
BRIJ	برج
BUNDELI	بندیلی
BUNTU LANGUAGES	بانتو السنہ
BURMESE	برمی
BY THE FORM OF CONVERSATION	طرز تخاطب کے سبب
C	
CELLS	خلیے
CELTIC	سیلٹک
CANADA	کینیڈا
CAPACITY	صلاحیت
CASBAH	القصبہ
CHATISGARHI	چھتیس گڑھی
CLASSIFICATION OF LANGUAGES	زبانوں کی تقسیم

RekhtaDownload.com

COFEE	قہوہ
COMMUNICATION	ابلاغ
COMMENCEMENTOF LANGUAGES	زبانوں کی ابتدا
COMMONSENSE	حس مشترک
COMPARATIVELINGUISTICS	تقابلی لسانیات
CONCEALED	مبہم
CONCEPTION	خیال
CONSTRUCTION	تعمیر
CONTRIBUTION OF ARTS & SCIENCE	علم و فنون کا حصہ
CONVERSATION	تکلم
CUSTOMARY	مروّج
CURSIVE WRITING	رواروی خط
D	
DERIVATIVE	اشتقاقی
DERIVATIVE	صوتی انحراف
DELIBERATELY	قصداً
DESCRIPTIONS	تحریر
DESCRIPTIVE LINGUISTICS	توضیحی لسانیات
DESTRUCTION	تخریب
DICTIONARY	لغت
DISCLOSURE	اظہار
DING DONG THEORY	گھنٹیوں کا نظریہ
DIVINITY THEORY	الوہی نظریہ
DRAVIDIANLANGUAGES	دراوڑی السنہ
DURRAH	الذرہ
E	
EARTHENVESSELS	خزف ریزے
ETHNOLOGICALREASONS	نسلی محرکات
EVOLUTIONOF LANGUAGES	زبان کا ارتقاء
EVIDENT	واضح
EVOLUTION	ارتقاء
EVOLUTIONARYACTIONS	ارتقائی عوامل
EXCHANGES OF WORDS	الفاظ کے تبادلوں کے سبب
EXPLANATIONS	تشریحات
EXTERNALGROUPS LANGUAGES	بیرونی گروہ کی زبانیں
ENGLISH	انگریزی
F	
FACULTY OFMEMORY	حافظہ
FACULTY OF IMAGINATION	واہمہ
FOETUS	جنین
FOOD	غذا

RekhtaDownload.com

FORMATION OF WORDS	الفاظ کی تشکیل
G	
GANDA	گھونڈو
GAUDA	گونڈ
GENERATION	توالد و تناسل
GERMAN	جرمن
GEOGRAPHICAL REASONS	جغرافیائی اسباب
GRAMMATICAL CLASSIFICATION	قواعدی تقسیم
GRADUALLY	تدریجی
GREEK	یونانی
H	
HABITS	خصلتیں
HAMITIC LANGUAGES	حبشی زبانیں
HAREM	الحریم
HARYANI	ہریانی
HINDUSTANI	ہندوستانی یا کھڑی بولی
HISTORICAL LINGUISTICS	تاریخی لسانیات
HYPOCRISY	تصنع، منافقت
I	
IMITATIVE	تقلید پسند
INDO-ARIAN	ہند آریائی
INDO-CHINESE	ہند چینی
INDO-EUROPEAN	ہند یورپی
INDO-IRANIAN	ہند ایرانی
INACTIVITY	جمود
INTERAL GROUP LANGUAGES	اندرونی گروہ کی زبانیں
INTENTION	مافی الضمیر
INTERPRET	ترجمانی
INTERJECTIONAL THEORY	نجائی نظریہ
INVENTOR	موجد
IRISH	آئرش
ITALIAN	اطالوی
IMAGINED	متوہم
INTERNAL SENSE	حواس باطنی
IMAGINATION	تصور
INTENTATIVE	ارادی
INFANCY PERIOD	عہد طفولیت
J	
JAIPURI	جے پوری
JAR	جرۃ
JIPSY	جپسی

K

KANNARESE کنڑی

KIRGHIZ کرخ

KOSALI کوسالی

KOLLIAN کول

L

LANGUAGE زبان

LANGUAGE FAMILIES زبان کے خاندان

LAHNDA لہندا

LINGUAL لسانی

LINGUISTICS لسانیات

LINGUISTIC ACAMEDIES لسانی اکیڈیمیاں

LINEAR WRITING

LIMERGIC CLASSIFICATION خاندانی تقسیم

LITERALLY CAUSES علمی اسباب

M

MAGOHI ماگدھی

MAHARASHIRY مہاراشٹری

MALYALAM ملیالم

MALYO-POLYNESIAN LANGUAGES ملایائی خاندان السنہ

MALAYSIEN ملیشیائی

MAGHI مگہی

MATHELI متھیلی

MALVI مالوی

MEANING مفہوم

MANKIND انسان

MARATHI مرہٹی (جنوبی جتھہ)

MENARI میناڑی

MEWATI میواتی

MEXICO میکسیکو

MEDIATIONS وسائل

MIDDLE AGED کہولت

MIDDLE AGES عہد وسطی

MIDDLE GROUP LANGUAGES درمیانی گروہ کی زبانیں

MANUMENTAL WRITING آثاری خط

MORPHOLOGY تشکیلیات

MUNDA LANGUAGES منڈا خاندان السنہ

MUNDAL منڈل

MOND SYLLABIC یک لفظی

N

NATURE فطرت

NATURAL THEORY فطری نظریہ

NATURAL CAUSES طبعی اسباب

NEPALI نیپالی (پہاڑی جتھہ)

NEGRITE	نیگریٹ
NATURAL PHENOMENON	مظاہر فطرت
O	
OLD AGE	ضعیفی
ONOMATOPOEIC THEORY	صورت تقلیدی نظریہ
ORGANS	اعضاء
ORGANIC	ترکیبی
ORTHOGRAPHY	املا
OSINIAN	اوشینیائی
ORIYA	اڑیا
P	
PARTICULARS	جزئیات
PALI	پالی
PATHAGONIC	جھنکار نظریہ
PRAKARAT	پراکرت
PERSIAN	ایرانی، فارسی
PEN	قلم
PENCIL	پنسل
PERCEPTION	احساس
PHOMETICS	صوتیات
PHONOLOGY	ارتقائی اصوات
PHONOMICS	صوت تجزیہ
PHYSIOLOGY	علم الاعضاء
PHONETIC CHANGES	صوتی تغیرات

PHRASEOLOGICAL REASONS	طرز ادائیگی کے سبب
PHRASEOLOGY	وضع اصطلاحات
PICTORIAL WRITING	تصویری خط
PRIMARY SIGNS	حقیقی تجیرات
POETRY	نظم
POLYNESIAN	پولی نیشیائی
POPWAN	پاپوان
POLITICAL REASONS	سیاسی اسباب
POWER OF VISIONS	قوت باصرہ
POWER OF SPEECH	نطق
PROSE	نثر
PUNJABI	پنجابی
PUSHACHA	پشاچہ
PURIFICATIONS	تزکیہ
PUSHACHI	پشاچی
PHYSIOLOGY	علم الحیات
Q	
QUANOJI	قنوجی
R	
RAJMAHALI	راج محلی
RATHASTHANI	راجستھانی
RAPTURE	وجدان
RELIGIOUS CAUSES	مذہبی وجوہات
RELIGIOS REASONS	مذہبی اسباب

REVOLUTIONARY CHANGES تغیرات

REBEC الرباب

ROLE کردار

S

SANTHALI سنتھال

SAFARI سفری

SAFFRON زعفران

SANSKRIT سنسکرت

SCRIPT رسم خط

SENSE OF TOUCH قوت لامسہ

SENSE OF TASTE قوت ذائقہ

SENSE شعور

SENSES حسیات

SEMITIC LANGUAGES سامی زبانیں

SEMENTICS معنیات

SINHALI سنہالی

SIAMESE سیامی

SIGN اشارہ

SOCIALOGY عمرانیات

SOLITARY منفرد

SORTS OF WORD نقطہ کی قسمیں

SOUL روح

SOCIAL REASONS سماجی اسباب

SOUND صوت

SOUTH AMERICAN جنوبی امریکہ

SPEECH ORGANS اعضائے تکلم

SEMITIC سامی

SPIES جاسوس

SPECIES اصناف

SPERM نطفہ

SUBSITENCE معیشت

SUDANIC سوڈانی

SWAHALICIANGUAGE سواحلی زبان

SHORSINI شورسینی

SINDHI سندھی

SYNTAX نحو

SOCIAL مدنی الطبع

T

TASMANIAN ٹاسمینائی

TAMIL ٹامل

TELUGU تلنگی

THE FIVE SENSE حواس خمسہ

THE FACULTY OF HEARING } قوت سامعہ

TOTONIC ٹیوٹونی

TRANSMISSION ترسیل

U

UNIVERSE کائنات

V	ویدک دور	Z
VEDIC PERIOD		
VARIETY	تنوع	ZONAL CLASSIFICATION OF INDO ARIAN LANGUAGES
W		
WATER	پانی	
WORD	لفظ	
Y		
YAJ	کوئی ہاں یا ہو	
YO HE YO THEORY	محنت کے نعرہ کا نظریہ	
YOUTH PERIOD	عہد شباب	

ہند آریائی زبانوں کی مکانی تقسیم

لسانیاتی اصطلاحات

ALPHABETS	ابجد / ہجا	RECONSTRUCTION	بازتعمیر
ALPHABETIC	ابجدی	MEANINGFULG	بامعنی
FUNCTURE	اتصال	DESTRIBUTION	بٹوارہ تقسیم
CONSTITUENTS	اجزا	STOP	بندشیہ
NOUN	اسم	DIALECT	بولی
GERUND	اسم مصدر	BACICVOINEL	پچھلا مصوتہ
GESTURE	اشارہ	LATERAL	پہلوئی
DERIVATION	اشتقاق	SPLIT	پھوٹ
DERIVATIONAL	اشتقاقی	PALATAL	تالوئی
TERMINAL	اختتامی	CHANGE	تبدیلی
ENDING	اخیریہ	ANALYSIS	تجزیہ
MINIMALJUNCTURE	آلۂ اتصال	COMMUNICATION	ترسیل
MINIMAL PAIR	آلۂ جوڑا	GRAPH	ترسیم
UNIT	اکائی	MODIFICATION	ترمیم
FRONT VOWEL	اگلا مصوتہ	FORMATION	تشکیل
DERIVATION	انحراف	FORMATIVE	تشکیلی
MERGER	انضمام	INFLECTION	تصریف
NASAL	انفی	INFLECTIONAL	تصریفی
KYCALIZATION	انفیت	VARIATION	تغیر

BILABIAL	دولبی
DIPHTHONG	دہرا مصوتہ
STRUCTURE	ڈھانچہ/ساخت
VOCABULARY	ذخیرۂ الفاظ
SCRIPT	رسم خط
FORM	روپ، ہیئت
LANGUAGE	زبان
STRESS	زور
PREFIX	سابقہ
ACOUSTIC	سمعی
MORPHOLOGY	صرف/علم الصرف
MORPHEME	صرفیہ
SOUND	صوت
SYLLABLE	صوت/کن
SYLLABIC	صوت/کنی
PHONETIC	صوتی/صوتیاتی
PHONETICS	صوتیات
PHONETIC CHANGE	صوتی تبدیلی
PHONETIC SCRIPT	صوتی رسم خط
PHONEME	صوتیہ
PHONOLOGY	صوتیات
CLASS DIALECT	طبقاتی بولی
PASSIVE VOICE	طور معروف
LONG	طویل

COMPARATIVE	تقابلی
CONTRASTIVE	تخالفی
CLASSIFICATION	تقسیم/درجہ بندی
METATHESES	تقلیب (صوتی)
FREQUENCY	تکرار
REDUBLICATIVE	تکراری
SPEECH	تکلم/کلام
ARTICULATION	تلفظ
ARICULATORY	تلفظی
SENTENCE	جملہ
GENDER	جنس
PEARL	چولی
CASE	حالت
GENITIVE CASE	حالتِ اضافی
OBLIQUE CASE	حالتِ غیر فاعلی
DIRECT CASE	حالت فاعلی
ACCUSATIVE CASE	حالتِ مفعولی
ELISON	حذف
LETTER	حرف
PHARYNGAL	حلقی
INTRUSION	دخول
CLASS	درجہ
DENTAL	دندانی
BILINGUAL	دولسانی

RekhtaDownload.com

UVULAR	لہاتی	SYMBOL	علامت
ACCENT	لہجہ	ETHYMOLOGY	علم الاشتقاق
ROOT	مادّہ	VELUM	غشا
PROTO	ماقبل	VELAR	غشائی
COGANT	تجانس	NASALIZATION	غنائیت
COMPOUND	مرکب	VOICELESS	غیر مسموع
HYPOTHESIS	مفروضہ	UNASPIRATED	غیر ہائیدہ/غیر ہکار
ROUNDED	مدوّر	FOSSIL	فسل
HARDENED	مستعار	FINAL	فصلی
VOICED	مسموع	SEGMENTATION	قطع کاری
GEMINATED	مشدّد	SEGMENT	قطعہ
INFINITIVE	مصدر	SPEECH	کلام/تکلم
CONSONANT	مصمتہ	SPEECH SOUND	کلامی اصوات
CONSONANT CLUSTER	مصمتی خوشہ	SPEECH HABITS	کلامی عادت
		PARADIGM	گردان
VOWEL	مصوتہ	SONORITY	گونج
VOWEL	مصوتی	SONOROUS	گونجدار
RETROFLEX	معکوسی/کوز	SUFFIX	لاحقہ
SEMANTICS	معنیات	LABIAL	لبی
		LINGUISTICS	لسانیات
		LINGUISTIC	لسانی/لسانیاتی

دنیا کے چند مشہور ممالک اور مروج زبانیں

براعظم	ملک	صدر مقام	آبادی	مروج زبان
یورپ	برطانیہ	لندن	۵،۶۴۲،۰۰۰	انگریزی
	آئرلینڈ	ڈبلن	۳۰۰۰۰۰۰	آئرش
	فرانس	پیرس	۵۳۰۷۴۰۰۰	فرنچ، باسک، برٹین، کیلٹن، جرمن، پروونکل
	نیدرلینڈ	ہیگ	۱۳۷۰۸۰۰۰	ڈچ
	لگزمبرگ	لگزمبرگ	۳۵۸۰۰۰	فرنچ، جرمن، لگزمبرگی
	بلجیم	برسیل	۹۸۳۵۰۰۰	ڈچ، فرنچ، جرمن
	مغربی جرمنی	برلن	۶۲۸۳۸۰۰۰	جرمن
	مشرقی جرمنی	مشرقی جرمن	۱۶۹۰۲۰۰۰	جرمن

NGLISH

LISH

ENCH, BASQUE, BRETON,

ATALON, GERMAN, PROVENCAL,

DUTCH

RENCH, GERMAN, LUXEMBOURGEOIS.

DUTCH, FRENCH, GERMAN,

ERMAN,

ERMAN,

سوئزرلینڈ	برن	۶۶۰۳۰۰۰	جرمن، فرنچ، اطالوی، رومینش	GERMAN, FRENCH, ITALIAN, ROMANISH
آسٹریا	ویانا	۷۶۱۱۰۰۰	جرمن	GERMAN
لختینسٹن	واڈوز	۲۳۰۰۰	جرمن	GERMAN,
چیکوسلواکیہ	پراگ	۱۴۷۵۳۰۰۰	زچ۔سلواکی	CZECH, SLOVAK,
ہنگری	بڈاپسٹ	۱۰۴۵۳۰۰۰	مگیار، ہنگرین	MAGYAR, (HUNGARIAN)
رومانیہ	بخارسٹ	۲۱۲۰۵۰۰۰	رومانین	RUMANIAN
پولینڈ	وارسا	۳۰۹۶۴۰۰۰	پولش	POLISH.
پرتگال	لزبن	۸۴۹۶۰۰۰	پرتگالی	PORTUGUESE
اسپین	میڈرڈ	۳۵۲۲۸۰۰۰	اسپنی	SPANISH(CASTILIAN) BASQUE, CATALAN, GALICIAN,
اٹلی	روم	۵۶۲۴۰۰۰۰	اطالوی	ITALIAN,
مالٹا	ویلٹیا	۲۹۸۲۵۲	مالٹائی، انگریزی، اطالوی	MALTESE, ENGLISH, ITALIAN
یوگوسلاویہ	بلگریڈ	۲۱۳۷۷۰۰۰	سربوکریٹ، سلوین، مسڈونین	SERBOCROAT, SLOVENE, MACEDONIAN

یونان	ایتھنس	۸۷۹۳۰۰۰	یونانی	GREEK,
بلغاریہ	صوفیہ	۸۷۰۵۰۰۰	بلغاری، ترکی	BULGARIAN, TURKISH,
البانیہ	ترانا	۲۲۵۰۰۰۰	البانوی	ALBANIAN
آئس لینڈ	ریکجاوک	۲۱۹۰۰۰	آئس لینڈی	ICELANDIC
فن لینڈ	ہیلنسکی	۴۷۱۲۰۰۰	فنی، سویڈش	FINNISH, SWEDISH.
ناروے	اوسلو	۴۰۴۵۰۰۰	بکمال، نزوسک	BOKMAL(RIKSMAL) NYNORKS (LANDSMAL)
سویڈن	اسٹاکہوم	۸۲۱۰۰۰۰	سویڈش	SWEDISH
ڈنمارک	کوپن ہیگن	۵۰۹۷۰۰۰	ڈینش	DANISH
ایشیاء	سوویٹ روس	ماسکو ۲۵۷۰۰۰۰۰۰	روسی (۶۰٪) اکرانی، بیلورشین، لیتھونین، لاٹوین، اسٹونین، مالڈوین، وڈش، جارجین، ارمنی، ازبک، تاتاری، کازک، آذربائیجانی اور دیگر ۵۰ زبانیں	RUSSIAN,(60%) UKRANIAN, MOLDAVIAN, BYELORSSIAN, LITHUANIAN, LATVIAN, ESTONIAN, YIDDISH, GEORGIAN, ARMEIAN, UZBEK, TATAR, KAZAKH, AZERBAIJANI AND, 50 OTHER LANGUAGES

پاکستان	اسلام آباد	۶۸٫۰۰۰۰۰۰	اردو، پنجابی، انگریزی	URDU, PANJABI, ENGLISH,
بنگلہ دیش	ڈھاکہ	۸۱٫۰۰۰۰۰۰	بنگالی، اردو، ہندی	BENGALI, URDU, HINDI
نیپال	کھٹمنڈو	۱۱٫۹۰۰۰۰۰	نیپالی	NEPALI
سری لنکا	کولمبو	۱۴۰۰۰۰۰۰	سنہالی، انگریزی، ٹامل	SINHALA, ENGLISH, TAMIL,
ہندوستان	نئی دہلی	۶۰۰۰۰۰۰۰۰	ہندی، انگریزی و دیگر ۱۷ بڑی زبانیں	HINDI, URDU, ENGLISH AND OTHER.
فلپائن	خیزن سٹی	۴۳٫۰۰۰۰۰۰	اپنی، فلپینی، انگریزی	FILIPO (TAGALOG) ENGLISH, SPANISH
انڈونیشیا	جکارتا	۱۳۰۰۰۰۰۰	بہاسہ انڈونیشیائی، ملائی پولینشیائی	BAHASA, INDONESIAN, MALAYOPOLYNESIAN
برما	رنگون	۳۰۸۰۰۰۰۰	برمی و دیگر چینی و تبتی زبانیں	BURMESE, AND MANY SINO-TIBETON, TONGUES
لاؤس	وینٹین	۳۳۰۰۰۰۰	لاؤ	LAO,
ویٹنام شمالی و جنوبی	ہنوئی	۴۴۵۰۰۰۰۰	ویٹنامی، مونٹاگنارڈ، فرنچ، انگلش، نیشگناری	VIETNAMESE, MONTAGNARD DIALECTS, FRENCH, ENGLISH
تھائی لینڈ	بنکاک	۴۰۰۰۰۰۰۰	تھائی، چینی، ملائی	THAI, CHINESE, MALAY

کمبوچیا	فینم فن	۷۳۰۰۰۰	کھیمر، چینی	KHMER, CHINESE, FRENCH,
ملائشیا	کوالالمپور	۱۱۸	بہاسہ ملائی، انگریزی، چینی	BAHASA, MALAY, ENGLISH, CHINESE,
سنگاپور	سنگاپور	۲۳	ملائی، چینی، انگریزی، تامل، ہندیں	MALAY, MANDARIN, CHINESE, TAMIL, ENGLISH
چین	پیکنگ	۸۳	ہندرین، چینفلی، دوگنی، فیوکنی، ہاکا اور بہت سی چینی زبانیں	MANDARIN, CHINESE DIALECTS, CHIEFLY WU, CANTONESE, FUKEIN, HAKKA.
تائیوان	تائپی	۱۶	ہندرین، اور دیگر چینی زبانیں	MANDARIN, AND OTHER DIALECTS
شمالی کوریا	پیانگ ینگ	۱۶	کوریائی	KOREAN,
جنوبی کوریا	سول	۳۵	کوریائی	KOREAN,
ہانگ کانگ	وکٹوریا	۴۳	انگریزی، چینی	ENGLISH, CHINESE,
جاپان	ٹوکیو	۱۱۲۶۲۷۰۰۰	جاپانی	JAPANESE
ترکی	انقرہ	۴۰	ترکی	TURKISH,
سائپرس	نکوشیا	۶۶۵ ...	یونانی، ترکی	GREEK, TURKISH,

شام	دمشق	۶۷۲۸۰۰۰	عربی، کردی، ارمنائی، فرنچ	ARABIC, KURDISH, ARMENIAN, FRENCH
عراق	بغداد	۸۵۸۷۰۰۰	عربی، کردی	ARABIC, KURDISH,
لبنان	بیروت	۲۷۰۰۰۰۰	عربی، فرنچ	ARABIC, FRENCH,
اسرائیل				
اردن	عمان	۲۵۰۰۰۰۰	عربی، سرکاشی	ARABIC, CIRCASSIAN,
ایران	تہران	۲۰۳۵۵۰۰۰	فارسی، کردی، ترکی، بلوچی	PERSIAN, KURDISH, TURKI, BALUCHI
افغانستان	کابل	۱۹۰۰۰۰۰۰	پشتو، فارسی	PUSHTU, PERSIAN
سعودی عربیہ	ریاض	۸۹۴۰۰۰۰	عربی	ARABIC
جنوبی یمن	عدن	۱۲۲۷۰۰۰	عربی	ARABIC,
ایتھوپیا	عدس ابابا	۲۷۰۷۶۰۰۰	احبای، گلا	AMHARIC, GALLA
عمان	مسقط	۷۹۹۰۰۰	عربی	ARABIC
یمن	صنعا	۷۰۰۰۰۰۰	عربی	ARABIC

افریقہ	مراقش	رباط	۱۶۳۰۹۰۰۰	عربی
	لیبیا	بن غازی طرابلس	۲۳۲۴۰۰۰	عربی
	تونس	تونس	۵۰۷۷۰۰۰	عربی، فرنچ
	الجیریا	الجیرس	۱۶۰۹۸۰۰۰	عربی، فرنچ
	مصر	قاہرہ	۳۷۰۱۰۰۰۰	عربی
	نائیجریا	لاگوس	۶۲۸۶۹۰۰۰	ہاؤسا، ابو، یوروبا
	زامبیا	لوساکا	۴۹۶۵۰۰۰	بیمبا، نیانجا، انگریزی
	زائرے	کنشاسا	۲۲۹۰۱۰۰۰	سواحلی، فرنچ، لنگالہ
	کینیا	نیروبی	۱۳۳۶۰۰۰۰	سواحلی، انگریزی
	یوگنڈا	کمپالا	۱۱۵۳۵۰۰۰	سواحلی، انگریزی
	ملاوی	لیلونگوے	۵۴۳۰۰۰	انگریزی، چیوا، نیانجا
	تنزانیہ	دارالسلام	۱۵۱۶۴۰۰۰	انگریزی، سواحلی

ARABIC,
ARABIC,
ARABIC, FRENCH
ARABIC FRENCH
ARABIC
HAUSA, IBO, YORUBA,
BEMBA, NYANJA, ENGLISH
FRENCH, SWAHILI, LINGALA,
SWAHILI, ENGLISH,
SWAHILI ENGLISH.
ENGLISH, NYANJA/CHEWA,
ENGLISH, SWAHILI

	نامیبیا	ونڈہاک	۷۰۲۰۰۰	افریقائی، انگریزی	AFRICANS, ENGLISH,
	زمبابوے	سالسبری	۲۳۳۲۰۰۰	انگریزی، شونا، ناڈیلی	ENGLISH, SHONA, NDEBELE,
	جنوبی افریقہ	کیپ ٹاؤن	۲۵۰۷۱۰۰۰	افریقی، انگریزی، بانتو و دیگر ایشیائی زبانیں	AFRICANS, ENGLISH, BANTU, AND ASIAN LANGUAGES,
	ملاگیسی	تناناریو	۶۷۵۰۰۰۰	ملاگیسی، فرانسیسی	MALAGASY, FRENCH,
آسٹریلیا	آسٹریلیا	کینبرا	۱۳۷۰۰۰۰۰	انگریزی	ENGLISH,
	پاپوانیوگینا	پورٹ مورسبی	۲۵۰۰۰۰۰	انگریزی، پڈگن و دیگر قبائلی بولیاں	ENGLISH, PIDGIN, TOO TRIBAL DIALECTS
	نیوزی لینڈ	ویلنگٹن	۳۱۰۰۰۰۰	ساموری، انگریزی	ENGLISH, MAORI,
امریکہ	کناڈا	اٹاوا	۲۲۹۱۶۰۰۰	انگریزی، فرانسیسی	ENGLISH, FRENCH
	ممالک متحدہ امریکہ	واشنگٹن	۲۱۵۰۰۰۰۰۰	انگریزی	ENGLISH
	میکسیکو	میکسیکو سٹی	۵۸۳۶۳۰۰۰	اسپینی اور ہندوستانی زبانیں	SPANISH AND OTHER INDIAN LANGUAGES,
	کیوبا	ہوانا	۹۲۸۶۰۰۰	اسپینی	SPANISH
	کولمبیا	بگوٹا	۲۴۷۰۰۰۰۰	اسپینی	SPANISH

وینزولا	کاراکس	۱۲۱۰۰۰۰۰	اسپینی	SPANISH,
گیاتا	جارج ٹاؤن	۸۰۳۰۰۰	انگریزی	ENGLISH,
اکویڈر	قیتو	۷۲۰۰۰۰۰	انگریزی، قیچوا	ENGLISH, QUECHA, SPANISH,
پیرو	لمبا	۱۵۸۰۰۰۰	اسپینی قیچوا آئماڑا	SPANISH, QUECHUR, AYMARA,
برازیل	برازیلی	۱۰۷۷۰۰۰	پرتگیزی	PORTUGUESE,
بولیویا	لاپاز	۵۶۰۰۰۰۰	اسپینی قیچوا آئماڑا ودیگر امریکی ہندی DIALECTS	SPANISH, QUECHUR, AYMARA [illegible] AMERICAN
چلی	سانٹیاگو	۹۵۰۰۰۰۰	اسپینی	SPANISH
پاراگوے	آسنسین	۲۸۰۰۰۰۰۰	اسپینی، گارانی	SPANISH, GUARANI
اوراگوے	مانٹی ویڈیو	۳۰۰۰۰۰۰	اسپینی	SPANISH
ارجنٹائن	بونس ایرس	۲۵۰۰۰۰۰۰	اسپینی	SPANISH,

یہ تفصیلات ہیلن بیکٹوریل اٹلس آف ورلڈ سے لی گئی ہیں سنہ ۱۹۸۱ء کے ساتویں ایڈیشن میں دی گئی ان تفصیلات کے جامع ڈاکٹر جان سالٹ جیک ٹریسیڈر، نارمن بیرٹ، آرتھر بٹر فیلڈ اور نتھولی ہیں۔

کتابیات

۱۔ مقدمہ آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	اعجاز پبلشنگ ہاؤز دریا گنج	بار اول	۱۹۸۱ء
۲۔ سخندان فارس	مولانا محمد حسین آزاد	اتر پردیش اردو اکیڈیمی لکھنو	پہلا فوٹو آفسٹ ایڈیشن	۱۹۷۹ء
۳۔ فن تحریر کی تاریخ	محمد احسن صدیقی	انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ	بار اول	۱۹۶۲ء
۴۔ توضیحی لسانیات (ترجمہ اردو)	ایم اے گلیسن (جونیئر)	ترقی اردو بورڈ دہلی (حکومت ہند)	پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء	ترجمہ عتیق احمد صدیقی اردو
۵۔ نظام اردو	سید انور حسین آزاد	اتر پردیش اردو اکیڈیمی لکھنؤ	پہلا فوٹو آفسٹ ایڈیشن	۱۹۷۹ء مع حواشی
۶۔ پنجاب میں اردو	پروفیسر حافظ محمود شیرانی	اتر پردیش اردو اکیڈیمی لکھنو		۱۹۸۲ء میسعود حسن رضوی ادیب
۷۔ ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	نسیم بک ڈپو لکھنو		۱۹۸۱ء
۸۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	سید احتشام حسین صاحب	دانش محل لکھنو	بار سوم	۱۹۶۳ء
۹۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	سرسید بکڈپو حیدر آباد	بار ششم	۱۹۸۲ء
۱۰۔ زبان اور علم زبان	پروفیسر عبدالقادر سروری	مجلس تحقیقات اردو حیدر آباد	بار سوم	۱۹۷۰ء
۱۱۔ اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر شوکت سبزواری			
۱۲۔ لسانی مسائل	ڈاکٹر شوکت سبزواری	پرویز بکڈپو دہلی۔		
۱۳۔ اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڈھ مکتبہ الفاظ علیگڈھ		۱۹۸۲ء
۱۴۔ لسانی مطالعے	پروفیسر گیان چند جین	نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا دہلی	بار اول	۱۹۷۳ء
۱۵۔ ہند آریائی اور ہندی (اردو ترجمہ)	سنیتی کمار چٹرجی	نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا دہلی		۱۹۷۷ء ترجمہ عتیق احمد صدیقی

(اصل انگریزی)

۱۶۔ اردو زبان اور ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ			۱۹۸۳ء
۱۷۔ اردو رسم خط اور املا	پروفیسر ہارون خاں شیروانی	مہتمم مطبوعات مسعود منزل حیدرآباد			۱۹۵۷ء
۱۸۔ لسانیاتی جائزے	ڈاکٹر عصمت جاوید	منور جہاں ایم۔اے		بار اول	۱۹۵۵ء
۱۹۔ اردو میں غیر ملکی یورپی الفاظ	محمد بن عمر	کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد		بار اول	۱۹۵۵ء
۲۰۔ الفاظ کا مزاج	غلام یزدانی	مکتبہ جامعہ دہلی		بار اول	۱۹۸۴ء
۲۱۔ اردو زبان کا قومی کردار	ظفر ادیب	ظفر ادیب اردو بازار دہلی		بار اول	۱۹۷۶ء
۲۲۔ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر	پرکاش مونس	پرکاش مونس		بار اول	۱۹۷۸ء
۲۳۔ وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	ترقی اردو بورڈ دہلی			
۲۴۔ اقبال نیز کا ارتقاء	ڈاکٹر شہناز انجم	مکتبہ جامعہ دہلی			۱۹۸۵ء
۲۵۔ اسلام کا ہندستانی تہذیب پر اثر	تارا چند				
۲۶۔ دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	ترقی اردو بیورو نئی دہلی		پہلا فوٹو آفسٹ ایڈیشن	۱۹۸۵ء
۲۷۔ نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی				
۲۸۔ کاشف الحقائق	سید امداد امام اثر	ترقی اردو بیورو نئی دہلی		پہلا فوٹو آفسٹ ایڈیشن	۱۹۸۲ء
۲۹۔ تاریخ فرشتہ	ملا محمد قاسم فرشتہ	منشی نولکشور		بار سوم	۱۲۸۱ھ فارسی
۳۰۔ تاریخ ادب اردو (مصور)	رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری	مجمع منشی نولکشور			۱۹۲۹ء
۳۱۔ مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	اردو کتاب گھر دہلی		گیارھواں ایڈیشن	۱۹۶۴ء
۳۲۔ اردو میں قصیدہ نگاری	ڈاکٹر ابو محمد سحر	نسیم بکڈپو لکھنؤ		چوتھا ایڈیشن	۱۹۷۹ء
۳۳۔ اردو سے ہندی تک	ڈاکٹر عبدالودود	〃		پہلا ایڈیشن	۱۹۷۶ء
۳۴۔ لسانی و تحقیقی مطالعے	ڈاکٹر عبدالغفار شکیل	سلسلہ مطبوعات شعبہ لسانیات		〃	۱۹۷۵ء
۳۵۔ اردو زبان اور اس کا نام	کنول ڈبائیوی	ڈاکٹر کنول ڈبائیوی		〃	۱۹۷۸ء
۳۶۔ اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ	فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی		〃	۱۹۸۵ء
۳۷۔ زبان اور مسائل زبان	عبدالغفار شکیل	سلسلہ مطبوعات شعبہ لسانیات		〃	۱۹۷۴ء
۳۸۔ ایکان (جریدہ)	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	جہاد اسٹریٹ اردو اکیڈیمی		سہ ماہی	
۳۹۔ اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	مجلس تحقیقات اردو		پہلا ایڈیشن	
۴۰۔ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی	محمد مجتبیٰ خاں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی		〃	۱۹۷۷ء

مولف کے بارے میں

نام	سید حمید الدین قادری شرفی
والد کا نام	سید سیف الدین قادری شرفی
پیدائش	حیدرآباد
تعلیم	ایم۔اے (جامعہ عثمانیہ) ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کرناٹک موضوع تحقیق "اردو زبان داد بچن دیہ شاعری و فنکار سیاست تا ۱۹۵۰ء"
پیشہ	درس و تدریس
مشاغل	تصنیف و تالیف
مستقل سکونت	۲۳۳-۴-۱۳، شرفی چمن، حیدرآباد

دیگر کتابیں

دکنی ادب کے معمار	(ادبی تاریخ) زیر طبع
گزشتہ پون صدی کی ادبی تحریکیں	(ادب) زیر طبع
سیف و ستائیں (مجموعۂ کلام)	(شاعری) زیر طبع
لسانی تجربے	(لسانیات) زیر ترتیب
مقدمہ تاریخ زبان اردو (ایک تنقیدی مطالعہ)	(تنقید) زیر ترتیب
صحافت اور مسائل زندگی	(ادب) زیر ترتیب
کرناٹک کے ایک صوفی خاندان کی ادبی خدمات	(تحقیق) زیر ترتیب

جذباتِ خلوص

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ جناب سید حمید الدین صاحب قادری شرفی کی تالیف "ہند آریائی اور اردو" کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ لسانیات کی سنگلاخی کا ہر ایک معترف ہے۔ جناب شرفی صاحب نے پُر خار راہوں کا انتخاب کرکے گویا ابتداء ہی چونکا دینے والی کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ممتاز دانش وروں کی گراں قدر رائے شامل کتاب ہے۔ اتنا ہی عرض کرنے کی جسارت کررہا ہوں کہ جناب شرفی صاحب نے اپنی تالیفانہ کوشش کے ذریعے اساتذہ کو یہ راہ دکھائی ہے کہ لسانیات میں خالص زبان و بیان کے بنیادی سانچوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سماجی و سیاسی گروہ واری تقسیم کے ساتھ ساتھ مذہبی عوامل کے پس منظر میں بھی بہتر طور پر کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

میں ہند آریائی اور اردو کی اشاعت پر جناب شرفی صاحب کو مبارک باد دیتا ہے۔

عارف محی الدین

معتمد عمومی حیدرآباد رائٹرس فورم (حرف)